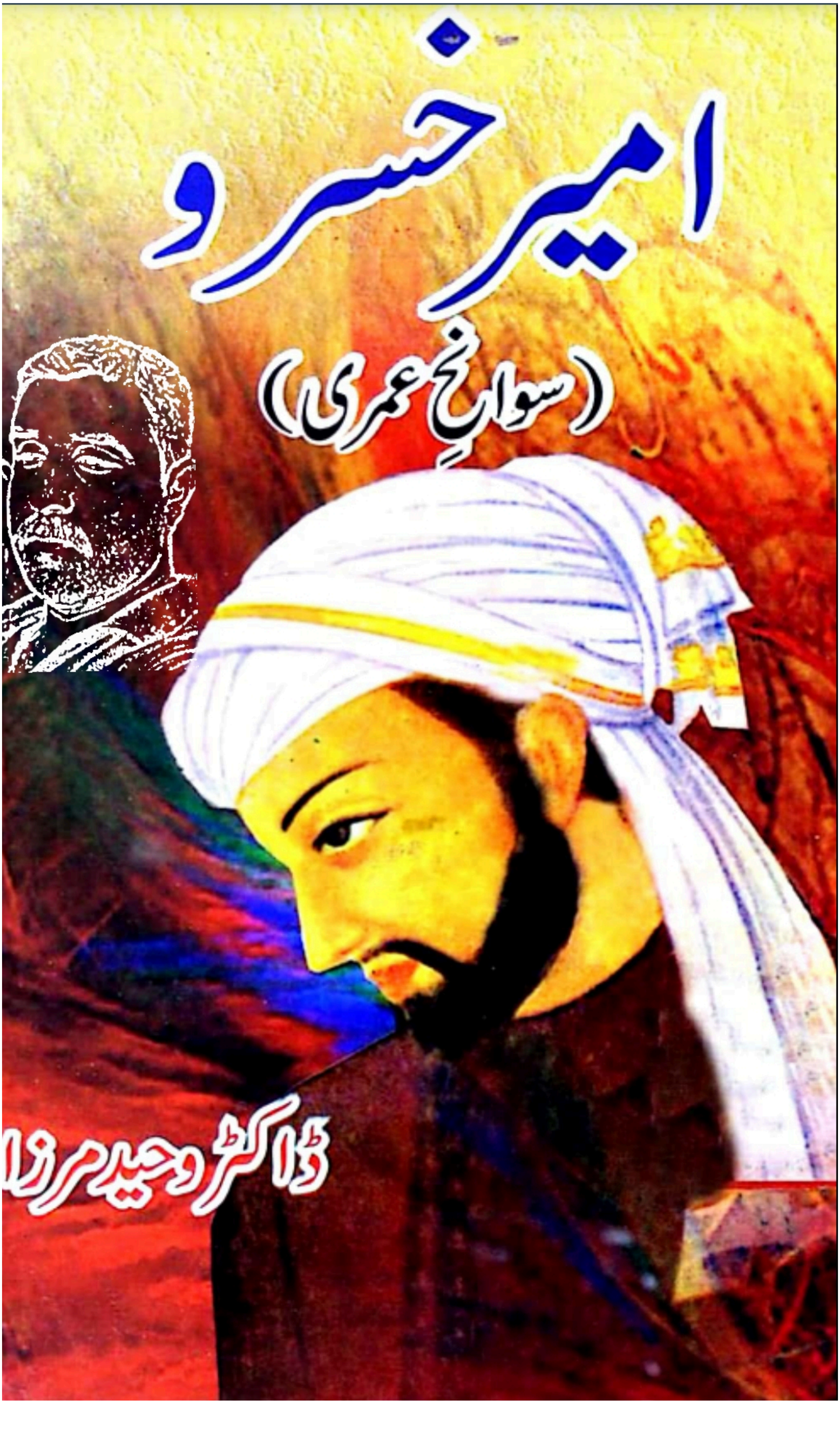

امیر خسرو
(سوانحِ عمری)
ڈاکٹر وحید مرزا



PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

امیر خسرو

(سوانحِ عمری)

ڈاکٹر وحید مرزا

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

AMEER KHUSRO

by

Dr. WAHEED MIRZA

Year of Edition 2006
ISBN 81-8223-191-4
Price Rs.120/-

نام کتاب	امیر خسرو (سوانحِ عمری)
مصنف	ڈاکٹر وحید مرزا
سنِ اشاعت	۲۰۰۶ء
قیمت	۱۲۰ روپے
مطبع	عفیف آفسیٹ پرنٹرس، دہلی

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(India)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-011-23211540
E-mail: ephdelhi@yahoo.com

فہرست

حصہ دوم: تصنیفات

پیش لفظ

خسرو کے متعلق تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وہ فارسی زبان پر دستگاہ کامل رکھنے کے علاوہ عربی، ترکی، سنسکرت، ہندی، اور بنگالی زبانوں پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ ہندی اور اردو شعر و ادب کی تاریخ میں بلا اختلاف ان کو ہندوستانی زبان کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے، حضرت امیر خسرو نے بالخصوص اپنی مثنویوں میں ہندوستان کے موسموں۔ ہندوستان کے پھلوں، پھولوں، پرندوں، دریاؤں اور قدرتی مناظر کا ذکر جس والہانہ عقیدت اور لگاؤ سے کیا ہے اس سے سرزمینِ ہند سے ان کی بے پناہ محبت اور وابستگی مترشح ہوتی ہے۔ قومی یک جہتی کے جو راگ اس فقید المثال شاعر نے سات سو سال قبل الاپے تھے اس کی مثال ہندوستان کی کسی زبان کے ادب و شاعری میں ملنا محال ہے۔ ان کے رسیلے ہندی گیت، دوہے۔ کہ مکرنیاں اور پہیلیاں نہ صرف ہندوستان و پاکستان کی درگاہوں اور خانقاہوں کی قوالی کی محفلوں کو گرماتی ہیں، بلکہ لاکھوں کروڑوں ہندوستانی اور پاکستانی مردوں اور عورتوں کے حافظوں میں محفوظ ہیں اور ہند و پاک میں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

متعدد زبانوں پر عبور رکھنے والا یہ باکمال شخص نہ صرف اقلیم شاعری پر حکمرانی کرتا تھا بلکہ درباروں کی مصاحبتوں سے گزر کر میدانِ جنگ میں بھی تلوار کے جوہر دکھاتا تھا۔ موسیقی کی محفلوں

میں اپنی گائیکی کے فن کا لوہا منواتا تھا۔ قادرالکلام ہونے کے علاوہ فارسی ادب میں بحیثیت مورخ اور نثر نگار کے بھی خسرو اعلیٰ وارفع مقام کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ ماہران موسیقی نے امیر خسرو کو بعض آلات موسیقی اور راگ راگنیوں کا موجد قرار دیا ہے۔ قول وقلبانہ وغیرہ راگوں کی ایجاد کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

افسوس ہے کہ ان کی باکمال اور ہمہ گیر شخصیت کے کمالِ فن کا اعتراف ہندوستان و پاکستان میں جس طرح ہونا چاہیے تھا، اب تک نہیں ہوا ہے۔ 1975 میں حضرت امیر خسرو کی سات سوسالہ برسی دنیا کے مختلف ملکوں میں منائی گئی اور اس سلسلہ میں وسط ایشیا، ایران، افغانستان، پاکستان اور ہندوستان سے ان کی قدیم مطبوعات کے جدید ایڈیشن بھی شائع کیے گئے۔ حضرت امیر خسرو ہندوستانی علم وادب کی ایسی مایہ ناز شخصیت ہیں کہ ان ایسی ہمہ گیریت کسی اور شاعر یا ادیب میں پائی نہیں جاتی۔ ہندوستان ہی پر کیا منحصر ہے ساری دنیا کے ادب میں کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ ایک شخص میں بہ یک وقت اتنے کمالات اکٹھے ہو گئے ہوں۔ خسرو نے سات بادشاہوں کے دور دیکھے اور اس زمانے کے سیاسی، معاشرتی اور تمدنی اتار چڑھاؤ کا بڑی غائرانہ نظروں سے مشاہدہ کیا۔ شاہی درباروں سے وابستگی کے باوجود حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کی بارگاہ میں حاضری دینے میں کبھی ان سے کوتاہی کا ارتکاب نہیں ہوا۔ خسرو دہلوی نہ صرف بادشاہان وقت کے منظورِ نظر تھے بلکہ اپنے مرشد کے ایسے چہیتے مریدوں میں سے تھے کہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ کے دوسرے حاضر باش مریدوں کو ان کی مقبولیت پر رشک آتا تھا۔ فارسی شاعری میں ان کا لوہا ایران کے ہم عصر شعرأ نے مانا ہے اور طوطیٔ ہند کے خطاب سے ان کو موسوم کیا ہے۔ نواب بنگال کی فرمائش پر حافظ شیرازی نے جو غزل روانہ کی تھی اور جس کا مشہور مطلع:

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود
ویں بحث با ثلاثہ غسالہ می رود

ہے،اس غزل کے ایک شعر میں حافظ نے حضرت امیر خسرو کی طرف اشارہ کیا ہے:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

ہندوستان کے فارسی گوشعرا کو ایرانی خاطر میں نہیں لاتے، حتیٰ کہ مرزا غالب کو بھی، جن کو اپنی فارسی نغز گوئی پر بڑا ناز تھا، اور اس کے مقابلہ میں اپنے اردو کلام کو بے رنگ سمجھتے تھے، ایرانی شاعروں اور ادیبوں نے وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ خسرو دہلوی کی منفرد ذات ہے جن کے شاعرانہ کمالات کا لوہا ایران کے ہر دور کے شاعروں نے مانا ہے اور ان کی حیات شاعری اور ان کے فن پر بعض گراں قدر تصنیفات و تالیفات بھی شائع ہوئیں۔ مگر ان پر ابھی بہت کچھ لکھے جانے اور ان کے شاعرانہ اور ادبی کمالات کے مختلف گوشے اجاگر کرنے کے لیے تحقیق و تفتیش کی اشد ضرورت ہے۔

حضرت امیر خسروؒ کی حیات و شاعری اور ان کے فن پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے ڈاکٹر وحید مرزا کی تصنیف ''امیر خسروؒ'' نشانِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہندوستانی اکادمی الہ آباد کی طرف سے ڈاکٹر وحید مرزا کی یہ مایہ ناز تصنیف 1949 میں شائع ہوئی تھی۔ مگر اب یہ کتاب تقریباً نایاب سی ہوگئی ہے۔ تصنیف کی اہمیت کے پیش نظر اس کا نیا ایڈیشن اہل علم کے سامنے پیش ہے۔

حضرت امیر خسروؒ کے جائے پیدائش، سکونت اور ان کے والد، اجداد اور خاندان کے متعلق مزید تحقیقات ہوئی ہے اور بعض محققین نے ان امور پر ڈاکٹر وحید مرزا کی تحقیق پر تنقیدیں بھی کی

ہیں۔لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جس وقت ڈاکٹر وحید مرزا نے زیرِ نظر کتاب تصنیف کی تھی، اس وقت جو مواد میسر تھا اس کو اکٹھا کر کے ایک جگہ جمع کر دینے کی جو خدمت انہوں نے انجام دی تھی، بعد کی تحقیقات سے نقشِ اوّل ہونے کی حیثیت سے اس کی اہمیت اور افادیت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

محمد یونس سلیم

دیباچہ

ایک سال سے کچھ زائد عرصہ ہوا کہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی طرف سے یہ فرمائش کی گئی تھی کہ میں خسرو پر اردو میں کتاب لکھوں، چونکہ میں اس سے پہلے امیر خسرو پر ایک تصنیف انگریزی میں کر چکا تھا۔ جسے سنہ 1969ء میں مَیں نے لندن یونیورسٹی کی پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری کے لیے پیش کیا تھا اور جو بعد میں پنجاب یونیورسٹی نے شائع کی، اس لیے اس مضمون پر دوبارہ کچھ لکھنا ایک حد تک تحصیل حاصل معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ایک طرف تو اربابِ ہندوستانی اکیڈمی کا پاسِ خاطر ملحوظ تھا اور دوسری طرف یہ خیال باعث ترغیب ہوا کہ میری انگریزی تنصیف تک بعض اہلِ ذوق کی رسائی نہیں ہو سکتی، اس کے علاوہ اگرچہ اردو میں اس سے پہلے احمد سعید صاحب مارہروی امیر خسرو پر ایک کتاب ''حیاتِ خسروؒ'' کے نام سے لکھ چکے تھے اور مولانا شبلی نعمانی نے بھی ایک چھوٹا سا مقالہ ''بیانِ خسروؒ'' کے نام سے شائع کیا تھا اور یہ دونوں تصنیفیں اپنی اپنی جگہ یقیناً بہت قابلِ قدر بھی ہیں، لیکن ان میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے اور بعض واقعات کے بیان کرنے میں نادانستہ طور پر سہو ہو گیا ہے، لہٰذا واقعی اس کی ضرورت تھی کہ کوئی ایسی کتاب اردو میں لکھی جائے جس میں تمام حالات اور واقعات کو پوری تحقیق اور احتیاط کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اسی لیے ہندوستانی اکیڈمی کی دعوت کو لبیک کہتے ہوئے میں نے یہ کتاب لکھنا شروع کر دی جو آج پایۂ تکمیل کو پہنچ کر اہلِ علم کے پیش نظر ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اس کتاب کی تالیف میں مَیں نے اپنی انگریزی تصنیف سے بہت کچھ مدد لی ہے۔ لیکن اسے انگریزی تصنیف کا ایک روکھا پھیکا ترجمہ نہ سمجھنا چاہیے۔ واقعات اور حقائق زیادہ تر

وہی ہیں لیکن ترتیب اور اسلوبِ بیان جداگانہ ہے۔ تاریخی واقعات کے بیان کرنے میں زیادہ اختصار سے کام لیا گیا ہے اور خسرو کے منثور اور منظوم کلام کے نمونے زیادہ دیئے گئے ہیں۔ انگریزی تصنیف کے متن اور حاشیے میں جو باتیں براہِ راست خسرو سے متعلق نہ تھیں، انہیں زیادہ تر اس کتاب سے حذف کر دیا گیا ہے، لیکن یہ التزام بھی رکھا ہے کہ کوئی ضروری بات رہ نہ جائے۔

غرض یہ کہ اختصار کے ساتھ جامعیت کو نباہنے کی کوشش کی ہے، اس کوشش میں مجھے کہاں تک کامیابی یا ناکامی ہوئی، اس کا فیصلہ اصحابِ ذوق ونظر ہی کر سکتے ہیں۔ اپنی گوناگوں خامیوں کا مجھے پورا احساس ہے لیکن اس کے ساتھ ہی قارئین سے درگزر اور چشم پوشی کی امید بھی ہے۔ اسی طرح کتاب کی زبان کو جہاں تک ہو سکا سادہ اور عام فہم رکھا گیا ہے تا کہ ہر طبقے کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں اور اگر کہیں اس عام اصول سے انحراف پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ بعض مضامین میں سادگی کے ساتھ ادبی رنگ قائم رکھنا مشکل ہی نہیں بلکہ محال ہو جاتا ہے، جسے وہ لوگ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں جنہیں اردو میں کسی علمی موضوع پر کچھ لکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔

انسانی تہذیب اور تمدن کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ہمیں سیکڑوں نام ایسے افراد کے ملیں گے جنھوں نے انسانی زندگی کے کسی نہ کسی شعبے میں شہرت حاصل کی اور جنھوں نے اپنی شخصیت اور ذاتی قابلیت کی مدد سے اپنا نام ہمیشہ کے لیے جریدۂ عالم پر ثبت کر دیا۔ ان میں سے کوئی تو حکومت اور سیاست کے میدان میں گوے سبقت لے گیا، کسی نے بنی نوع انسان کی ہدایت کے لیے مشعلِ نبوت روشن کر کے اپنے نام کو چاردانگ عالم میں چمکا دیا، اور کسی نے علم اور فن کے چشمے سے سیراب ہو کر حیاتِ جاوید حاصل کی۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان مشہور اور معروف ہستیوں میں ایسے افراد کم نظر آئیں گے جنھیں قبولِ عام حاصل ہوا اور جن کا نام محض تاریخ کے اوراق پر نہیں لکھا گیا بلکہ انسانوں کے دلوں میں نقش ہو کر نسلاً بعد نسل زندہ رہا، جن کی شخصیت نہ صرف زمانے کی قید سے آزاد تھی بلکہ کسی ایک دائرے میں محدود بھی نہ تھی، جن کے جاننے والے اور جن کے مداح ہر فرقے اور ہر طبقے کے لوگوں میں پائے جاتے تھے اور اب تک پائے جاتے ہیں اور جن کا ذکر ہر ادنیٰ اور اعلیٰ کی زبان پر جاری ہے۔ اس عام مقبولیت کے اسباب کا تجزیہ کوئی آسان کام نہیں، اس لیے کہ یہ متفرق حالات وواقعات کا نتیجہ ہوتی ہے جن کا عرصہ گزر جانے کے

بعد سراغ ملنا دشوار ہو جاتا ہے، لیکن اگر ہم اس قسم کے آدمیوں کی زندگی پر ایک گہری نظر ڈالیں تو ایک چیز ہمیں ان میں ضرور مشترک نظر آئے گی، اور وہ یہ ہے کہ ان کی سرگرمی، خواہ وہ زیادہ تر زندگی کے ایک شعبے ہی سے متعلق کیوں نہ رہی ہو، محض اسی شعبے تک محدود نہ تھی بلکہ زندگی کے متعدد شعبوں پر حاوی تھی۔ ان کی فطرتی قابلیت میں ہمہ گیری اور ان کی طبیعت میں ایک ایسی نیرنگی تھی جو صرف تلون مزاج پر مبنی نہ تھی بلکہ جس کا سرچشمہ انسان کی وہ کوشش ناتمام تھی جو اسے زندگی کے اسرار کی تہہ تک پہنچنے پر ابھارتی ہے اور اس میں اس جامعیت کی خواہش پیدا کرتی ہے جو دراصل انسانوں سے ایک بالاتر ہستی یعنی ذات باری تعالیٰ ہی میں نمودار ہو سکتی ہے، لیکن جس کی ایک ہلکی سی جھلک انسان میں بھی، جسے خدا نے دنیا میں اپنا خلیفہ بنایا اور جس کو اس نے خود اپنی ہی صورت میں خلق کیا، نظر آ سکتی ہے۔

اسی کوشش کا نتیجہ تھا کہ یہ لوگ ایک غیر مطمئن دل اور ایک بے چین طبیعت رکھتے تھے وہ فرسودہ روشوں اور پامال راہوں پر قدیم اور موروثی روایتوں کے مطابق گامزن رہنے سے قانع نہ ہو سکتے تھے، اور جدت پسند دماغ کسی نئی طرح اور کسی انوکھی وضع کی تلاش میں رہتا تھا اور آخر اسی شوقِ جامعیت اور جذبۂ ایجاد کے بل پر وہ اپنے ہم عصر انسانوں ہی پر نہیں بلکہ ہر زمانے کے آدمیوں پر فوقیت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر بالفرض ان میں سے کسی کو قسمت نے مسندِ حکومت پر بیٹھایا اور تاجِ سلطنت سے سرفراز کیا تو اس نے حکومت کی کایا پلٹ دی۔ اس نے نہ صرف رعایا کی فلاح اور آسائش کے لیے نئے قاعدے اور نرالے ڈھنگ اختیار کیے بلکہ اپنے آپ کو اور انسانوں کا سا ایک انسان سمجھ کر ان کمالات اور ستودہ صفات کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کی جو اس کے منصب بادشاہت سے براہِ راست متعلق نہ تھیں۔ اس نے علم اور ہنر کو خود حاصل کیا اور اربابِ علم کی قدردانی اور ہمت افزائی کی۔ وہ اپنی رعایا کا سچا دوست بن کر ان کے دکھ درد میں شریک ہوا، یا اگر اسے قسام ازل سے شمشیر سپہ گری اور سپر دلاوری ملی تو اس نے اپنی ہمت کا منتہائے نظر محض دشمنوں کی صفوں کو اپنے بے باک حملوں سے زیروزبر کرنا اور سرکشوں کی سرکوبی کے لیے اپنے گرزگراں کو بلند کرنا خیال نہ کیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ علم اور بردباری، سخاوت اور ایثار کی اچھی خصلتوں کو بھی اپنا شعار بنایا، اور فن سپہ گری کے وہ طریقے اختیار کیے جو اس سے پہلے موجود نہ تھے، اور اگر بالفرض خدا کی طرف سے اسے مشتری کا طیلسان یا کلک عطارد

عطاء ہوئی تو اس کے نرم اور نازک ہاتھ صرف خامۂ مشک فشاں سے صفحہ کاغذ پر گل کاری نہ کر سکتے تھے بلکہ تیغ اصفہانی کے جوہر سے چہرۂ زمین کو بھی گل گوں بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ انگریزی کی ایک مثل کے مطابق یہ صحیح ہے کہ تنوع کمال کا منافی ہے، لیکن یہ مثل عام قابلیت اور اوسط درجے کی استعداد رکھنے والے انسانوں پر ہی صادق آتی ہے۔ صدیوں میں افلاک کی گردشِ دوام سے کوئی نہ کوئی ایسی جامع شخصیت پیدا ہو ہی جاتی ہے جو اس عام قاعدے سے بالاتر ہوتی ہے، اور یہی امتیاز اس صاحب کمال کے لیے عالم گیر شہرت اور ابدی ناموری کا باعث بن جاتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت لوگوں میں سے ایک امیر خسرو بھی تھے۔

خسرو کا شمار عام طور پر شعراء کی صف میں ہوتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کی زیادہ تر توجہ شاعری ہی کی طرف رہی، لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ صرف شاعر نہ تھے۔ ان کا امیر کا خطاب ہی صاف طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہیں شاہی ملازمت بھی حاصل تھی اور جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے، اسی وجہ سے وہ ایک سے زیادہ فوجی مہموں میں ایک سپاہی کی حیثیت سے شریک ہوئے، علاوہ ازیں انہوں نے اپنی پُر انقلاب زندگی میں سات بادشاہوں کو یکے بعد دیگرے دہلی کے تخت پر بیٹھتے دیکھا تھا اور ان میں سے چار بادشاہوں کے دربار میں ان کی رسائی نہ صرف بحیثیت ایک مدح گو شاعر کے بلکہ ایک بذلہ سنج ندیم اور خوش بیان مصاحب کے بھی رہی۔ اس کے علاوہ اپنی آخری عمر میں حضرت نظام الدین اولیاؒ سے باقاعدہ بیعت کے بعد ان میں تصوّف اور درویشی کا وہ جذبہ، جو موجود تو ہمیشہ ہی سے تھا لیکن بعض اور رجحانوں سے دبا ہوا تھا، نمایاں ہو گیا اور اپنے پیر و مرشد سے انہیں وہ خصوصیت حاصل ہو گئی جو اور کسی ارادت مند کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ یہ تعلق جہاں بہت حد تک امیر خسرو کے کلام کے مقبول خاطر ہونے کا باعث بنا وہاں اس نے ان کی شخصیت میں تقدس کا ایک خاص رنگ بھی پیدا کر دیا اور اس طرح شاعری اور امیری کے ساتھ ولایت بھی ان کا طرۂ امتیاز بن گئی۔ موسیقی اور شاعری کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے، تاہم یہ ضروری نہیں کہ ہر شاعر موسیقی داں بھی ہو، مگر امیر خسرو نے موسیقی میں ایسی مہارت پیدا کی کہ کئی نئی طرزیں ایجاد کیں اور عام روایت کے مطابق، معروف ساز ''ستار'' بھی انہی کی ذہانت طبع سے وجود میں آیا۔ تحصیلِ علم میں بھی وہ اپنے کسی ہم عصر سے پیچھے نہیں رہے، بلکہ زباندانی میں تو شائد ہی کوئی اس زمانے میں ان کا مقابلہ کر سکتا ہو، اس لیے کہ وہ فارسی کے علاوہ ترکی، عربی، ہندی،

سنسکرت اور ہندوستان کی اور کئی زبانوں سے واقف تھے اور بعض ایسے علوم بھی، جو عوام کے لیے ایک راز سربستہ رہے ہیں، مثلاً نجوم، رمل اور سحر وغیرہ، ان کی ہمہ گیر توجہ سے نہ بچ سکے۔ لیکن میرے خیال میں جو چیز امیر خسرو کے نام کو سب سے زیادہ عام بنانے کا باعث ہوئی وہ ان کی ظرافت طبع، ان کی حاضر جوابی اور ان کی قوت مطابقت تھی۔ وہ جدھر کا رخ کرتے تھے لوگ ان کی آؤ بھگت کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ سوسائٹی کے جس طبقے میں بھی چلے جاتے تھے، اپنے آپ کو اسی طبقے کے افراد کی ذہنیت کے مطابق بنا سکتے تھے، اگر بادشاہ کے دربار میں شعر وشاعری کی بحثوں میں حصہ لیتے تھے تو اپنے پیر کی مجلس میں فقر اور تصوف، فلسفے اور حکمت کے دقائق کی موشگافی کرتے۔ اگر مولویوں اور پنڈتوں سے مذہب اور دھرم کے مسائل پر مظاہرہ کر سکتے تھے تو سیدھے سادھے شہریوں اور اجڈ دیہاتیوں کو خوش کرنے کے لیے پہیلیاں، مکرنیاں، چھند اور دوہے بھی برجستہ کہہ سکتے تھے۔ خالق باری کی تصنیف کا موقع یا پنگھٹ پر چار سہیلیوں کی فرمائش پر ایک بیت میں کھیر، چرخے، کتے اور ڈھول کو موزونیت سے بیان کرنے کا قصہ جس طرح مولانا آزاد کی کتاب ''آبِ حیات'' میں نقل ہوا ہے • ممکن ہے کہ کسی نا قابلِ اعتماد روایت پر مبنی ہو، لیکن امیر خسرو کے متعلق اس قسم کی روایتوں کا عوام میں رائج رہنا بجائے خود ان کی شخصیت کے اس پہلو کا آئینہ دار ہے اور ہمارے نظریے کا شاہد۔ امیر خسرو کی یہ صفت اور صلاحیت ہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے وہ لوگ بھی، جنہیں کبھی ان کے فارسی کلام کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا اگر ملے بھی تو وہ اس کلام کو سمجھنے یا اس کی خوبیوں کی قدر کرنے سے قاصر ہیں، ان کے نام سے واقف ہیں اور ان کی عظمت کے معترف، بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ سوائے شیخ سعدی کے اور کوئی فارسی شاعر ایسا نہیں گزرا جس نے خسرو کی طرح عوام کے دلوں میں گھر کر لیا ہو اور جس کا نام بچے بچے کی زبان پر ہو۔ اسی لیے امیر خسرو کے سوانح حیات کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں ان کے کردار کے ان پہلوؤں کو مدنظر رکھنا چاہیے، کیونکہ اس کے بغیر ہم ان کی اصل عظمت اور غیر معمولی ذہانت کو پوری طرح سمجھنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ آئندہ صفحات کے لکھنے میں مَیں نے ان تمام امور کا حتی الامکان خیال رکھا ہے اور خسرو کی ہر خصوصیت پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی جہاں تک ہو سکا ہے ان کے حالات زندگی کے بیان کرنے میں خود ان کی اپنی تصانیف سے مدد لی ہے

• آبِ حیات (ص 65-71)

اور اگر کہیں بعض حالات اور واقعات کی فضول یا توضیح کے لیے اور کتابوں کی مدد کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ التزام رکھا ہے کہ یا تو خسرو کے ہم عصر مصنفوں کی تحریروں سے مدد لی جائے یا بعد کے زمانے کے ایسے لکھنے والوں کی تصانیف سے، جن کے بیانات پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ خسرو جہاں اور لحاظ سے خوش قسمت تھے وہاں اس معاملے میں بھی خوش نصیب رہے کہ ان کی زیادہ تر تصانیف خود ان کے اپنے ہاتھوں ان کی زندگی میں مدون ہو گئی تھیں اور ان میں سے بعض تصانیف کے دیباچوں میں انہوں نے اپنے متعلق بہت سی بیش قیمت معلومات آئندہ نسلوں کے لیے مہیا کر دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خسرو کی زندگی کے متعلق آج جتنی واقفیت ہمیں حاصل ہے اس کا عشر عشیر بھی ان کے کسی اور ہم عصر کے متعلق معلوم نہیں ہو سکتا، بلکہ ان میں سے بعض کا تو ہم صرف نام ہی جانتے ہیں، حالانکہ بظاہر اپنے زمانے میں وہ لوگ بھی خاصی شہرت اور اہمیت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ خواجہ حسن سنجری کے حالات زندگی بھی، سوائے چند جزئیات کے، اب تک ہمیں معلوم نہ ہو سکے، اگرچہ ان کا ایک دیوان دستبرد زمانہ سے محفوظ رہا اور ہمارے پاس موجود ہے۔

محمد وحید مرزا

26 مئی 1945ء

مقدمہ

ہندوستان میں فارسی شاعری کی ابتداء ہندوستانی اور ایرانی شاعری کا موازنہ:

ہندوستان کی فارسی شاعری کے متعلق مختلف نقادوں کا مختلف خیال رہا ہے۔ یورپ کے زیادہ تر مستشرقین، جن میں پروفیسر براؤن خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں جو شاعری ہندی نژاد شعراء کی دماغ سوزی اور کاوش طبع سے ظہور میں آئی، اس میں اور ایران کی فارسی شاعری میں بہت فرق ہے۔ ان کے خیال میں ہندوستانی شاعری میں نہ تو زبان کی لطافت ہے جو ایرانی شاعری میں پائی جاتی ہے اور نہ اسلوب بیان کی وہ سلاست اور روانی، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہندوستانی شاعری، ایرانی شاعری کا ایک پھیکا سا خاکہ اور ایک بے رنگ نقل ہے۔[1] بدقسمتی سے بعض مشرقی نقاد بھی، خصوصاً وہ جو ایرانی نسل سے ہیں، یورپ کے مستشرقین کی اس رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے بعض اور لوگ، جنھوں نے ہندوستان کی فارسی شاعری کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور جو اس کی ابتدا اور ارتقا کی تاریخ سے واقف ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ایک خاص زمانے تک ایران اور ہندوستان کی فارسی شاعری میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا اور بعد میں اگر فرق پیدا ہوا، جو حالات اور واقعات کی بناء پر ناگزیر تھا، تو یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ان دونوں میں سے کون سی شاعری قابل ترجیح ہے، یا کم از کم یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستانی شاعری ادنیٰ ہے اور ایرانی شاعری اس سے بہت برتر۔ ان دونوں میں سے کون سی رائے صحیح ہے اور کون سی غلط، اس کا فیصلہ کرنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ ہندوستان میں ایرانی شاعری کی بنیاد کس زمانے میں اور کن حالات میں قائم ہوئی۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ فارسی شاعری خود ایران میں بھی دراصل کچھ ایسے قدیم زمانے میں ظہور میں نہیں آئی، اس لیے کہ بنو سامان کے عہد سے پہلے

بظاہر ایران میں موجودہ فارسی شاعری کا وجود نہ تھا اگرچہ بعض تذکرہ نویسوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی داغ بیل ساسانی دور میں پڑ چکی تھی، لیکن اس قسم کی روایتیں یقیناً ناقابلِ اعتماد ہیں۔ دوسری بات، جو ہمیں فراموش نہ کرنا چاہیے، یہ ہے کہ آج جس خطہ زمین کو ہم ایران کے نام سے موسوم کرتے ہیں اس کے حدود بہت بعد کے زمانے میں یعنی صفوی، بلکہ قاچار خاندان کے زمانے میں قائم ہوئے۔ کیونکہ اس زمانے سے لے کر، جب عربوں نے ایران فتح کیا، عرب سلطانوں کے عہد تک موجودہ ایران بڑی بڑی سلطنتوں کا ایک جز و رہا اور اس کے کوئی خاص حدود معین نہ ہوئے تھے۔ علاوہ ازیں بنو سامان کے عہد میں جب فارسی زبان کو عروج حاصل ہوا اور اس نے آہستہ آہستہ ایک ادبی زبان بن کر عربی کی جگہ لینا شروع کی تو اس کی نشو ونما کا مرکز محض ایران نہ تھا بلکہ وہ تمام وسیع علاقے تھے جن میں ایک طرف اگر عراق عرب اور افغانستان شامل تھے تو دوسری طرف خراسان اور ماوراء النہر، اس لیے کہ نہ صرف سیاسی اعتبار سے یہ سب ملک ایک تھے بلکہ ان میں ایک گہری معاشرتی یگانگت بھی پیدا ہو چکی تھی۔ آپس کے تجارتی تعلقات کی بنا پر تاجروں کا برابر ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں آنا جانا، امراء کا ایک دوسرے سے میل جول، شاعری اور دوسرے ادیبوں اور عالموں کی ایک دربار سے دوسرے دربار میں رسائی، یہ ساری باتیں ایسی تھیں کہ جو معاشرتی اور ادبی غیریت کو، اگر کوئی ایسی غیریت موجود تھی، دور کر سکتی تھیں۔ اس لیے ہمارے پاس یہ سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ جو فارسی زبان مثلاً شیراز میں رائج تھی وہ اس سے بہت مختلف تھی جو بلخ اور بخارا میں بولی جاتی تھی، اور اگر بالفرض عام بول چال کی زبان میں کوئی مقامی خصوصیتیں تھیں بھی تو کم از کم ادبی زبان میں اس قسم کا کوئی خاص امتیاز نہیں ہو سکتا تھا۔

جب بارہویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں غزنوی خاندان کا چراغ گل ہو گیا اور وہ سلطنت جسے محمود غزنوی نے فروغ دیا تھا، گردشِ زمانہ سے غوریوں کے ہاتھ لگی تو علاء الدین جہاں سوز کے جانشینوں کو ہندوستان کی فتح کا خیال آیا۔ محمود غزنوی نے اپنی زندگی میں متعدد بار ہندوستان پر فوج کشی کی، لیکن اس کے حملے ایک آندھی کی طرح تھے جو گزر گئی، یا ایک بگولے کی مانند تھے جو اپنے راستے میں تباہی پھیلاتا ہوا غائب ہو گیا، پنجاب کے ماسوا اس نے کبھی ہندوستان کے کسی اور حصے کو باقاعدہ اپنی سلطنت میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ محض اس مالِ غنیمت پر قانع رہا جو اسے ہر مہم میں ہندوستان کے زرخیز علاقوں سے ہاتھ لگ جاتا تھا۔ مگر غوری خاندان کے دو بھائیوں یعنی محمد غوری اور شہاب الدین غوری نے ہندوستان کے زیادہ تر

شمال مغربی حصے کو باضابطہ طور پر اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اور ان کے بعد ان کے ایک غلام قطب الدین ایبک کے ہاتھوں ہندوستان میں ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد مضبوطی سے قائم ہوگئی، جس کا مرکز دہلی کا قدیم شہر بن گیا۔ اس طرح گویا ہندوستان میں فارسی شاعری کا آغاز غزنوی دور میں ہوا اور جب تک دہلی فتح نہ ہوا تھا پنجاب کے شہر، خصوصاً لاہور، اس شاعری کا بڑے مرکز رہے، چنانچہ اس زمانے کا ایک بڑا شاعر ابوالفرج رونی لاہور کے قریب ایک گاؤں رون کا باشندہ تھا۔ اس شاعر نے کافی شہرت حاصل کی اور سلطان مسعود بن ابراہیم اور اس کے عہد کے امراء کی تعریف میں اس نے بہت سے قصائد لکھے تھے جن میں سے بعض اب تک محفوظ ہیں۔ کئی قدیم تذکرہ نویس اسے استاد اور افضل الفضلاء کے القاب سے یاد کرتے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ رونی نے شاعری میں بہت بلند مرتبہ پایا تھا۔[2] اس طرح اس کا ایک ہم عصر شاعر، جو ابوالفرج سے بھی زیادہ مشہور ہے یعنی مسعود بن سعد بن سلمان بھی لاہور ہی میں پیدا ہوا۔ اس شاعر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے تین دیوان اپنی یادگار چھوڑے تھے جن میں سے ایک عربی میں تھا، ایک فارسی میں اور ایک ہندی میں۔ اگرچہ اب صرف فارسی دیوان موجود ہے اور باقی دو دیوانوں کا کہیں پتا نہیں چلتا۔[3] ان دونوں شاعروں سے پہلے لاہور کے ایک اور ابوعبداللہ نکتی کا ذکر بھی اکثر تذکروں میں ملتا ہے، لیکن اس شاعر کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں کہ وہ سلطان شہید یعنی سلطان مسعود بن محمود غزنوی کے زمانے میں تھا۔

جب دہلی پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا تو قدرتی طور پر بادشاہ کے دربار کے ساتھ ساتھ ارباب علم وہنر نے بھی دہلی کا رخ کیا، غزنوی سلطنت کے ختم ہوجانے پر غزنیں کے شہر کو اب کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں رہی تھی، اس لیے وہاں کے صاحبِ کمال، جو دور دور سے وہاں آ کر جمع ہوئے تھے، اب ہندوستان کی طرف کھینچنے لگے اور دہلی کے دربار کی رونق بڑھانے لگے، اس زمانے کے مشہور شعرائمیں تاج الدین خاص طور پر قابل ذکر ہے جو سلطان التمش کے عہد میں تھا۔ اس شاعر نے دہلی میں فروغ پایا اور غالباً وہیں کا باشندہ تھا۔ دو اور شاعر جن کے متعلق ہمیں کچھ معلومات حاصل ہیں، شہاب الدین عرف شہاب مہرہ اور عمید الدین تھے، ان میں سے پہلے بدایوں کے اور دوسرے سنام کے رہنے والے تھے جو سامانہ کے قریب ریاست پٹیالہ میں ایک قدیم تاریخی مقام ہے۔ انہی شعراء کے جانشین امیر خسرو اور خواجہ حسن تھے جن کے نام پر نہ صرف دہلی بلکہ تمام ہندوستان کو ناز ہے، اور بجا طور پر ہے، اس لیے کہ ان کے مقابلے کے شاعر ایران کی شاعر خیز

زمین نے بھی کم پیدا کیے ہیں اور ہندوستان میں تو اس وقت سے اب تک چھ سو سال کے طویل عرصے میں کوئی ایسا فارسی گوشاعر نہیں پیدا ہوا جو ان کی برابری اور ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔

ہندوستان میں فارسی شاعری کے ارتقا کے اس مختصر تبصرے سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس شاعری کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جب ایران اور ہندوستان کے درمیان میں نہ تو جغرافیائی اور سیاسی حدود حائل تھیں اور نہ ادبی اور معاشرتی، گویا فارسی زبان کی بہترین روایت جن میں شیرۂ شیراز کی چاشنی بھی تھی اور نبات سمرقند کا ذائقہ بھی، ہندوکش اور سندھ کو پار کر کے پہلے لاہور پہنچیں اور پھر وہاں سے دہلی، ان روایتوں کو قائم اور برقرار رکھنے کے وہ گہرے تعلقات ضامن تھے جو ایران اور ہندوستان میں اس زمانے میں تھے اور مغل بادشاہوں کے زمانے تک برابر رہے، اور بالفرض اگر مرور زمانہ سے ہندوستان کی فارسی زبان میں تھوڑا سا نمک ہندی بھی شامل ہو گیا تو اس کی وجہ سے یقیناً نہ تو زبان کی خوبی زائل ہوئی اور نہ فارسی شاعری کی ضرب المثل شیرینی میں کوئی خلل واقع ہوا۔ خصوصاً امیر خسرو اور خواجہ حسن جیسے شاعروں کے متعلق تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان کی زبان ویسی ہی پاکیزہ اور خالص تھی جیسی کہ ایران کے بڑے بڑے شعراء کی، اور اگر کہیں خسرو کے کلام میں ہندیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے تو وہ فارسی محاورے سے ناواقفیت کی بناء پر نہیں بلکہ ان کی جدت پسند طبیعت اور وطن پرستی کے اس جذبے سے پیدا ہوئی جس کا اظہار وہ اکثر اپنے کلام میں کرتے ہیں۔ ورنہ ان کی نظم کی خوبی کی اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ ایران کے نقادوں نے ان کے کلام کی تعریف کی۔ بلکہ خواجہ حافظ نے بھی جب یہ شعر بنگالے کے حاکم غیاث الدین کو لکھ کر بھیجا کہ۔

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

تو یقیناً ان کے ذہن میں طوطیٔ ہند امیر خسرو کا ہی خیال تھا۔

لیکن ان سب باتوں کو جانتے ہوئے بھی اگر کوئی ہندوستان کی قدیم فارسی شاعری کو حقارت کی نظر سے دیکھے تو اسے سوائے ہٹ دھرمی کے کیا کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اس قسم کی رائے رکھنے کے لیے کوئی عذر ہو سکتا ہے تو وہ یا تو حقیقت سے ناواقفیت اور یا قومی تعصب ہی ہو سکتا ہے، اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو رائے اس طرح قائم کی جائے وہ اہلِ بصیرت کے نزدیک ہرگز قابلِ اعتنا نہیں ہوگی۔

حصہ اول

سوانح حیات

پہلا باب

خسرو کا حسب ونسب، ان کے اجداد کا ہندوستان میں ورود، ان کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

بارہویں صدی عیسوی کا زمانہ عالم اسلام کے لیے بعض لحاظ سے انتہائی عروج کا وقت تھا۔ تہذیب اور تمدن کا وہ شاداب چمن، جس کو مسلمان حکمرانوں اور علما اور فضلا نے اپنی انتھک کوششوں اور بے حس جاں فشانی سے صدیوں تک سینچا تھا، اس زمانے میں اپنی پوری بہار پر تھا۔ ابھی وہ طوفان بلا، وہ تباہ کن آندھی یعنی چنگیز خان کی یورش جس نے اس لہلہاتے ہوئے باغ کو جلا کر خاکستر کر دیا، وہ چلنا شروع نہ ہوئی تھی۔ البتہ اسلامی سلطنت کا پرانا مضبوط شیرازہ ضرور بکھر چکا تھا اور یہ عظیم الشان سلطنت جس کی نظیر فلک پیر نے بھی کم دیکھی ہوگی، الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ بغداد کے خلیفہ سرکش اور زبردست امراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے، اور دارالسلام کی چاردیواری کے باہر ان کا سیاسی اثر یا حکومت محض برائے نام رہ گئی تھی۔ لیکن پھر بھی خلیفہ کی مذہبی سیادت زیادہ تر مسلمان ملکوں میں تسلیم کی جاتی تھی اور ان ملکوں کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ مشرقی ملک کے شہر خصوصاً سامانی اور غزنوی کے حکمرانوں کے علم دوستی اور ہنر پروری کی وجہ سے نہ صرف تجارت اور مال و دولت کا گھر تھے بلکہ علم اور فن کے بھی بڑے مرکز بن گئے تھے، غزنین، بخارا، خیوا، شیراز، اصفہان، غرض بیسوں ایسے شہر تھے جو شان و شوکت میں بغداد سے ہم سری اور دمشق سے روکشی کا دعویٰ رکھتے تھے، جن کی مسجدوں کے مینار اور محلوں کے برج آسمان سے باتیں کرتے تھے، جن کی بڑھتی ہوئی آبادی ان کی چاردیواری میں نہ سماتی تھی، جہاں دور دور سے سیاح اور طالبعلم کھنچے چلے آتے تھے اور جن کی زمین حقیقت میں سونا اُگلتی تھی۔

یہ سب کچھ تھا لیکن سلطنت کا مختلف بادشاہوں میں تقسیم ہو جانا قدرتی طور پر آپس کی

رقابت کو فروغ دیتا تھا، اور اگر یہ رقابت محض علمی اور ادبی میدانوں تک محدود رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا، لیکن ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا شوق اکثر ان حکمرانوں کو میدان جنگ میں بھی لا کھڑا کرتا تھا، اس لیے اگر ایک طرف انہیں بے دریغ روپیہ صرف کر کے اپنے دربار میں عالموں، ادیبوں اور شاعروں کو جمع کرنے کا سودا رہتا تھا تو دوسری طرف اپنے حریفوں کے مقابلے اور اپنے ملک کی حفاظت کے لیے فوجی انتظامات اور جنگی ساز و سامان تیار رکھنے کا فکر بھی دامن گیر رہتا تھا، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان ملکوں میں ایک سیاسی اور فوجی نظام قائم ہو گیا تھا جو یورپ کے قرونِ وسطیٰ کی ''فیوڈلزم'' سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا، ہر ایک امیر کا یہ فرض تھا کہ وہ لڑائی کے موقع پر اپنے بادشاہ کو ایک مقررہ تعداد سپاہیوں کی مہیا کر کے دے اور ان سپاہیوں کے اخراجات کا ذمہ دار ہو۔ اب وہ زمانہ نہ رہا تھا کہ ہر ایک مسلمان سپاہی ہو اور وہ ضرورت کے وقت اپنی خوشی سے دشمنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لیے آمادہ اور تیار رہے، بلکہ کچھ سپاہی تو مستقل طور پر فوج میں ملازم رکھے جاتے تھے اور کچھ لڑائی کے موقع پر بھرتی کر لیے جاتے تھے۔ بعض علاقوں اور قوموں کے لوگ خاص طور پر فوجی ملازمت کے لیے پسند کیے جاتے تھے اور ان قوموں میں ترکوں کو بنو عباس کے ابتدائی دور ہی سے اپنی دلیری اور شجاعت کی بنا پر خاص امتیاز حاصل ہو چکا تھا۔ اس لیے کہ عباسی خلفا کو جب سرکش عربوں اور ایرانیوں کو دبانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی نظر انہیں جفاکش اور جنگجو لوگوں پر پڑی اور واقعہ یہ ہے کہ ترکوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی سپہ گری کی دھاک تمام عالمِ اسلام میں باندھ دی اور آگے چل کر وہ عربوں کی بجائے اسلام کے سب سے بڑے حامی اور مددگار بن گئے۔

ترکوں کی آبادی وسط ایشیاء میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، یہ لوگ امن کے زمانے میں سیدھے سادھے دیانتدار کسانوں کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے، لیکن جنگ کے وقت جوق در جوق فوجوں میں بھرتی ہو کر دادِ شجاعت دیا کرتے تھے۔ ماوراء النہر کے ترک خصوصاً اپنی بہادری کے لیے مشہور تھے، چنانچہ الاصطخری ان کے متعلق لکھتا ہے کہ اسلامی قوموں میں ان ترکوں کی طرح کفار سے لڑنے والی کوئی اور قوم نہیں ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ماوراء النہر کے چاروں طرف کفار کی آبادی ہے۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ ان ترکوں سے بڑھ کر کوئی جری قوم نہیں ہے وہ کافر ترکوں کے خلاف اسلام کی پشت و پناہ ہیں، بہادری کے ساتھ ساتھ اپنے بزرگوں کی اطاعت اور اپنے بڑوں

اور برابر والوں کی خدمت کرنے میں بھی یہ لوگ سب سے بڑھ کر ہیں۔اس لیے خلفا کو یہ ترغیب ہوتی تھی کہ اپنی فوجوں کے لیے ان ترکوں میں سے سپاہی لیں اور اس طرح ماوراء النہر کے کسان اور ان کی فوجوں کے قائدان کے خدام اوران کے پسندیدہ مصاحب بن گئے تھے۔[1]

اس زمانے کے نظام کے مطابق سپاہیوں کی تقسیم دہائیوں میں ہوتی تھی، سب سے چھوٹی فوجی جماعت دس سپاہیوں پر مشتمل ہوتی تھی، اس کے بعد سو، ہزار، پانچ ہزار وغیرہ کی جماعتیں ہوتی تھیں، غرض یہ کہ فوج کا ہر ایک حصہ یا دس کے ضعف پر مبنی ہوتا تھا اور اسی تعداد کے لحاظ سے فوجی افسروں کے عہدے معین ہوتے تھے۔ یہ نظام ہندوستان میں مغل بادشاہوں کے زمانے میں برابر قائم رہا، چنانچہ امراء کے منصب، مثلاً پانچ ہزاری یا ہفت ہزاری اسی مناسبت سے ہوتے تھے، عثمانی ترکوں میں یہ نظام فوج اب تک قائم ہے، ان کے افسروں کے خطاب، اون باشی، یوز باشی، بیک باشی، اس کے شاہد ہیں۔ لیکن یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس اعشاری تقسیم میں ہزار کی تعداد میں آدمی لیے جاتے تھے، اور ہزار سپاہیوں کا ایک دستہ ہزارہ کہلاتا تھا، چنانچہ اس سلسلے میں امیر خسرو کا یہ شعر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ۔

گرز دشمن بود ہزار سوار
چشم تو میران ہزار بود

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ یا ''ہزارہ'' جس علاقے سے لیا جاتا تھا اسی علاقے کے نام سے پکارا جاتا تھا یا بعض صورتوں میں اپنے قبیلے کے سردار یا مورث اعلیٰ کے نام سے منسوب ہوتا تھا، اور عرصہ گزر جانے کے بعد جب وہ فوجی نظام درہم برہم ہو چکا تھا اور یہ ضروری نہ رہا تھا کہ کوئی خاص قبیلہ کسی امیر کے ماتحت ہو اور جنگ کے زمانے میں اپنا ہزار کا دستہ بھیجتا ہو، تو بھی قبیلے کا قدیم نام ''ہزارہ'' باقی رہا، یہی نہیں بلکہ بعض اوقات جہاں کوئی ''ہزارہ'' جا کر آباد ہو گیا وہ علاقہ بھی ہزارہ کہلانے لگا، چنانچہ ہندوستان کے شمال مغربی حصے میں جو علاقہ ہزارہ کے نام سے موسوم ہے، اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہی ہے کہ کسی زمانے میں، بہت ممکن ہے کہ اس زمانے میں جب چنگیز خان نے بہادر مگر بدنصیب جلال الدین خوارزمی کے تعاقب میں ہندوستان کا رخ کیا تھا، کچھ ہزارہ قبیلے یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔

انہی جنگجو ہزارہ ترکوں میں سے خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود بھی تھے۔ خسرو کے سب سوانح نگار اس پر متفق ہیں کہ یہ ترک تھے اور ان کے قبیلے کا نام ہزارہ لاچین تھا اور امیر خسرو خود اپنے کو کئی جگہ خسرو لاچین کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لاچین ایک ترکی لفظ ہے جس کے معنی باز یا شاہین کے بھی ہوتے ہیں اور غلام کے بھی۔ خسرو کے اپنے ایک بیت کی بنا پر بظاہر دوسرا مفہوم زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

خنہ کہ در عہد تو سلطان سخن
خسرو لاچین سلطانی شدہ است

گویا لفظ لاچین اور سلطانی سے صفت تضاد پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

بہر حال اس لفظ کا مفہوم اتنا اہم نہیں ہے جتنی یہ بات کہ لاچین کس کا نام تھا۔ کسی علاقے کا نام تو ظاہر ہے لاچین نہیں ہو سکتا، کسی آدمی ہی کا نام ہوگا۔ زیادہ تر تذکرہ نویس اس کے متعلق خاموش ہیں، لیکن ایک آدھ نے لکھا ہے کہ لاچین امیر خسرو کے والد کا نام تھا۔ یہ روایت قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی، اس لیے امیر خسرو نے اپنے والد کا نام ہمیشہ سیف الدین یا محض سیف ہی لکھا ہے، یہ ضرور ہے کہ امیر سیف الدین کے اپنے قبیلے کا نام ہزارہ لاچین انہی کے نام پر تھا۔ زیادہ قرینِ قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاچین ان کے کسی بزرگ کا نام تھا جو کسی زمانے میں اپنے قبیلے کے سردار رہے ہوں گے، خسرو لاچین کی ترکیب پر اپنی اضافت کا گمان یقیناً ہو سکتا ہے لیکن اس قسم کی اضافت صرف باپ ہی کی طرف نہیں بلکہ جد یا مورثِ اعلیٰ کی طرف بھی ہو سکتی ہے۔[3]

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قبیلے یعنی لاچین کا اصلی وطن کہاں تھا اور کس زمانے میں یہ قبیلہ ہندوستان میں آ کر آباد ہوا۔ دولت شاہ سمرقندی کا بیان ہے کہ ایک روایت کے مطابق ان کا اصلی وطن کش کا شہر تھا جو اب قبۃ الخضرا کے نام سے مشہور ہے، لیکن بعض اور روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہزارہ لاچین سے تھے جو قرشی اور مایمرغ کے نواح میں آباد تھا اور ہنگامہ چنگیزی کے زمانے میں یہ لوگ ماوراء النہر سے ترکِ وطن کر کے ہندوستان میں آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے برخلاف زیادہ تر سوانح نگار جن میں سے بعض کا بیان عام طور پر دولت شاہ کے بیان سے زیادہ معتبر سمجھا جا سکتا ہے مثلاً جامی اور مرزا حسین بلقرائیہ لکھتے ہیں کہ چنگیز خاں کے زمانے میں یہ لوگ

بلخ اور اس کے آس پاس آباد تھے اور وہاں سے ہندوستان وارد ہوئے۔ ان دونوں روایتوں میں سے میں دولت شاہ کے بیان کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہوں، اس لیے کہ امیر خسرو اپنے کلام میں بلخ اور بخارا شہروں اور وہاں کے باشندوں کا جنھیں وہ بالائی کہتے ہیں، اکثر حقارت آمیز طریقے اور تضحیک کے پیرائے میں ذکر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں کش، مایمرغ اور قرشی جن کا دولت شاہ نے ذکر کیا ہے، سب ماورالنہر کے صوبے میں ہیں اور اس علاقے کے ترک خاص طور پر جنگی صفات رکھتے تھے، جو ہزارہ لاچین میں پائی جاتی تھیں اور جن کا ثبوت امیر خسرو کے والد سیف الدین محمود نے ہندوستان میں اپنے جوہر شجاعت دکھا کر دیا۔ اگرچہ ان دونوں روایتوں میں ایک صورت مطابقت کی یوں پیدا کی جاسکتی ہے کہ ہزارہ لاچین کا اصل وطن کش، مایمرغ اور قرشی کو مان لیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ بعد میں یعنی ہندوستان آنے سے کچھ عرصہ پہلے یہ قبیلہ بلخ کے گردونواح میں آکر مقیم ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ عرب جغرافیہ نویسوں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ شہر ایک چھوٹی سی ندی کشکارود کے کنارے واقع ہے۔ بعض اور چھوٹی چھوٹی ندیاں، جیسے نہرارسود، چلی رود اور خضر رود بھی اس کے قریب ہی سے بہتی ہیں۔ ابنِ حوقل کے زمانے میں یہاں ایک قلعہ اور مضبوط چاردیواری تھی، کئی ندیوں کے قرب کی وجہ سے کش کے گردونواح کا علاقہ بہت زرخیز تھا۔ امیر تیمور کے زمانے میں اس شہر کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی، اس لیے کہ امیر تیمور یہیں پیدا ہوا تھا اور غالباً اسی تعلق کی وجہ سے اس نے اس شہر کو از سرِ نو تعمیر کرا کے اس میں شاندار محل بنوایا تھا، جس کا نام آق سرائی (سفید محل) تھا اور جس میں وہ اکثر آکر ٹھہرتا تھا۔ غالباً اسی زمانے میں اس شہر کا عام نام شہر سبز ہو گیا جسے دولت شاہ نے قبۃ الخضر امیں تبدیل کر دیا ہے۔ مایمرغ بھی کش کے نواح ہی میں ایک مقام کا نام تھا لیکن قرشی جسے عرب اکثر نسف کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ نور ایرانی زیادہ تر نخشب لکھتے ہیں، کش سے کوئی سو میل جنوب کی طرف واقع ہے۔ چنگیز خان کے بعد ایک مغل شہزادے نے یہاں ایک محل تعمیر کرایا تھا اور اسی مناسبت سے اس شہر کا نام قرشی مشہور ہو گیا۔

ہزارہ لاچین کے ہندوستان میں آنے کا صحیح زمانہ معین کرنا مشکل ہے لیکن قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ قبیلہ چنگیز خان کے زمانے یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا۔ ہندوستان میں اس وقت تک قطب الدین ایبک کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا ایک غلام شمس الدین التمش دہلی کے تخت پر متمکن تھا۔ اس قابل بادشاہ نے تاجِ حکومت سنبھالتے ہی اپنا اقتدار اور اثر تمام شمالی

ہندوستان میں قائم کرلیا تھا اور اپنے حریفوں کو، جن میں سے سب سے زیادہ زبردست تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ حاکمِ ملتان تھے، زیر کرنے کے بعد بنگال کے خلیجوں کو بھی وہاں کی حکومت سے نکال باہر کیا تھا۔ ان مہموں کے لیے اسے بہادر سپاہیوں کی ضرورت تھی اور اس طرح امیر سیف الدین محمود نے بھی مع اپنے ساتھیوں کے اس بادشاہ کی ملازمت اختیار کرلی اور دہلی کے قریب ہی ایک مقام پٹیالی میں جسے مومن آباد یا مومن پور بھی کہتے ہیں اور جو دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے، مقیم ہوگئے۔ بہت ممکن ہے کہ پٹیالی ان کی جاگیر میں شامل ہو۔ اگرچہ اس کا ذکر کوئی سوانح نگار یا مورخ نے نہیں کیا۔ برنی نے صرف یہ لکھا ہے کہ انہیں بارہ سو تنکہ سالانہ وظیفہ ملتا تھا[4] لیکن یہ ظاہر ہے کہ اپنے قبیلے کا سردار ہونے کی حیثیت سے انہیں کوئی نہ کوئی بڑا منصب ملا ہوگا اور اس کے ساتھ جیسا کہ عام قاعدہ تھا جاگیر بھی۔ خسرو کے اپنے بیانات سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امیر سیف الدین، التمش کے عہد میں کوئی بڑی حیثیت رکھتے تھے اور اس بادشاہ کو ہندوستان کی تسخیر اور اپنی سلطنت کو مضبوط بنانے میں انہوں نے بہت مدد دی تھی، چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

جہاں بقوت اومی گرفت التمش
کہ برکشیدہ خدا یش ز قبضۂ قدرت

اس کے علاوہ چونکہ خسرو اپنے والد کو اکثر سیف شمسی یا سلطانی شمسی کے نام سے یاد کرتے ہیں تو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ وہ التمش کے خاص امیروں میں سے تھے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہمیں ان کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں۔

ہندوستان میں آنے کے بعد امیر سیف الدین نے عماد الملک کی ایک بیٹی سے شادی کی اور اسی شادی سے 651ھ میں امیر خسرو پٹیالی میں پیدا ہوئے، امیر خسرو کے ہندوستان میں پیدا ہونے کے متعلق کسی قسم کا شبہ نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ تقریباً سب سوانح نگار اس پر متفق ہیں، سوائے اس کے ایک تذکرہ نویس یعنی والہ داغستانی نے یہ لکھا ہے کہ وہ بلخ سے اپنے والد کے ساتھ ہندوستان آئے تھے[5] لیکن اگر اس بیان سے کسی کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہو تو وہ امیر خسرو کے اپنے بیانات سے دور ہوسکتا ہے۔ مثلاً ''نہ سپہر'' میں ہندوستان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہست مرا مولد و ماوی و وطن

خسرو[6] کے دو بھائی اور تھے جن میں سے ایک کا نام عزیز الدین علی شاہ تھا۔ یہ غالباً خسرو سے بڑے تھے۔ کیونکہ خسرو ان کا ذکر اکثر عزت اور احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ خسرو ان کی عربی اور فارسی کی قابلیت کی تعریف بھی لکھتے ہیں لیکن ان کے متعلق ہمیں صرف یہ معلوم ہے کہ وہ اپنے والد کے انتقال پر بڑے بیٹے کی حیثیت سے ان کے جانشین ہوئے۔ تیسرے بھائی جو خسرو سے سن میں چھوٹے تھے حسام الدین قتلغ تھے۔ انہوں نے علم و ادب میں بظاہر کوئی ناموری حاصل نہیں کی بلکہ سپاہی پیشہ آدمی تھے اور اپنے آباؤ اجداد کے نام کو انہوں نے اپنے قلم کے زور سے نہیں بلکہ تلوار کے جوہر دکھا کر روشن کیا تھا۔ چنانچہ خسرو اپنی مثنوی ''مجنون و لیلیٰ'' میں ان کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شہسواری میں وہ ایک دلیر باز کی طرح تھے، لڑائی کے فن میں وہ پوری مہارت رکھتے تھے اور اسی لیے بادشاہ نے انہیں حسام الدین (دین کی تلوار) کا خطاب دیا تھا۔ حملے میں وہ اپنے والد کی طرح دلیر تھے، میری طرح نہیں کہ میری تلوار ٹوٹ چکی، چونکہ انہوں نے اپنے والد کے فن میں ایسی مہارت پیدا کر لی تھی اس لیے وہ اب انہی کی سرزمین (یعنی ملک عدم) میں جا بسے ہیں، انہوں نے اپنی جان اپنے والد کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دے دی اور ان کے مرنے کا رنج میرے دل کو نصیب ہوا۔

بہرحال یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ تینوں بھائیوں میں خسرو ہی سب سے زیادہ ذہین اور ہونہار تھے اور بچپن سے اپنی غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دینے لگے تھے، بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ خسرو جب پیدا ہوئے تو ان کے والد انہیں ایک خرقے میں لپیٹ کر ایک بزرگ کے پاس لے گئے اور ان بزرگ نے انہیں دیکھتے ہی کہا کہ امیر محمود تم ایک ایسے بچے کو میرے پاس لائے ہو جو بڑا ہو کر خاقانی سے بھی سبقت لے جائے گا[7] یہ روایت ممکن ہے صحیح ہو، ممکن ہے غلط ہو لیکن خسرو نے اپنے دیوان ''دیباچہ الصغر'' کے مقدمے میں اپنے بچپن کے جو بعض دلچسپ حالات لکھے ہیں ان سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کا مادہ ان میں پیدائشی تھا اور بہت چھوٹی عمر میں وہ ایسی آسانی سے شعر موزوں کر لیتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر لکھتے ہیں (اس وقت ان کی عمر دس سال سے زائد نہ تھی) کہ ان کے استاد قاضی اسد الدین جو اپنے زمانے کے مشہور خطاط تھے، انہیں اپنی ہمراہی میں قاضی عزا الدین کے گھر لے گئے، یہ قاضی صاحب علم

اور فصل میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ جب یہ لوگ ان سے ملنے کو گئے تو وہ نظم کی کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ قاضی اسدالدین نے ان سے کہا کہ یہ چھوٹا بچہ میرا شاگرد یعنی شاعری میں بہت بلند پروازی کرتا ہے ذرا اس سے بھی ایک دو شعر پڑھوا کر دیکھیے۔ اس پر عزاالدین نے ایک کتاب خسرو کے ہاتھ میں دے دی اور پڑھنے کو کہا، خسرو نے ایسی شیریں اور مترنم آواز میں پڑھنا شروع کیا کہ سامعین پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوگئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، اس کے بعد قاضی اسدالدین نے کہا کہ شعر پڑھ لینا تو کوئی بڑی بات نہیں، آپ اسے کہیے کہ کچھ شعر خود کہہ کے بھی سنائے تا کہ اس کی ذہانت کا امتحان ہو سکے اس پر خواجہ عزاالدین نے چار متفرق چیزوں کے نام لیے، جن میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں یعنی مو، بیضہ، تیر اور خربزہ اور کہا کہ ان کو ایک رباعی میں موزوں طریقے سے بیان کرو، خسرو نے برجستہ یہ رباعی کہی:

ہر موی کہ در دو زلف آن صنم است
صد بیضۂ عنبریں بر اں موی ضم است
چوں تیر مدان راست دلش را زیرا
چوں خربزہ دندانش میاں شکم است

رباعی سن کر خواجہ انگشت بدنداں رہ گئے اور انہوں نے خسرو کی بے انتہا تعریف کی۔ اس کے بعد انہوں نے خسرو سے ان کا نام دریافت کیا اور پھر ان کے والد کا، والد کا نام خسرو نے سلطانی شمسی بتایا۔ یہ سن کر خواجہ کہنے لگے کہ ''چونکہ تمہارے والد کا نام سلطانوں سے نسبت رکھتا ہے اس لیے تمہارا تخلص سلطانی ہونا چاہیے۔ یہ تخلص تمہارے لیے فال نیک ثابت ہوگا، کسی شاعر نے اب تک، خواہ وہ کتنی ہی اہمیت کیوں نہ رکھتا ہو، اقلیم سخن میں ایک درہم سے زیادہ وقعت حاصل نہیں کی، ہمارے زمانے کا سکہ ''سلطانی'' دو درہم کے برابر ہے، اس لیے تم یقین رکھو کہ تمہاری شہرت اور مقبولیت اور سب شعرا سے دوگنی ہوگی۔''

امیر سیف الدین محمود بظاہر صرف تلوار کے دھنی تھے۔ وہ سپاہیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور اس لیے انہیں نہ تو اس کا موقع تھا اور نہ اتنی فرصت کے میدان علم میں بھی کوئی غیر معمولی کارنامہ دکھا سکیں، بلکہ خسرو نے انہیں اپنے دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں ''اُمّی'' یعنی ناخواندہ یا اَن

پڑھ لکھا ہے، لیکن امیر خسرو کی ذہانت اور تحصیل علم کا شوق دیکھ کر انہوں نے ان کے لیے تعلیم کا بہترین انتظام، جیسا کچھ بھی اس زمانے میں ممکن تھا، ضرور کیا ہوگا۔ اس سلسلے میں ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں کیونکہ خسرو نے خود بھی اپنے صرف ایک استاد قاضی عزالدین خطاط کا ہی ذکر کیا ہے جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، قاضی عزالدین خوش نویسی میں کمال رکھتے تھے اور اسی لیے خسرو ایک بیت میں ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

گیسوئے تو ہمچو خط خواجہ است کہ در وے
آسان نتواند کہ نہد ہر پسر انگشت

اس کے ساتھ ہی ان کا قاضی کا لقب یا خطاب یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ خوش نویسی کے علاوہ اور علوم میں بھی دسترس رکھتے تھے، مگر یہ یقینی بات ہے کہ قاضی عزالدین کے علاوہ اور بعض قابل اور ذی علم اساتذہ خسرو کی ابتدائی تعلیم کے لیے مقرر کیے گئے ہوں۔ کیونکہ خسرو اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں کہ ان کی تمام تر کوشش یہی رہی کہ میں بے حاصل کچھ حاصل کرلوں۔ اس زمانے تک ہندوستان میں بڑی تعداد میں عالم اور فاضل اساتذہ جمع ہو چکے تھے اور دربار سے تعلق کی وجہ سے امیر محمود کو ان میں سے اکثر سے ملنے کا موقع ملتا ان رہتا ہوگا۔ اس لیے اپنے ہونہار بیٹے کی موزوں اور مناسب تعلیم کے لیے ان سے بڑھ کر اور کسے موقع مل سکتا تھا۔ خسرو کی علمی استعداد کے متعلق ذرا آگے چل کر میں زیادہ تفصیل سے لکھوں گا، لیکن خسرو کے اپنے بیان سے یہ پایا جاتا ہے کہ بچپن میں ان کی اپنی توجہ اور طبیعت کا میلان اور علوم کی نسبت شاعری کی طرف بہت زیادہ تھا۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "میرے والد مجھے مکتب بھیجا کرتے تھے لیکن میں ردیف اور قافیے کے چکر ہی میں رہتا تھا۔ میرے قابل استاد عزیز الدین محمد خطاط جو عام طور پر قاضی کے لقب سے مشہور تھے، مجھے خوش نویسی سکھانے کی کوشش کیا کرتے تھے، لیکن میں مہ جبینوں کے خط کی تعریف میں شعر کہتا رہتا تھا اور اپنے استاد کی پوری کوشش کے باوجود جو طرۂ یار کی طرح دارز اور مسلسل تھی، میں زلف اور خال کے شوق سے باز نہ آتا تھا۔"[8]

خسرو کے اس بیان سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں ابتدا ہی سے شعر و شاعری کا غیر معمولی شوق تھا، وہاں یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ خسرو نے کم از کم آغاز عمر میں زیادہ ٹھوس اور زیادہ

سنجیدہ مطالعے کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، شاعری کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے، جو شخص ہر وقت اپنے خیالات میں محو رہتا ہو، جس کے دماغ میں ہر وقت بیسیوں حسین شکلیں بنتی ہوں اور بگڑتی ہوں، جس کی نظر اپنے گرد و پیش کی چیزوں سے بے نیاز ہو کر اُس حُسنِ ازلی کو نامعلوم فضاؤں میں تلاش کرتی رہتی ہو، جس کا پَرتَو دنیا کی ہر ایک خوب صورت چیز میں موجود ہے، اسے پنج گنج یا ہدایہ کے درسوں میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے، اور کافیہ اور کنز کے اوراق میں اس کے لیے کیا دل کشی پائی جا سکتی ہے اور اسی لیے میرا خیال یہ ہے کہ خسرو نے جو کچھ بھی علمی استعداد پیدا کی، جس کے قابلِ قدر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، نہ تو وہ خشک کتابوں کے صفحوں میں دیدہ ریزی اور دماغ سوزی سے انہیں حاصل ہوئی اور نہ ہی استادوں کی مدد سے۔ بلکہ زیادہ تر ان کی اپنی فطرتی ذہانت اور ارباب علم کی صحبت کا فیضان تھا جس نے انہیں اپنے زمانے کے ان تمام علوم اور فنون میں جن کا جاننا ایک تعلیم یافتہ اور مہذب شخص کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا، شہرۂ روزگار بنا دیا تھا۔ خود فنِ شاعری میں بھی، جہاں تک ہماری تحقیق کام دیتی ہے، وہ کسی کے رہینِ منت نہ تھے اور نہ کبھی انہوں نے کسی شاعر سے باقاعدہ اصلاح لی۔ اپنی بعض تصانیف میں وہ ایک ہم عصر عالم شہاب الدین کا ذکر ضرور کرتے ہیں کہ ان سے بعض نظموں میں انہیں اصلاح ملی۔ لیکن یہ بزرگ کون تھے، یہ کہنا مشکل ہے اور بظاہر خسرو کا ان سے اصلاح لینا زیادہ تر تیمن کے طور پر تھا نہ کہ باقاعدہ شاگردی کے طریقے پر۔ اس لیے کہ خسرو کے بیان سے ان بزرگ کا تقدس اور تبحر علمی زیادہ ظاہر ہوتا ہے اور فن شعر میں مہارت کم، کیوں کہ اکثر خسرو انہیں امام یا امام شہاب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بعض سوانح نگاروں نے ان شہاب الدین کو شہاب مہرہ سمجھا ہے، لیکن یہ بات بعید از قیاس ہے اس لیے کہ شہاب مہرہ سلطان التمش کا بیٹا اور جانشین رکن الدین ابراہیم کا ہم عصر تھا، اور اس بادشاہ کی تعریف میں اس کے متعدد قصیدے موجود ہیں۔ اس بادشاہ کو 634ھ میں معزول کر کے قید کر دیا گیا تھا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ گویا شہاب مہرہ کے عروج کا زمانہ خسرو کی پیدائش سے کوئی 19 سال پہلے گزر چکا تھا اور اس طرح اگرچہ یہ ممکن ہے کہ خسرو کے سن بلوغ کے پہنچنے تک زندہ ہو، لیکن اس کا امکان بہت ہی کم ہے کہ وہ خسرو کے عین عروج کے وقت یعنی علاؤالدین خلجی کے زمانے میں زندہ تھا اور دہلی میں موجود تھا، لیکن خسرو نے جن شہاب الدین کا ذکر کیا ہے ان سے خسرو کو جو کچھ مدد یا اصلاح ملی وہ اس زمانے میں ملی کیونکہ وہ ان کا تذکرہ ایک تو خاص طور پر "غرۃ الکمال" کے دیباچے میں کرتے

ہیں جو 695ھ میں مرتب کیا گیا اور ایک ''ہشت بہشت'' میں جس کا سنہ تالیف 701 ہجری ہے اور اسی دیباچے میں خسرو لکھتے ہیں کہ ''مولانا شہاب الدین مہرہ و مولانا بہاء الدین بخاری کہ ہر یکے بستان علم را بلبلے بردہ اند'' جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شہاب مہرہ کا 695ھ سے قبل انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے علاوہ خسرو کے اس شعر سے بھی کہ:

در مداران (بدایوں) مست برخیز و شہاب مہرہ
بشنود از نغمۂ مرغان دھلی گر نوا

یہ نتیجہ آسانی سے نکل سکتا ہے کہ اوّل تو خسرو کے زمانے میں شہاب مہرہ زندہ نہ تھا اور دوسرے یہ کہ اس کا شماران کے زمانے کے شعرائے دہلی (مرغان دہلی) میں نہ تھا۔ اس لیے خسرو کو شہاب مہرہ کا شاگرد سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ باقی رہے مولانا شہاب الدین، تو ممکن ہے کہ یہ وہی شاعر ہوں جن کا ذکر برنی نے اور فرشتہ نے علاؤالدین خلجی کے عہد کے شعرا میں شہاب صدر نشین کے نام سے کیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ خسرو نے ان کی علمی قابلیت اور عربی دانی کی بہت تعریف کی ہے اور اعجاز خسروی میں ایک خط پورا عربی میں ان کے نام لکھا ہے وہ شاعر ضرور تھے کیونکہ خسرو کہتے ہیں ''کہ اگر انہیں اپنے کلام کو جمع کرنے کا خیال آتا...'' لیکن بظاہر شاعری میں انہوں نے زیادہ نام پیدا نہیں کیا، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ کہیں بھی ان کے کلام کے نمونے دستیاب نہ ہو سکتے۔ اس لیے میرا خیال بھی ہے کہ خسرو نے ان سے علمی استفادہ وقتاً فوقتاً ضرور کیا، لیکن شاعری میں ان کے آگے باقاعدہ زانوئے شاگردی کبھی تہ نہیں کیا۔ اس خیال کو خسرو کے اس بیان سے بھی تقویت ملتی ہے کہ انہی شہاب الدین نے اور ان کے دو اور دوستوں یعنی علاؤالدین علی شاہ اور تاج الدین زاہد نے انہیں نہ صرف اپنا کلام جمع کرنے کی ترغیب دی بلکہ اس کام میں ان کی اعانت بھی کی تھی۔

بہر حال یہ امر مسلّم ہے کہ خسرو شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے۔ اگر انہیں اس کا خیال بھی آتا تو ان کی جدت پسند طبیعت غالباً اسے گوارا نہ کرتی کہ وہ استادی شاگردی کے قدیم سلسلے کا اپنے کو پابند بنا کر اپنے فطرتی ذوق اور رجحان پر بے جا قیود عائد کر لیتے۔ برخلاف اس کے فنِ شعر میں مہارت حاصل کرنے کا انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے پرانے اور مشہور اساتذہ کے کلام کو پڑھنا شروع کیا اور ان میں سے جس کا کلام پسند آیا اسی کی مخصوص طرز میں خود

بھی شعر کہنے لگے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نظرِ انتخاب پہلے ایران کے بڑے بڑے شاعروں کی طرف اٹھی، اس زمانے میں سعدی زندہ تھے، خاقانی، سنائی اور انوری کا دور ختم ہو چکا تھا۔ کمال خجندی کا بھی خاصا شہرہ تھا اور وہ ''خلاق معانی'' کے لقب سے مشہور تھے، خسرو نے انہی استادوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ان سب کا رنگ جھلکتا ہے۔ اپنی اس ابتدائی مشق کے متعلق خسرو دیباچہ ''تحفۃ الصغر'' میں خود یوں لکھتے ہیں۔

''میں بارہ سال کا تھا کہ مختلف قسم کی شاعری کی بنیاد میرے دماغ میں مستحکم ہوگئی۔ جب اس زمانے کے شاعروں اور علماء نے فنِ شعر میں میری مہارت دیکھی تو وہ حیران رہ گئے اور ان کی یہ حیرانی میرے لیے مزید فخر کا باعث ہوگئی، کیونکہ میرا کلام سن کر وہ میری بہت تحسین و آفرین کیا کرتے تھے، لیکن مجھے اس قسم کی ہمت افزائی کی کوئی خاص ضرورت بھی نہ تھی کیونکہ مجھے اس دلکش فن کا اتنا خبط ہوگیا تھا کہ صبح سے شام تک قلم کی طرح میرا سرا جھکا رہتا تھا اور رات دن میری آنکھیں اوراق کی سیاہی اور سفیدی پر جمی رہتی تھیں تا کہ میں عقل و دانش اور ذوق صحیح میں شہرت حاصل کرسکوں۔ کبھی کبھی میرے ہم عصر استاد میرے ہنر کی آزمائش کیا کرتے تھے اور میں اپنا کمال ان کے سامنے اپنی زبان قلم کی فصاحت سے دکھایا کرتا تھا چونکہ کسی ایسے مشہور استاد نے کبھی میری تربیت نہ کی تھی جو مجھے شاعری کے رموز اور دقائق بتا سکتا اور میرے قلم کو گمراہی کے راستوں پر پڑنے سے روک سکتا، یا اس خوبی کو نمایاں بنا سکتا جو میری برائیوں میں دبی پڑی تھی، اس لیے میں نے کچھ عرصے تک وہی کیا جو طوطے کو بولنا سکھانے کے لیے کیا جاتا ہے، یعنی میں نے اپنے سامنے خیال کے آئینے کو رکھا اور ان شکلوں کا عکس اس آئینے میں پڑتا رہا، میں نے اپنے دماغ کے آئینے کو صیقل کوشش سے جلا دی اور ان کے مختلف انواع شعروں کا مطالعہ کیا جو قوتِ تخیل سے پیدا ہو سکتے ہیں، اور بڑے بڑے اساتذہ کے کلام کو برابر دیکھتا رہا۔ ان کے کلام میں مجھے جہاں شیرینی نظر آئی میں نے لے لی، اور اس طرح آخر کار شاعری کا حقیقی ذوق مجھے حاصل ہوگیا۔ جب میں نے انوری اور سنائی کا کلام پڑھا تو میرا دل اور میری آنکھیں روشن ہوگئیں اور جہاں کہیں بھی مجھے کوئی نظم آبِ زر کی طرح چمکتی ہوئی دکھائی دی، میں نے اس کا جوئے رواں کی طرح پیچھا کیا، جو دیوان بھی مجھے مل سکا، میں نے نہ صرف اس کا مطالعہ کیا بلکہ اس کی نقل بھی اپنے کلام میں ضرور کی۔

دوسرا باب

بلبن کا عہد، عماد الملک کے زیر سایہ خسرو کی تربیت، کشلو خاں اور شہزادۂ بغرا خان سے ان کی وابستگی

شاعروشاعری کی یہ مشق ابھی کچھ زیادہ ترقی نہ کرنے پائی تھی کہ خسرو کے والد امیر سیف الدین محمود اس دنیا کو خیر آباد کہہ گئے۔اس وقت امیر خسرو کی عمر ان کے اپنے بیان کے مطابق صرف آٹھ سال کی تھی اور اگر چہ ''تحفۃ الصغر'' کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس کمسنی میں بھی کہ جب میرے دودھ کے دانت ٹوٹ رہے تھے، اشعار میرے منہ سے موتیوں کی طرح جھڑتے تھے''۔

یہ ظاہر ہے کہ ان کی شاعرانہ پرواز ایک ایسے نوخیز پرند کی اڑان سے زیادہ وقت نہ رکھتی تھی جس کے ابھی ٹھیک سے پَر بھی نہ نکلے ہوں۔لیکن یہ ضرور ہے کہ شاعری کے ذوق اور تحصیلِ علم کے شوق کی بنیاد ان کی طبیعت میں راسخ ہو چکی تھی اور یہ زیادہ تر ان کے والد کی پدری شفقت اور تربیت ہی کا نتیجہ تھا۔اپنے والد کے اس احسان کو خسرو نے بھی فراموش نہیں کیا، بلکہ اس زمانے میں بھی کہ جب ان کے کمال کا شہرہ دور دور ہو چکا تھا، ان کے دل میں اپنے والد کے لیے ایک گہرا جذبۂ تشکر اور امتنان کا موجود رہا، چنانچہ ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں کہتے ہیں کہ ''میری مٹی میں انہی کا بویا ہوا بیج ہے جو اب پھل پھول رہا ہے''۔

امیر سیف الدین محمود کے انتقال کی کیفیت ہمیں معلوم نہیں، لیکن غالباً وہ کسی لڑائی میں کام آئے، اس لیے خسرو لکھتے ہیں، شہادت کے تلخ گھونٹ کو پینے کے لیے انہوں نے اپنی جانِ شیریں دے دی اور اُس حیاتِ جاوداں کا جام نوش کیا جس کا وعدہ قرآن مجید کی آیت ''بل ھم احیاء عندربھم نہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے پاس موجود ہیں'' میں کہا گیا ہے۔

خسرو کی عمر اس وقت ایسی نہ تھی کہ وہ اس صدمے کی پوری اہمیت کو سمجھ سکتے، لیکن ایسے ناسمجھ بھی نہ تھے کہ انہیں اتنی کم عمری میں باپ کے سائے سے محروم ہو جانے کا رنج نہ ہوتا، اور پھر باپ بھی ایسا کہ جس کے متعلق انہوں نے لکھا ہے کہ ''ترک خواب ہی میں فرشتہ ہو سکتا ہے لیکن وہ عالم بیداری میں بھی فرشتہ تھے، عالمِ بالا سے کبھی کسی نے فرشتے کو آتے ہوئے نہ دیکھا ہوگا، مگر ان کی طبیعت میں فرشتہ خصلتی ایسی راسخ تھی کہ انہوں نے کبھی کسی سیہ چشم حور کے لیے بھی آنکھ سرخ نہ کی تھی، وہ دنیوی حقیقت سے امیر تھے اور دینی حیثیت سے صاحب ولایت۔[1]'' اس لیے جب ہم خسرو کا یہ شعر پڑھیں کہ:

سیف از سرم برفت و دلم بس دو نیم ماند
دریائے من روان شدودرم یتیم ماند

تو ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس میں گزشتہ زمانے کی ایک دھندلی سی یاد کو شاعرانہ تخیل سے تازہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ اس میں اس حقیقی رنج اور یاس کا جذبہ جھلکتا ہے جو ایک بچے کے معصوم دل میں اپنے مہربان باپ یا چاہنے والی ماں سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے پر پیدا ہوتا ہے اور جو اسے جوانی اور بڑھاپے کے لمحاتِ فرصت میں اکثر بے چین کر دیتا ہے۔

یہ خسرو کی خوش قسمتی تھی کہ والد کے انتقال کے بعد ان کے نانا عماد الملک ان کے سرپرست بنے، کیونکہ بقول خسرو وہ نانا نہ تھے بلکہ ایک دوست تھے، عماد الملک کا شمار سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد کے امرائمیں ہوتا ہے، لیکن دراصل وہ اس بادشاہ سے بہت پہلے یعنی التمش کے بعد جو فتنہ وفساد کا دور آیا اس میں امن وامان قائم رکھنے اور سلطنت کو تباہی سے بچانے کے مشکل کام میں ان کا بہت کچھ حصہ تھا۔ بلبن کے عہد میں یعنی اس زمانے میں جب انہوں نے خسرو کو اپنے دامنِ عاطفت میں لیا وہ عارض راوت یا رادت عرض کے عہدے پر فائز تھے، راوت گجراتی زبان میں سوار کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے عارض راوت کے فرائض یہ تھے کہ وہ شاہی سواروں کی دیکھ بھال اور نگرانی کریں اور اس کا خیال رکھیں کہ ہر ایک سوار کے پاس گھوڑا موجود رہے اور اچھی حالت میں ہوتا کہ لڑائی کے وقت کسی قسم کی دقت نہ ہو، لیکن واقعہ یہ ہے کہ عماد الملک کو اب بھی وہی اقتدار حاصل تھا جو اس زمانے میں تھا جب وہ عارض ممالک تھے۔ چنانچہ خسرو کہتے ہیں کہ وہ تخت

کے چار ارکان میں سے ایک تھے، اور اگرچہ کوئی نشان بادشاہت نہ رکھتے تھے، بادشاہوں کو تخت پر بٹھایا کرتے تھے۔ اپنی عام داد و دہش سے انہوں نے تمام ہندوستان کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا اور پس پردہ حکومت کے تمام فرائض انجام دیتے تھے۔ اگرچہ بظاہر اپنے عارض کے منصب پر قانع رہے تا کہ فتنہ پرداز حاسدوں کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے، عجیب راوت عرض تھے کہ ہندوستان کے معاملات کو سرانجام دینے میں اپنی صائب رائے جب چاہتے تھے کسی رائے کو الٹ کر یار بنا لیتے تھے۔" خسرو کا یہ آخری فقرہ پُر معنی ہے، کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو راجاؤں وغیرہ سے معاملات طے کرنے کا کام زیادہ تر عماد الملک کے سپرد رہتا تھا، اور وہ تھے بھی اس کام کے لیے موزوں اس لیے کہ خود ہندوستانی تھے ان کے ہندی نژاد ہونے کا سب سے بڑا ثبوت تو خسرو کے ان اشعار میں موجود ہے کہ:

ز نسل عارض اسود منم آن نخت معنی
کز اصل خویشتین یک یک نشانی بازدادم من
سوادی بود ان نازک ترین دیباچہ دولت
زنوک کلک تقدیر وبیان ان سوادم من
خسان را می کنم غرق و گہر را می دھم اجرہ
ازاں ابر سیہ بین طرفہ دریائی کہ زادم من

گویا عماد الملک نہ صرف ہندوستانی تھے بلکہ گورے رنگ کے بھی نہ تھے، دوسرا ثبوت یہ ہے کہ وہ تنبول یعنی پان کے بے حد شوقین تھے اور ظاہر ہے کہ پان کا شوق اس وقت تک باہر سے آئے ہوئے لوگوں میں زیادہ عام نہ ہوگا۔ ہر سال وہ اپنے محکمے یعنی دیوانِ عرض کے سب عہدہ داروں کی پُر تکلف ضیافت کیا کرتے تھے اور ان سب کو قیمتی خلعت دیا کرتے تھے۔ سال بھر اپنے ماتحتوں کو زیادہ تر اپنے ہی باورچی خانے سے کھانا مہیا کرتے تھے، دیوانِ عرض میں ہر کھانے کے وقت پر پچاس ساٹھ خوان طرح طرح کے لذیذ کھانوں اور شربتوں سے لدے ہوئے، مہمانوں کی خاطر کے لیے آتے تھے۔ بقول خسرو ان کے دستر خوان کا کونا دامانِ قیامت تک دراز تھا، چونکہ عماد الملک تنبول کے خاص طور پر شوقین تھے، اس لیے ان کے یہاں پان ہمیشہ بہت عمدہ قسم کے اور

بہت افراط سے رہتے تھے۔غریبوں کو پان تقسیم کیا کرتے تھے اور اپنی مجلس میں جلدی جلدی پان منگواتے رہتے تھے اور جب بھی خود کھاتے تھے تو ایک ایک پان حاضرین میں سے بھی ہر ایک کو دیتے تھے۔اس کے علاوہ ہر سال اتنے کلاہ اور چغے غریبوں کو بانٹتے تھے کہ بقول خسرو دنیا میں کوئی محتاج ننگا نہ رہتا تھا۔سواروں پر خاص مہربانی کیا کرتے تھے۔سالانہ معائنے کے وقت جس سوار کا گھوڑا ساز و سامان سے اچھی طرح لیس نظر آتا تھا،اس کا وظیفہ بڑھا دیا کرتے تھے اور کچھ نہ کچھ انعام بھی دیتے تھے۔اگر کسی حادثے کی وجہ سے کسی سوار کا گھوڑا مر جاتا تھا تو اس کو نیا گھوڑا خریدنے کے لیے اکثر اپنے پاس سے روپیہ دے دیا کرتے تھے یا دوسرا گھوڑا اپنے خاص اصطبل سے دے دیتے تھے۔اگر کوئی گھوڑا دبلا یا بیمار نظر آتا تھا اور اس کا اطمینان ہو جاتا تھا کہ اس گھوڑے کے مالک کے پاس اسے کھلانے پلانے کے لیے دام نہیں ہیں تو یا تو اس کا گھوڑا خود بدل دیتے تھے اور یا اتنا روپیہ اسے دے دیتے تھے کہ وہ گھوڑے کو اچھی طرح رکھ سکے۔

غرض یہی عماد الملک تھے جو اب خسرو کے سرپرست اور نگراں بنے،اور ظاہر ہے کہ جب غیروں سے ان کا یہ سلوک تھا تو خسرو پر ان کی کیا کیا مہربانیاں نہ رہی ہوں گی،اور کون سی نعمت ہوگی جو ان کے لیے مہیا نہ کی ہوگی۔یہ زیادہ تر عماد الملک کی توجہ ہی کا نتیجہ تھا کہ خسرو کی تعلیم اور تربیت،جو ان کے والد کے بے وقت انتقال سے ممکن تھا کہ ناقص اور ادھوری رہ جاتی،برابر جاری رہی اور خسرو نے جوانی کی سرزمین میں قدم رکھنے تک ان تمام علوم اور فنون میں جو ان کے زمانے میں رائج تھے اتنی دسترس حاصل کر لی کہ احباب واقربا میں انہیں کبھی اپنی جہالت کی وجہ سے شرمندگی کا موقع پیش نہ آیا،خسرو کی علمی استعداد کا صحیح اندازہ یا تو ان کے کلام سے کیا جا سکتا تھا اور یا ان کے اپنے بیانات سے،ان میں،جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں وہاں ایک صاف گوئی کی صفت بھی تھی اور خصوصاً تعریف وتوصیف میں سوائے چند ایک موقعوں کے جہاں شاعرانہ زعم میں وہ کچھ کہہ گئے ہیں،انہوں نے کبھی مبالغے سے کام نہیں لیا اور نہ اپنی کسی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی،ان کے فارسی اور ہندی زبانوں میں کامل ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں ہو سکتا،اس لیے کہ اگر فارسی ان کے آباواجداد کی زبان تھی تو ہندی انہیں اپنی والدہ سے ورثے میں ملی تھی۔ان دو زبانوں کے علاوہ اور زبانیں بھی ضرور جانتے تھے،چنانچہ ''نہ سپہر'' میں کہتے ہیں:

من بزبانہای کسان بیشتری
کردہ ام از طبع شناساگزری
دانم و دریافتہ و گفتہ ہم
جستہ و روشن شدہ زان بیش و کم

ان زبانوں میں، ظاہر ہے، ترکی ضرور شامل ہوگی اس لیے کہ وہ ترک تھے اور بلخ اور بخارا وغیرہ کے باشندے جہاں سے ہزارہا لاچین کے لوگ ہندوستان میں آئے، فارسی اور ترکی دونوں زبانوں ہی سے واقف تھے۔ عربی کا تھوڑا بہت علم پرانے زمانے میں ہر پڑھے لکھے آدمی کے لیے ضروری تھا اور خسرو کے کلام میں بعض غزلیں عربی کی موجود ہیں۔ ''اعجاز خسروی'' میں ایک خط عربی زبان میں مولانا شہاب الدین کو مخاطب کر کے لکھا ہے اور ''خزائین الفتوح'' میں متعدد مفردابیات عربی کے موجود ہیں۔ اس لیے یہ بات یقینی ہے کہ خسرو عربی سے خاصی واقفیت رکھتے تھے، لیکن یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہ ہوگا کہ وہ عربی دانی میں علمائے عرب کے ہمسر تھے یا یہ کہ عربی میں انہیں پوری مہارت حاصل تھی[2] برخلاف اس کے وہ خود چالیس سال کی عمر میں لکھتے ہیں کہ اگر انہیں فرصت ملتی تو وہ عربی میں اتنی ہی استعداد پیدا کر لیتے جتنی فارسی میں، لیکن ایسے خواب دیکھنے کا تب کوئی موقع نہ رہا تھا۔ اسی طرح ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں اپنے عربی کلام کو وہ پارسیانہ مبتدیانہ بتاتے ہیں اور ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ:

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری نہ دارم کز عرب گویم سخن

کہا جا سکتا ہے کہ امیر خسرو نے یہ جو کچھ کہا ہے از رُوئے انکسار ہے، لیکن ایسا لکھنے سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اپنی عربی دانی کا نہ تو کوئی زعم تھا اور نہ وہ اسے کوئی خاص اہمیت دیتے تھے، بلکہ جو کچھ تھوڑا بہت انہوں نے عربی میں لکھا وہ محض تفننِ طبع کا نتیجہ تھا، یا ممکن ہے کہ حاسدوں کا منہ بند کرنے کے لیے لکھا ہو۔ جو اُن کی عربی سے ناواقفیت کو ان کی تنقیص اور مذمت کا بہانہ بناتے ہوں، بہر حال میرا یہ خیال ہے کہ خسرو عربی جانتے تو ضرور تھے لیکن انہوں نے اس زبان

میں کمال پیدا کرنے کی کوئی خاص کوشش نہ کی۔

ایک اور زبان جس سے بظاہر خسرو تھوڑے بہت واقف تھے، سنسکرت تھی، کیونکہ اس زبان کا انہوں نے "نہ سپہر" میں خاص طور پر ذکر کیا ہے اور اس کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ زبان رتبے میں عربی سے تو کم ہے لیکن دری (فارسی) سے بڑھ کر ہے۔

ویست زبانی بصفت دِر دری
کمتر از عربی و بہتر از دری

سنسکرت کے علاوہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کی زبانوں سے بھی جن میں سے بعض کا ذکر انہوں نے "نہ سپہر" میں کیا ہے، بالکل ممکن ہے کسی حد تک وہ واقف ہوں، لیکن اس کے متعلق کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔

جس طرح خسرو نے کبھی عربی زبان میں کمال حاصل کرنے کی کوئی سعی نہیں کی، اسی طرح وہ کبھی علم وعروض کے دائروں کے چکر میں بھی نہیں پڑے اور نہ اپنے دماغ کو اوزان، قوافی اور زحافات کے گورکھ دھندے کو سلجھانے میں کبھی انہوں نے پریشان کیا۔ وہ شاعر تھے اور فطرتی طرز پر موزوں طبیعت رکھتے تھے۔ شعر کے اوزان پر ان کو بغیر کچھ ان کے متعلق مطالعے کے اتنی قدرت حاصل تھی کہ مشکل سے مشکل بحر میں شعر کہتے تھے، اور مثنوی "نہ سپہر" کے ایک سپہر میں ایسی بحر کو کام میں لائے ہیں جو کم از کم مثنوی میں ان سے پہلے کسی شاعر نے استعمال نہ کی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اس علم سے ناواقفیت پر بعض لوگوں نے انہیں موردِ طعن وطنز بھی بنایا، اس لیے کہ ایک جگہ کہتے ہیں۔ [3]

اے نہ می گوئی مرا خسرو نہ می دانی عروض
من چہ محتاج عروضم تا کنم گفت و شنو
نظم سنجیدہ ہمی گویم بموزونی طبع
نکتہ سنجیدہ باشد وقت سنجیدن گرد
من ترازو دارم و تو در ترازو می نہی
کیست زین ہر دو فراہم خود دریں سنجیدہ شو

لیکن نجوم میں انہیں جو دسترس حاصل تھی وہ ان کے کلام سے بخوبی ظاہر ہے۔ مختلف بُرجوں میں مختلف ستاروں اور سیاروں کی جائے وقوع کا مبارک یا منحوس اثر، قرآن، تثلیث تسدیس وغیرہ، رمل کی رُو سے بارہ خانوں کے خواص، غرض یہ کہ نجوم کے متعلق انہیں تمام اہم جزئیات سے واقفیت تھی اور ان چیزوں کو ایک شاعرانہ انداز میں بیان کرنا بھی خوب جانتے تھے۔ مثنوی ''نہ سپہر'' میں انہوں نے سلطان محمد یعنی سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے بیٹے کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے جو زائچہ اور فالنامہ لکھا ہے، وہ ان کے اس کمال کی بہترین مثال ہے۔ ہندوؤں کے بعض قدیم علوم مثلاً سحر اور طلسمات کی طرف بھی انہوں نے توجہ کی تھی اور غالباً اور زیادہ توجہ کرتے اگر انہیں یہ خیال مانع نہ ہوتا کہ اس قسم کے علوم شرع اسلامی کے خلاف ہیں۔ ممکن ہے کہ حضرت نظام الدین اولیا سے جو تعلق انہیں آخر عمر میں حاصل ہوا اس سے انہیں احکام مذہبی کی پابندی کا زیادہ خیال پیدا ہو گیا ہو اور انہوں نے اس قسم کی چیزوں کا خیال بالکل ترک کر دیا ہو۔ اپنی اس توجہ کا ذکر ''نہ سپہر'' میں یوں کرتے ہیں:

من قدری بر سر این کار شدم

علم موسیقی میں ان کی مہارت مسلمہ ہے۔ بلکہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے اس فن میں نایک کا رتبہ حاصل کر لیا تھا، لیکن چونکہ ہندوستانی موسیقی میں خسرو کے تصرفات کافی اہمیت رکھتے ہیں، اس لیے ان کی علمی استعداد کے اس پہلو پر میں ایک مستقل باب میں بحث کروں گا۔ یہاں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ شاعری کی طرح موسیقی کا بھی خسرو کو بچپن ہی سے شوق رہا اور انہیں ہندوستانی اور ایرانی دونوں اصولوں سے واقفیت تھی۔

تاریخ کے علم میں بھی خسرو کو بہت کچھ ادراک تھا اور ہندوستان میں اسلامی حکومت کے قیام سے لے کر اپنے زمانے تک کے واقعات پر خصوصاً انہیں پورا عبور حاصل تھا۔ ان واقعات کو جس صحت اور خوبی کے ساتھ انہوں نے اپنے قصائد اور مثنویوں میں نظم کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی، اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان کے زمانے کی تقریباً مکمل تاریخ انہی کی تصانیف سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ جس صحت اور دیانتداری کے ساتھ انہوں نے ہر واقعے کو لکھا ہے وہ ان کے کسی ہم عصر کی تصنیف میں نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ وہ شاعر تھے، مورخ نہ تھے،

اور شاعر کے لیے مبالغہ یا حقیقت سے بے پرواہی ایک معمولی بات ہے۔ مثنوی ''دول رانی خضر خاں'' میں التمش کے جانشینوں کا چند اشعار میں ذکر کیا ہے، اگر چہ بیان مختصر ہے لیکن شاعرانہ انداز کو قائم رکھتے ہوئے ہر ایک بادشاہ کے کردار اور کارناموں کو اس خوب صورتی سے لکھ گئے ہیں کہ اس زمانے کی تاریخ کا ایک بہت بیش قیمت مرقع تیار ہو گیا ہے۔ ذرا ان اشعار کو غور سے پڑھیے اور پھر ان لطیف اشعاروں کی، جو، ان میں کیے گئے ہیں، شرح اور تفصیل، تاریخ برنی، ''طبقات ناصری'' وغیرہ میں ملاحظہ کیجیے، تو آپ کو خسرو کی ناقدانہ بصیرت کا اندازہ ہو سکے گا۔

چو رفت ان شمس روشن در سیاہی
برآمد اختر فیروز شاہی
بہ بخشش خلق عالم را رہی کرد
ہمہ گنجینۂ رشمی تہی کرد
چو ششماہی دراں دولت بسر برد
چو طفل ہشت ماہ دولتش مرد
ازاں پس چوں پسر کم بود شاہاں
بہ دختر گشت رای نیک رایاں
رمیدہ دخترے مرضیہ سیرت
سریر آر است از جای سریرت
مہی چند آفتا بش بود در میغ
چو تیغ اندر نیام از کار می ماند
فراوان فتنہ بے آزار می ماند
برید از صدمہ شاہی نقابش
ز پردہ روے نبود آفتابش
چناں می راند زور مادہ شیران
کہ حامل می شدند از دے دلیران

سہ سالی کش قمری بد پنجہ و مشت
کسی بر حرف او ننہاد انگشت
چہارم چوں زکار او ورق گشت
برو ہم خامسۂ تقدیر بگوشت
دواں شدزاں بس از حکم الٰہی
نگیں سکۂ بہرام شاہی
سہ سال اونیز اندرعشرت و جام
نشاطی راند چوں پیشینہ بہرام
برو ہم کرد بہرام فلک زور
شد آن بہرام میر اندر دل گور
از راں پس بر فراز تخت مقصود
سعادت داد ہفت اختر بہ مسعود
دو سہ سالے دگر از بخت و دولت
علای داشت از وی مسند و تخت
چوں آں گلہای کم عمراز چمن جست
جواں سروی بالین گاہ بنشست
بسال بیست زاوج پایہ خویش
جہاں می داشت اندر سایہ خویش
عجب عہد، ہمہ دو کامرانی
بہر خانہ نشاط و کامرانی
نہ کس وادی کمند کینہ را تاب
نہ کس دیدی خیال فتنہ در خواب
خود او مستغرق کار الٰہی
بامرش بندگان درکار شاہی

غرض یہ کہ شاید ہی کوئی ایسا علم یا فن ہو جس کا جاننا اس زمانے میں ایک عالم اور ادیب کے لیے ضروری تھا، جس کی طرف خسرو نے اپنی توجہ منعطف نہ کی ہو، اور جس سے وہ کسی حد تک بہرہ یاب نہ ہوئے ہوں، اور انہی سب علوم وفنون سے آراستہ ہو کر میدانِ شعر میں اپنی طبیعت کی جوانی دکھانا شروع کی۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آغاز جوانی ہی میں وہ ان سب علوم پر حاوی ہو گئے ہوں بلکہ زیادہ امکان اس کا ہے کہ عمر کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا افق علم و معرفت وسیع ہوا، اور زمانے کے سرد وگرم نے ان کی قابلیت میں رفتہ رفتہ وہ پختگی پیدا کر دی جو آج ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے نانا عماد الملک کی زندگی ہی میں خسرو نے خاصی شہرت حاصل کر لی تھی، اور وہ زمانہ تھا بھی ایسا کہ ایک قابل اور ہونہار شاعر کے لیے شہرت اور ترقی کے لیے بیسیوں راستے کھلے ہوئے تھے۔

التمش کی وفات کے بعد 634ھ سے 664ھ تک تیس سال کے زمانے میں، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، پانچ حکمران دہلی کے تخت پر بیٹھے۔ جن میں سے صرف آخری یعنی ناصر الدین نے خاصے عرصے یعنی کوئی بیس سال تک حکومت کی۔ اسی بادشاہ کے زمانے میں خسرو پیدا ہوئے تھے، لیکن جب انہوں نے اقلیم شاعری میں نام پیدا کرنا شروع کیا تو اس وقت بادشاہ کا دور بھی گزر چکا تھا اور اب سلطان التمش کا ایک غلام غیاث الدین بلبن بادشاہ تھا۔ غیاث الدین البری یا الپ اری ترکوں کے ایک اچھے خاندان سے تھا، اور شمس الدین التمش کی ملازمت میں آتے ہی اس نے ایسے کارہائے نمایاں دکھائے کہ اسے اس سلطان کے چالیس خاص غلاموں اور جانثاروں کے زمرے میں جگہ مل گئی۔ اس کے بعد رضیہ سلطانہ نے اسے اپنا میر شکار مقرر کیا اور ناصر الدین کے عہد میں اسے سرحدی علاقوں میں انتظام اور خاص طور پر مغلوں کی روک تھام کے لیے متعین کر دیا گیا، اور یہ زیادہ تر اسی کی مسلسل اور لگاتار کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف تو ہندوستان مغلوں کی یورش سے بچا رہا اور دوسری طرف ملک بھر میں ایسا امن وامان اور خوشحالی رونما ہو گئی جو ایک عرصے سے نہ دکھائی دی تھی۔ اپنی اس کارگزاری اور جانفشانی کا اسے یہ صلہ ملا کہ ناصر الدین کے انتقال پر وہ اپنے آقاؤں کی سلطنت کا مالک بن گیا۔ بلبن سخت گیر بادشاہ تھا اور امور سلطنت میں کسی قسم کی غفلت یا کوتاہی کو معاف نہیں کرتا تھا۔ لہو ولعب کا دشمن تھا اور اگرچہ بادشاہ بننے سے

پہلے شراب کا عادی تھا، اس نے تخت حکومت پر قدم رکھتے ہی اس عادت کو بالکل ترک کر دیا، بلکہ اپنے بیٹوں اور امیروں کی بھی سختی سے نگرانی رکھتا تھا کہ وہ شراب خوری وغیرہ کی بری عادتوں میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے دربار میں کوئی بات آداب شاہی کے خلاف کرے یا کسی مسخرے اور بھانڈ کی وہاں تک رسائی ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انتہا کا منصف مزاج، رعایا کا بہی خواہ اور قابلیت اور ہنر کا قدردان تھا۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدے چُن چُن کر ایسے آدمیوں کو دیتا تھا جو نہ صرف خاندانی اعتبار سے بلند مرتبہ ہوں بلکہ ذاتی خوبیوں سے بھی متصف ہوں۔ بڑھاپے کے زمانے میں تخت پر بیٹھنا لیکن تزک و احتشام کا بہت دلدادہ تھا۔ مضبوط اور قوی ہیکل سیسانی پہلوانوں کا ایک دستہ بنایا تھا جو سواری میں کے گرد و پیش ننگی تلواریں کاندھوں پر رکھ کر چلا کرتے تھے اور دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک خاص ہیبت اور خوف طاری ہو جاتا تھا۔ اسی طرح دربار میں بڑے اہتمام سے تخت کے تین طرف چاووش نقیب، حاجب، ناظر، سرجاندار وغیرہ ہاتھوں میں نیزے اور دورباش لیے ہوئے متعین رہتے تھے۔ آراستہ پیراستہ گھوڑے اور سونے چاندی کی جھولوں اور عماریوں سے مزّین ہاتھیوں کی صفیں دربار کی رونق اور دبدبے کو بڑھا دیتی تھیں اور حاضرین رعب اور دہشت سے کانپنے لگتے تھے، بلکہ بعض تو بے ہوش ہو کر گر جاتے تھے۔ علم اور ہنر کی سرپرستی اور قدردانی دریا دلی سے کرتا تھا اور اسی لیے دہلی کا شہر اس کے زمانے میں دور دور کے علماء کا ملجا و ماویٰ بن گیا تھا۔ بادشاہ اور اس کے امیروں کی داد و دہش کی شہرت سن کر لوگ دارالسلطنت کی طرف کشاں کشاں چلے آتے تھے، جو آتا تھا وہ محروم نہ جاتا تھا۔

اس زمانے کے امراء کی حالت برنی یوں بیان کرتا ہے کہ شمسی ناصری اور بلبنی میں آپس میں جاگیروں، مال و دولت کی فراوانی یا بڑے بڑے عہدوں کی وجہ سے کوئی رقابت یا مخاصمت نہ تھی، بلکہ جو بھی باہمی رشک اور رقابت تھی وہ سخاوت اور دریا دلی کے کاموں میں تھی۔ چنانچہ اگر کوئی ملک یا خان سن لیتا تھا کہ کسی اور ملک یا خان کے دسترخوان پر پانچ سو آدمیوں کو مدعو کیا گیا ہے تو وہ اپنے دسترخوان پر ایک ہزار آدمیوں کو کھانا کھلاتا تھا، یا اگر کسی کو معلوم ہوتا تھا کہ فلاں ملک نے دو سو تنکے خیرات کیے ہیں تو وہ رشک کرتا تھا اور چار سو تنکے خیرات کر دیتا تھا اور اگر کسی امیر نے اپنی محفلِ شراب میں پچاس آدمیوں کو گھوڑے اور سو آدمیوں کو خلعت عطاء کیے تو جب تک دوسرا اپنی محفل

میں سو گھوڑے اور دو سو خلعت تقسیم نہ کر لیتا تھا اسے چین نہ آتا تھا۔ اسی فیاضی اور فضول خرچی کی وجہ سے اس عہد کے خان، ملک اور امیر اکثر مقروض رہا کرتے تھے۔ [4]

ان امیروں میں چند ایک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خصوصاً اس لیے کہ خسرو کو اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں ان سے زیادہ تر سابقہ پڑا۔ اور ان کی سرپرستی ان کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئی۔

خسرو کے نانا عماد الملک عارض راوت کا تو ذکر اوپر آ چکا ہے، ان کے علاوہ سب سے زیادہ بارسوخ اور نامور ملک سلطان بلبن کا بھتیجا علاؤ الدین کشلو خاں تھا، جو باربک کے عہدے پر فائز اور اولغ قتلغ مبارک کے خطابوں سے سرفراز تھا۔ یہ ملک عام طور پر ملک چھجو کے لقب سے مشہور تھا اور بقول برنی سخاوت میں حاتم طائی سے بھی بازی لے گیا تھا۔ شکار اور چوگان بازی میں سرکردہ روزگار تھا۔ بلکہ کہا جاتا تھا کہ ان چیزوں میں اس کی شہرت ہندوستان سے خراساں تک پہنچ گئی تھی اور اس کی تعریفیں سن کر چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو نے اسے اپنے ملک میں بلا لینے کی بہت کوشش کی، اور عراق کا آدھا ملک دے دینے کا لالچ بھی دیا لیکن وہ نہ گیا۔ خود بلبن کو بھی اس کے رسوخ اور ہر دل عزیزی کی وجہ سے اس کی جانب سے کھٹکا لگا رہا کرتا تھا۔

ایک اور قابل ذکر امیر ملک الامراء فخر الدین کوتوال دہلی تھے جو اپنے نیک کاموں اور خدا ترسی کے لیے مشہور تھے۔ کہتے ہیں کہ ان کے گھر پر شب و روز بارہ ہزار آدمی قرآن خوانی کے لیے مامور تھے۔ ہر روز بلا ناغہ وہ اپنا پورا لباس تبدیل کرتے اور جو کپڑے اتارتے تھے وہ محتاجوں میں بانٹ دیتے تھے، بلکہ ہر روز ان کا پلنگ اور بستر بھی بدلا جاتا تھا، اور ہر سال وہ ایک ہزار غریب لڑکیوں کے جہیز تیار کرا کے دیا کرتے تھے۔

اسی طرح بلبن کا چچا زاد بھائی امیر علی سرجاندار بھی، جو دوسخا میں شہرۂ آفاق تھا، جس کسی کو صلہ یا انعام دیتا تھا تو کبھی کئی ہزار سے کم کی رقم نہ دیتا تھا۔ پہلے شراب کا بہت دلدادہ تھا اور یہ بات بلبن کو ناگوار گزرتی تھی۔ چنانچہ ایک دن اس سے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ شراب پی کر تم بہت سخاوت پر اتر آتے ہو۔ شراب کے نشے میں دے دینا کیا بڑی بات ہے، یوں ہی دو تو ہم بھی جانیں کہ ہاں تم سخی ہو۔ بادشاہ کی اس بات کا امیر علی پر ایسا اثر ہوا کہ اس دن سے شراب سے توبہ کر لی اور پہلے سے بڑھ چڑھ کر سخاوت کی داد دینے لگا۔

خسرو کو جب کسی مربی اور سرپرست کی ضرورت محسوس ہوئی تو ان کی نظرِ انتخاب پہلے علاء الدین کشلو خاں ہی پر پڑی۔ اگرچہ اس وقت تک خسرو، بادشاہ یعنی بلبن کی تعریف میں کئی قصیدے کہہ چکے تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دربار میں ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ ممکن ہے کہ بلبن جیسا سخت گیر اور سنجیدہ مزاج شخص شعر و شاعری کے مذاق سے بھی محروم ہو، یا یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی یہ نوعمر شاعر ایسی مسلمہ حیثیت نہ رکھتے ہوں کہ دربار کے شعراء میں انہیں جگہ مل جاتی۔ اسی طرح کشلو خاں کے علاوہ وہ بعض اور امیروں مثلاً شمس الدین دبیر، امیر علی سرجاندار، اختیار الدولہ، حسام الدین وغیرہ کی بھی مدح خوانی کر چکے تھے، لیکن ان میں سے کسی سے باقاعدہ اپنے آپ کو متعلق نہ کیا تھا۔ خسرو کی عمر اس وقت کوئی بیس سال کی تھی لیکن ابھی سے انہوں نے خاصا نام پیدا کر لیا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب امیر اور ملک اس کے خواہاں تھے کہ خسرو کو اپنی ملازمت میں لے لیں۔ ان کا پہلا دیوان تحفۃ الصغر اس وقت مرتب ہو چکا تھا اور ان کی ابتدائی کامیابیوں نے ان میں ایک خاص جذبہ، فخر اور خودستائی کا پیدا کر دیا تھا جو ایک نوجوان شاعر کے لیے یقیناً قابلِ معافی ہے اور جوان کے زیادہ پختہ عمر کے کلام میں کم تر پایا جاتا ہے، چنانچہ اسی زمانے کے لکھے ہوئے قصیدوں میں ایک جگہ کہتے ہیں:

تا بفروشعر من دریاب شد اقلیم بند
یا باشعار ظہیر اقصای ملک فاریاب

ایک اور قصیدے میں یہ شعر ہے کہ:

تا کشد گردون بچشم انوری
خاک من کحل سپاہانی شدہ است

ان ہی کامیابیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ: ”میرے جوان خیال کے نتائج کو جاننے والے لوگ بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور میرے اشعار ایک سے دوسرے شخص تک پہنچتے تھے، گویے ان اشعار کو سازندوں کے ساتھ گاتے تھے اور انہیں سن کر پست خم بوڑھوں پر بھی ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔“

لیکن جب ہمارے نوجوان شاعر کا پیمانہ خوشی اور فخر سے اس طرح لبریز ہو رہا تھا تو انہیں اپنی زندگی کے دوسرے بڑے صدمے سے واسطہ پڑا، یعنی سنہ 671ھ میں ان کے نانا عماد الملک ایک سو تیرہ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ اپنی طویل عمر کے ستر سال انہوں نے بادشاہ اور ملک کی خدمت میں گزارے تھے اور اپنے کام کو بے مثل قابلیت اور دیانتداری سے انجام دیتے رہے تھے، ان مہربان نانا کے انتقال نے خسرو کے دل میں اپنے شفیق باپ کے انتقال کا رنج تازہ کر دیا اور اُسی احساسِ تنہائی، اُسی شعورِ بیکسی نے انہیں دوبارہ آگھیرا۔ عماد الملک کے انتقال پر انہوں نے ایک بہت ہی پُر درد اور موثر مرثیہ لکھا جو دیوان "تحفۃ الصغر" میں موجود ہے۔ اس مرثیے میں ایک جگہ کہتے ہیں "وہ چراغ گل ہو گیا، شمع فلک بجھ گئی، افسوس! دونوں جہانوں کی بنیاد تباہ ہو گئی، عارض حضور بادشاہ میں کیوں نہیں جاتا؟ وہ وزیر اعظم کہاں چھپا ہوا ہے اور دیوان میں کیوں نہیں آتا؟ اے آصف بادشاہ خود تیرے لیے رو رہا ہے اور اے عارض دیوان بھی تیرا ماتم کر رہا ہے، قبہ آسمان کا ستون منہدم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصر شاہی کے بام و در تک سوگوار نظر آتے ہیں۔ ترکوں نے اپنے کلاہ اتار پھینکے ہیں اور اپنے چغے دامنوں تک چاک کر دیئے ہیں اور ہندو راجہ برہموں کی طرح سر ننگے کیے ہوئے پریشان اور غمزدہ، آنسو بہا رہے ہیں۔"

اسی افسوس ناک واقعے کی وجہ سے خسرو کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ ملک چھجو کی ملازمت اختیار کریں۔ اس ملک کی سخاوت عام تھی لیکن شاعروں پر خاص طور پر مہربان تھا، چنانچہ ایک مرتبہ ایک شاعر شمس معین کا قصیدہ سن کر ایسا خوش ہوا کہ اپنے اصطبل کے سب گھوڑے اسے بطور انعام دے دیئے اور جن قوالوں نے اس کے سامنے وہ قصیدہ گا کر سنایا تھا ان میں سے ہر ایک کو دس دس ہزار تنکے عطا کیے۔ خسرو جیسے شاعر کی وہ جتنی قدر بھی کرتا کم تھی اور ظاہر ہے کہ خسرو کو بھی اس کی مدح میں جو لطف آتا ہو گا وہ کسی اور کی تعریف کرنے میں نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ اپنی اس پہلی ملازمت میں خسرو کے فرائض منصبی اس سے زیادہ نہ تھے کہ وہ اس ملک کے دربار میں رہیں اور اس کی محفلوں کی زینت کو بڑھائیں۔ چنانچہ خسرو کے اپنے الفاظ یہ ہیں کہ دو سال تک میں نے اس کی مجلس میں ایسے ایسے قصیدے اس کی تعریف میں پڑھے کہ جیسے اور کسی کی مدح میں نہیں کہہ سکتا تھا، میں اس سرو کے باغ میں برابر موجود رہتا تھا اور اس کے دربار کو بادِ صبا کے ان جھونکوں سے جو

میری سوسن زبان سے نکلتے تھے تروتازہ کرتا رہتا تھا۔'' یہ دوسال خسرو نے غالباً بہت آرام میں گزارے، کشلو خاں کی محفل کی چہل پہل، ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹ، قوالوں اور گویوں کے سرورانگیز نغمے، عود وعنبر کی خوشبوئیں، شراب ارغوانی کے دور، غرض عیش وعشرت کے کوئی ایسے لوازمات نہ تھے کہ جو اس محفل میں نہ ہوں۔ بلبن ان چیزوں کا بہت مخالف تھا لیکن بھلا اس کے ملک اور خان ان بندشوں کی کیا پروا کر سکتے تھے جو بادشاہ ان پر عائد کرنا چاہتا تھا، چوری چھپے ہی سہی، مگر ہوتا سب کچھ تھا، البتہ اس کی احتیاط رکھی جاتی تھی کہ بادشاہ کو خبر نہ ہونے پائے۔

بلبن نے اپنے امراء پر جو قیود عاید کی تھیں وہ اپنے بیٹوں اور خاندان کے لوگوں کے لیے اور بھی سخت کردی تھیں اور ان کی ہر نقل وحرکت پر بادشاہ کی نظر رہتی تھی۔ لیکن کبھی کبھی یہ لوگ بھی موقع پاکر کسی خان یا ملک کی محفل میں پہنچ جاتے تھے اور چند گھنٹے ان خوش گوار صحبتوں کا لطف اٹھا لیتے تھے۔ چنانچہ جب خسرو کو ملک چھجو کی ملازمت میں دو سال ہوگئے تو ایک رات بلبن کا چھوٹا بیٹا بغرا خاں، جو بعد میں کیقباد کے نام سے بادشاہ ہوا، اس ملک کی محفل میں اپنے چند ہمراہیوں اور مصاحبوں کے ساتھ شریک ہوا، اس صحبت کا بیان خسرو یوں کرتے ہیں:

''شہزادے کے ساتھ اس کے چند خاص مصاحب بھی تھے، جن میں شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی شامل تھے، ان دونوں عالموں کا اجتماع گویا قرآن السعدین تھا یا چاند اور سورج کا یکجا جمع ہو جانا اور میں جو کہ عطارد ہوں، اس پر نازاں تھا کہ مجھے بھی اس صحبت میں بار ملا، ایک طرف تو یہ دونوں اقلیم سخن میں اپنا سکہ جمانے کی کوشش میں تھے اور دوسری طرف میں شاعری کے نقارے کو ایسی بلند آواز سے بجا رہا تھا کہ وہ مجھے نیچا نہ دکھا سکتے تھے، ان دو طرفہ گرجوں کو دونوں شہزادوں اور ان کے مصاحبوں نے خوب غور سے سنا، اور جب شعراء اپنا کلام سنا رہے تھے تو ان کی بخشش کے بادل نے ایسا مینہ برسایا کہ تمام رُوئے زمین کو سیراب کردیا۔ سونے کی عجب بارش تھی کہ دیناروں کو دیکھتے دیکھتے لوگوں کی آنکھیں برقانی ہوگئی تھیں، اور سونے کے بوجھ سے ان کے دامن یوں پھٹے پڑتے تھے جیسے گلاب کی سینکڑوں پتیاں الگ الگ ہو کر بکھر جائیں۔ میرے شیریں اشعار شہزادہ بغرا خاں کو ایسے پسند آئے کہ اس نے اس دریادلی کے مطابق جو بادشاہوں اور شہزادوں کا خاصہ ہے، میرے لیے ایک خوان سفید جعفراتی (چاندی کے) ٹنکوں کا بھرا ہوا منگوا کر بطور انعام عطا کیا اور اس طرح مجھے اپنا بندۂ بے دام بنالیا۔ مگر کشلو خاں میں حسد ورشک

بہت تھا، اور اس کے چہرے پر فوراً ناراضگی کے آثار ظاہر ہو گئے۔ میں نے یہ دیکھ کر اسے ہر طرح سے منانے کی کوشش کی مگر وہ میرا کوئی عذر نہ سنتا تھا۔ اس واقعے کو کئی دن گزر گئے لیکن گزشتہ باتوں کی یاد اس کے دل سے محو نہ ہوئی، وہ مجھے سزا دینا چاہتا تھا اور اپنے غصے کے تیر کا نشانہ بنانے کا ارادہ رکھتا تھا، اس لیے میں بھی تیر کی طرح بھاگ نکلا۔

خسرو کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ کشلو خاں کو جو بات ناگوار گزری وہ یہ تھی کہ جب خسرو اس کی ملازمت میں تھے تو انہوں نے کسی اور سے، خواہ وہ بادشاہ کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، کوئی صلہ یا عطیہ لینا کیوں منظور کیا، بغرا خاں اس کی محفل میں بطور مہمان آیا تھا اور مہمان سے ایک ایسے شخص میزبان کی موجودگی میں کچھ لینا اسے پسند نہیں آیا، علاوہ ازیں اسے یہ بھی خیال گزرا ہوگا کہ خسرو نے شہزادے کی موجودگی میں خاص طور پر اپنا ہنر اور کمال دکھانے کی کوشش، اس لیے کہ شہزادے کی توجہ اپنی طرف مبذول کریں اور اس کی سرپرستی سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔ کشلو خاں کی یہ خفگی بجا تھی یا بے جا، اس بحث میں ہمیں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن اس خفگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ خسرو نے عماد الملک کے انتقال کے بعد جو جائے پناہ تلاش کی تھی، اسے بھی انہیں خیر باد کہنا پڑا اور اب انہیں کسی نئے سرپرست کی جستجو ہوئی۔ اس پریشانی کی حالت میں قدرتی طور پر ان کا خیال بغرا خاں ہی کی طرف گیا کیونکہ اسی کی وجہ سے یہ سب بنا بنایا کھیل بگڑا تھا۔ چنانچہ انہوں نے سامانے کا رخ کیا جو اس زمانے میں ایک بہت اہم فوجی مقام تھا اور جسے مغلوں کے حملے کی روک تھام کے لیے خاص طور پر زیادہ مستحکم بنا دیا گیا تھا۔ ملتان کے بعد شاید یہی شہر سرحدی چھاؤنیوں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور سامانے کا صوبہ ہمیشہ کسی قابل اور معتبر حاکم ہی کے سپرد کیا جاتا تھا۔ اسی لیے بلبن نے ملتان میں تو اپنے بڑے بیٹے سلطان محمد کو متعین کیا تھا اور سامانے کی حکومت اپنے چھوٹے بیٹے بغرا خاں کو سونپی تھی۔ غرض خسرو جب سامانے پہنچے تو بغرا خاں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ ان کے کمال کا معترف ہو چکا تھا اور ایسے ہونہار شاعر کی موجودگی سے اس کے دربار کی رونق کا بڑھ جانا ایک یقینی بات تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خسرو جلد ہی اس شہزادے کے خاص الخاص مصاحبوں اور ندیموں میں شمار ہونے لگے۔

لیکن گردشِ زمانہ نے یہاں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ سامانے میں انہیں زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بغرا خاں کی دربار دہلی سے طلبی ہوئی اور بادشاہ کے ساتھ لکھنوتی کی مہم پر جانے کی تیاری کا

حکم ملا۔ ہوا یہ کہ ان دنوں لکھنوتی کا حاکم ایک ملک طغرل نامی تھا، اس نے اپنی بہادری اور قابلیت سے لکھنوتی اور بنگالے کے صوبوں کو بالکل اپنے ہاتھ میں کر لیا تھا اور وہاں کے لوگوں میں اسے بڑا رسوخ حاصل ہو گیا تھا۔ ان کامیابیوں کی وجہ سے اسے اپنے متعلق بہت زعم ہو گیا اور خصوصاً جب اس نے جاج نگر تسخیر کر کے بہت سا مال و دولت وہاں سے حاصل کر لیا تو اس کا سر پھر گیا اور بلبن کے عہد کے چودھویں سال یعنی کوئی 676ھ میں اس نے علم بغاوت بلند کر کے اپنا لقب مغیث الدین رکھ لیا اور خطبہ اور سکہ اپنے نام کا جاری کر دیا۔ جب بلبن کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو اس نے ایک سپہ سالار امین الدین کو کچھ فوج دے کر طغرل کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا لیکن امین کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر دہلی واپس آ گیا۔ اس بزدلی کی اسے بہت سخت سزا ملی یعنی بلبن نے اسے قتل کرا دیا اور پھر ایک اور فوج طغرل کے مقابلے میں لکھنوتی روانہ کی، لیکن طغرل نے، جس کا حوصلہ اور ہمت اب اور زیادہ ہو گئی تھی، اس فوج کو بھی بُری طرح مار بھگایا۔ پے در پے دو شکستوں سے بلبن کے غصے کی کوئی انتہا نہ رہی اور اس نے فوراً خود سفر کی تیاری شروع کر دی اور اس مہم کے لیے جو بھی ضروری ساز و سامان ہو سکتا تھا مارا مار تیار کرنے کا حکم دیا۔ برسات کا زمانہ قریب تر تھا اور بادشاہ کے امیروں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی، لیکن بلبن نے ایک نہ سنی۔ سامانے سے بغرا خاں کو بلا کر اپنے ساتھ لیا اور کوچ کا حکم دے دیا۔ شہزادے نے جہاں اپنے اور خاص خاص مصاحبوں کو ہمراہ چلنے کو کہا، وہاں خسرو سے بھی یہی درخواست کی۔ شہزادے کی اس خواہش کو رد کرنا آسان نہ تھا۔ اس لیے خسرو غالباً بادلِ ناخواستہ، راضی ہو گئے۔ یہ پہلا لمبا اور دشوار سفر تھا جو انہیں اپنی زندگی میں پیش آیا اور اس طرح بھری برسات میں ایک دور دراز مہم کے ہمراہ بہت سے تلخ تجربے ہوئے، جن کا ذکر انہوں نے بہت شکایت آمیز لہجے میں کیا ہے۔ کیا عجب ہے کہ اپنی وہ خوبصورت غزل جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں، اس موقع پر یعنی دہلی سے روانگی کے وقت کہی ہو:

ابر می باردومن می شوم از یار جدا
چوں کنم دل بچنیں وقت ز دلدار جدا
ابر باراں و من و یارستارہ بہ وداع
من جدا گریہ کناں ابر جدا، یار جدا

لکھنوتی تک شاہی لشکر ابھی نہ پہنچا تھا کہ طغرل نے جارج نگر کا رخ کیا اور اپنے ساتھ لکھنوتی کے بہت سے باشندوں کو بھی لے گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بلبن کو کوئی اور ڈیڑھ سو کوس کا سفر طے کرنا پڑا، بقول خسرو کیچڑ اور دلدلوں کی کثرت کی وجہ سے اس سفر کا ہر ایک کوس ایک مصیبت تھا اور سال بھر سے بھی کچھ زائد عرصہ کل سفر میں صرف ہوگیا، مگر بلبن نے ہمت نہ ہاری اور آخر کار فوج کے ایک دستے نے طغرل کی جائے پناہ کا پتہ لگا کر اچانک اس کے خیموں پر دھاوا بول دیا۔ طغرل مارا گیا اور اس کا سر کاٹ کر بلبن کو بھیج دیا گیا۔ باغیوں کو سخت سزائیں دی گئیں اور لکھنوتی کے بڑے بازار میں جو کوئی ایک کروہ لمبا تھا، انہیں برابر برابر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اب بلبن نے اطمینان کا سانس لیا اور اس فتح کی خوش خبری دہلی روانہ کر کے خود بھی دارالسلطنت کی جانب چلا، لیکن چلنے سے پہلے لکھنوتی اور بنگالے کی حکومت بغرا خاں کے سپرد کی اور اس کے سیکرٹری شمس الدین دبیر کو بھی صلاح و مشورے کے لیے خاص طور پر شہزادے کے ساتھ رہنے کا حکم دیا، بلکہ ان دونوں کو بہت سی نصیحتیں کیں اور کچھ ہدایتیں باقاعدہ لکھ کر ان کے سپرد کیں کہ انتظام حکومت میں ان کا خیال رکھیں۔ شہزادے کو حکومت کے چتر سرخ اور دورباش سے سرفراز کیا گیا اور بادشاہ کا چتر سیہ دہلی کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ شمس الدین دبیر اپنے زمانے کے مشہور ادیبوں میں سے تھے اور خسرو پر ان کی خاص توجہ رہتی تھی، خسرو ان کی عنایت اور احسان کا اکثر ممنونیت کے لہجے میں ذکر کرتے ہیں اور انہوں نے ان کی مدح میں کچھ قصیدے بھی لکھے ہیں۔ جب بلبن، بغرا کو چھوڑ کر دہلی روانہ ہونے لگا تو شمس الدین دبیر نے بہت کوشش کی کہ خسرو بھی ان کے ساتھ لکھنوتی میں رک جائیں، لیکن خسرو نے معذرت چاہی اور شہزادے سے رخصت ہو کر شاہی لشکر کے ساتھ دہلی آگئے۔ بلبن غالباً سنہ 786ھ میں اس مہم کو سر کر کے دہلی پہنچا، فتح کی خوشی میں شہر کو خوب سجایا گیا، گھر گھر جشن اور عیش و طرب کی محفلیں منعقد ہوئیں اور سرداروں اور سپاہیوں کو دل کھول کر انعام و اکرام دیا گیا۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ بلبن کا بڑا بیٹا سلطان محمد ملتان کا حاکم تھا، بلبن کی واپسی کی خوش خبری سن کر یہ شہزادہ بھی ملتان سے باپ کی زیارت کے لیے دہلی پہنچا اور اپنے ساتھ بہت سا خزانہ اور تاتاری گھوڑے، جو مغلوں سے لڑائیوں میں ہاتھ لگے تھے، لایا جنہیں اس نے بادشاہ کے سامنے بطور ہدیہ پیش کیا۔ بادشاہ بیٹے کی اس سعادت مندی سے بہت خوش ہوا اور اس کی قدر و منزلت پہلے بھی زیادہ کرنے لگا۔ یہ بیٹا بادشاہ کو ہمیشہ سے بہت عزیز رہا تھا اور جہاں تک

معلوم ہوسکتا ہے باپ کی اس محبت کا واقعی مستحق بھی تھا۔ بہادری، شرافت اور دریا دلی میں بے مثل تھا اور وہ تمام صفات جو ایک مہذب اور شائستہ انسان میں پائی جا سکتی ہیں اس کی ذات میں جمع ہوگئی تھیں۔ آدابِ مجلس اور قاعدے قواعد کا اتنا پاس کرتا تھا کہ اگر کبھی اپنے دربار میں کئی گھنٹے بھی بیٹھنا پڑا تو زانو نہ بدلتا تھا۔ بزرگوں اور عالموں کا بے حد قدر دان تھا، اور ان سے بہت ہی عزت اور ادب سے پیش آتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس کی مجلس میں کچھ قوال گا رہے تھے۔ مجلس میں شیخ صدرالدین اور شیخ عثمان بھی تھے، کسی شعر پر ان دونوں بزرگوں پر ایسا جذبہ طاری ہوا کہ انہوں نے اٹھ کر رقص کرنا شروع کر دیا۔ شہزادے نے یہ دیکھا تو فوراً خود بھی کھڑا ہو گیا اور جب تک یہ وجدانی رقص جاری رہا، ہاتھ باندھے اور نیچی نظر کیے برابر کھڑا رہا۔

دہلی میں شہزادے کے قیام کے دوران میں اس کی ملاقات امیر خسرو سے بھی ہوئی اور اس نے ان کا کلام سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ چنانچہ خسرو ایک روز اپنا کلام لے کر پہنچے اور شہزادے کو سنایا، شہزادے کو بے حد پسند آیا اور اس نے یہ خواہش ظاہر کی کہ خسرو اس کے ساتھ ملتان چلیں۔ خسرو نے بغرا خاں سے جو تعلق قائم کیا تھا وہ تو ایک طرح سے منقطع ہو ہی چکا تھا، بلبن سے یہ توقع نہ تھی کہ وہ اپنے دربار میں انہیں کوئی شایانِ شان منصب دے دے یا ان کی قابلیت کی کما حقہ، قدر کر سکے، اس لیے ظاہر ہے کہ خسرو کو اس تجویز کے منظور کرنے میں زیادہ تامل نہ ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ان کا اپنا بیان بھی یہی ہے کہ انہوں نے شہزادے کی بات بہت خوشی سے مان لی۔ انعام میں ایک کلاہ اور خلعت تو انہیں مل ہی چکا تھا، اب شہزادے کی ملازمت میں کمر بندگی باندھ کر ملتان کے سفر کے لیے تیار ہو گئے اور کچھ عرصے کے بعد شہزادے کے ساتھ اس قدیم اور تاریخی شہر میں پہنچ گئے۔

تیسرا باب

خسرو، شہزادہ محمد کی ملازمت میں، ملتان کا قیام، شہزادے کی شہادت، بلبن کا انتقال اور کیقباد کی تخت نشینی

ملتان کا شہر عرصے سے سندھ کے صوبے کا پایہ تخت رہا تھا۔ اس زمانے میں اس شہر کی پرانی عظمت میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ چنگیز خاں کے خروج کے بعد سے مغل برابر ہندوستان پر حملے کرتے رہتے تھے اور ان حملوں کی روک تھام کے لیے ملتان میں ہمیشہ کوئی قابل حاکم رکھا جاتا تھا، جس کے پاس ایک بڑا لشکر ہمیشہ رہتا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ یہ شہر ہندوستان کی سرحد سے بہت دور نہ تھا، اس لیے باہر کے ملکوں، یعنی ایران اور ترکستان وغیرہ، سے جو تجارتی تعلقات ہندوستان کے تھے ان میں اسے کافی اہمیت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے ملتان کے باشندے بہت خوشحال تھے اور ملتانی تاجروں کی دولت ضرب المثل ہوگئی تھی۔ چنانچہ اس زمانے کے فضول خرچ اور دیوالیہ امراء اکثر ان سوداگروں کی مدد حاصل کیا کرتے تھے، روپے پیسے کی کان ہونے کے ساتھ ہی یہ شہر علم اور فضل کا بڑا مرکز بن گیا تھا اور خصوصاً شہزادہ محمد کی حکومت کے زمانے میں تو ملتان اس معاملہ میں دہلی سے شاید ہی کچھ پیچھے ہو، اس لیے کہ اس شہزادے کی سخاوت اور قدردانی کا شہرہ سُن کر عالم، ادیب اور شاعر دور دور سے یہاں آکر جمع ہوگئے تھے۔ مذہبی حیثیت سے بھی ملتان دہلی سے رقابت کا دعویٰ رکھتا تھا، کیونکہ یہاں عرصے سے ولی اور بزرگ ہوتے چلے آئے تھے اور سلطان محمد کے زمانے میں اگر دہلی میں خواجہ نظام الدین اولیا کا چشمۂ فیض جاری تھا تو ملتان میں خواجہ صدرالدین، جو خواجہ بہاء الدین زکریا کے بیٹے تھے، روحانی ہدایت کی شمع روشن کیے ہوئے تھے۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ خسرو کے لیے ملتان میں کسی قسم کی بھی دلچسپی کی کمی نہ تھی، اور انہیں اپنا کمال دکھانے کا اس سے بہتر موقع نہ مل سکتا تھا۔ لیکن خسرو فطرتاً جذباتی طبیعت کے

واقع ہوئے تھے۔انہیں اپنے اہل و اقارب اور دہلی کی یاد رہ رہ کر ستاتی تھی۔شہزادے نے ان کی دل جوئی میں یقیناً کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہوگی مگر باوجود اس قدر و منزلت کے جو انہیں ملتان میں حاصل ہوئی تھی اور باوجود اس کے کہ شیخ سعدی شیرازی تک نے ان کے کلام کی تحسین و آفریں لکھ کر سلطان محمد کو بھیجی تھی اور خسرو کی سرپرستی اور قدردانی کی تاکید لکھی تھی، ان کا دل ملتان میں زیادہ عرصہ نہ لگ سکا۔اس کی ایک وجہ تو دہلی سے دوری تھی اور دوسرا سبب غالباً یہ تھا کہ مغلوں سے جو آئے دن لڑائیاں رہتی تھیں اس سلسلے میں سلطان محمد کو بعض دشوار گزار اور دور دراز مقامات میں آنے جانے کی ضرورت اکثر پیش آتی رہتی تھی اور ان سفروں میں معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات خسرو کو بھی اپنے ہمراہ لے جایا کرتا تھا، چنانچہ کسی ایسے ہی سفر میں خسرو کو سرحدی پٹھانوں سے بھی واسطہ پڑا اور اس کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''ایک وہ زمانہ تھا کہ میرا مسکن قبۂ اسلام تھا، جو ہفت اقلیم کے بادشاہوں کا قبلہ ہے یعنی وہ دہلی جو ہمشیرۂ آسمان ہے اور رُوئے زمین پر بہشتِ بریں کا ایک ٹکڑا ہے، تو آسمان اس پر اپنا مبارک سایہ ڈالے ہوئے ہیں اور ہفت اقلیم اس کے دروازے کا حلقہ ہیں، اس کے بلند قصر آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور سورج پر بھی سایہ ڈالتے ہیں اور اس کے بازار میں آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا ہے کہ مردم چشم کو بھی دیکھنے والے کی آنکھ میں جگہ نہیں ملتی۔اس کے سر سبز میدانوں میں پھول کھل رہے ہیں، اور اس کے چشمے چمکدار آنکھوں سے بھی زیادہ صاف اور روشن ہیں، جن کا بہتا ہوا پانی آبِ حیات کی طرح خوش گوار اور نبات میں سے بہتے ہوئے دودھ کی طرح شیریں ہے۔حوض سلطانی ایسا روشن کہ معلوم ہوتا ہے چاندی کو پگھلا کر پتھر میں ڈال دیا ہے۔اس کے باغات میں تماشائیوں کا ہجوم، جن میں سے ہر ایک لالہ رخسار، بنا گوش کی وہ چمک دمک کہ کان کے موتیوں کی آب کو بھی ماند کر دے۔عود اور رباب کے نغمے، جو اس کے باغوں میں بلند ہوتے ہیں، ایسے شیریں کہ درخت مخمور ہو جائیں اور چشمے اونگھنے لگیں۔وہاں میرے دن سیر اور تماشے میں اور راتیں ایک محبوب کی صحبت

میں بسر ہوتی تھیں۔ شاید اس گلستان کے لیے میرا وجود بار تھا کہ تقدیر نے مجھے خارستان میں لاکر مقید کردیا ہے۔ قلعہ کیا ہے ایک دہکتا ہوا تنور ہے، وحشیوں اور جنگلیوں سے معمور جیسے کوئی ویرانہ...... اس قلعے میں افغانوں کی بستی ہے، نہیں بلکہ مردم گیر دیووں کی، اس لیے کہ ان کے نعروں سے دیو بھی خوف زدہ ہوکر نالہ و بکا کرنے لگتے ہیں۔ سر کیا ہیں ،معلوم ہوتا ہے بڑے بڑے بورے بھوسے سے بھرے، اور داڑھیوں کی یہ کیفیت کہ جلاہوں کے برش معلوم ہوتے ہیں، ٹانگیں لم ڈھیگ کی سی مگر عقاب سے زیادہ تندخو، سر یوں نیچے کو جھکے ہوئے جیسے ویرانے کے بوم کا، ان کی آوازیں کوے کی بولی کی طرح کرخت اور ناگوار، ان کے منہ اس طرح کھلے ہوئے جیسا مینا کا، زبانیں ایسی کند جیسے خانہ ساز تیر، اور الفاظ ایسے سخت کہ جیسے منجنیق سے پتھر نکل رہے ہوں۔ کسی دانا نے ٹھیک کہا ہے کہ جب گویائی آسمان سے اہلِ زمین کے لیے نازل کی گئی تو افغانوں کو سب سے کم اور سب سے آخری حصہ ملا۔"[1]

لیکن خسرو کی ملتان سے یہ بیزاری کچھ زیادہ بڑھنے نہ پائی، اس لیے کہ وہاں بھی ان کی دلبستگی کے کافی سامان تھے، اور اس لیے انہوں نے جو پانچ سال وہاں گزارے وہ بعض لحاظ سے ان کی زندگی کا ایک بہت اچھا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔ شہزادہ محمد نے، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، دور دور سے ادیبوں اور شاعروں کو بلاکر اپنے دربار میں جمع کرلیا تھا، بلکہ ایک روایت تو یہ ہے کہ اس نے دو بار شیخ سعدی شیرازی کو بھی ملتان آنے کی دعوت دی اور ان کے لیے قیمتی تحائف اور خلعت بھیجے، لیکن شیخ سعدی نے دونوں مرتبہ معذرت لکھ کر بھیج دی۔ ملتان کے دربار میں خسرو کے علاوہ سب سے زیادہ مشہور شاعر سید حسن سنجری تھے،[2] یہ تقریباً خسرو کے ہم عصر تھے اور غزل گوئی میں خصوصاً کمال رکھتے تھے، اسی مناسبت سے انہیں سعدیٔ ہند بھی کہا جاتا تھا، بعض نقادوں کا تو یہ خیال ہے کہ وہ غزل میں خسرو سے بھی بازی لے گئے تھے لیکن اگرچہ اس میں اختلاف کی گنجائش ہے، یہ ضرور ماننا پڑتا ہے کہ سید حسن کے کلام میں ایک سادگی اور بے ساختگی ایسی ہے کہ جو بہت کم شعراٗ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ خسرو اور حسن کے بظاہر بہت اچھے تعلقات تھے اور خسرو

ان کی بہت قدر کرتے تھے، چنانچہ غرۃ الکمال میں ہندوستان کے باکمال شعراء کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے حسن کا نام بھی لیا ہے۔ لیکن وہ قصہ عشق اور محبت کا، جسے فرشتہ اور بعض اور تذکرہ نویسوں نے بھی نقل کیا ہے، میرے خیال میں زیادہ قابلِ اعتبار نہیں ہے کیونکہ خسرو کے کلام سے کہیں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے اور حسن کے درمیان کوئی ایسا رشتہ الفت قائم ہو گیا تھا جسے عشق کے نام سے تعبیر کر سکیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ خسرو کی ملاقات پہلے حسن سے ایک نان بائی کی دکان پر ہوئی جہاں حسن کام کرتے تھے، اور ان کے حسن و جمال اور حاضر جوابی نے خسرو کو مفتون بنا لیا۔ اُدھر حسن کے دل میں بھی خسرو کی طرف ایک محبت کا جذبہ موجزن ہوا اور دکان چھوڑ کر وہ حضرت نظام الدین اولیا کے پاس خسرو کی تلاش میں پہنچے، ان بزرگ سے خسرو کو چونکہ خاص تعلق پہلے ہی سے حاصل تھا، اس لیے آپس میں مراسم بڑھنے شروع ہوئے۔ جب شہزادہ محمد، خسرو کو ملتان بحیثیت مصحف دار کے لیے جا رہا تھا تو حسن کو بھی دوات دار کا منصب دے کر ساتھ لے گیا۔ وہاں دونوں دوستوں کے تعلقات لوگوں کی نظر میں کھٹکنے لگے اور شہزادے کو بھی کچھ شبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے حسن کو خسرو سے ملنے کی ممانعت کر دی اور جب باوجود اس بندش کے حسن نے خسرو کو ملنا نہ چھوڑا تو شہزادے نے حسن کو تازیانے کی سزا دی اور خسرو کو بلوایا، خسرو نے جو اپنی بانہہ کھول کر دکھائی تو بالکل وہیں کوڑے کے نشان تھے جہاں حسن کے، اور انہوں نے یہ مصرعہ پڑھا کہ:

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

اس پر سلطان محمد نے ان کے عشق کی پاکیزگی کو تسلیم کر لیا اور اگرچہ خسرو نے ملازمت سے استعفا دینے کی خواہش ظاہر کی، شہزادے نے اسے منظور نہ کیا اور ان سے آئندہ اس قسم کا تعرض کرنا چھوڑ دیا۔[3]

اس روایت کا بودا پن اوّل تو اسی سے ظاہر ہے کہ کہیں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ملتان جانے سے پہلے خسرو کو حضرت نظام الدین اولیا سے کوئی خصوصیت حاصل ہو چکی تھی بلکہ برخلاف اس کے خسرو کے اپنے بیانات سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ان کی رسائی حضرت نظام الدین اولیا کے حضور میں آخر عمر میں ہوئی۔ دوسری بات، جو قابلِ غور ہے، یہ ہے کہ خسرو اور حسن کے ہم عصر مورخ ضیاء الدین برنی نے کہیں اس قسم کے گہرے تعلق کا ذکر نہیں کیا، بلکہ محض یہ لکھا ہے کہ خسرو اور حسن میں دوستی تھی اور اس دوستی کی بنا ایک حد تک برنی ہی کی سعی سے پڑی تھی۔ تیسری چیز یہ ہے کہ جیسا میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ خسرو کے کلام میں کہیں حسن کا خاص طور پر تذکرہ نہیں ہے اور نہ حسن نے

اپنے اشعار میں خسرو کی مدح وستایش کی ہے، بعض تذکرہ نویسوں نے حسن کی یہ رباعی نقل کی ہے کہ:

خسرو از راہ کرم بپذیرد
انچہ من بندہ حسن می گویم
سخنم چو سخن خسرو نیست
سخن ایں است کہ من می گویم

اوراس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حسن کو خسرو سے بہت عقیدت تھی اور اپنے کلام سے متعلق خسرو کی رائے کی وہ بہت قدر کرتے تھے۔ لیکن میرے خیال میں رباعی کے دوسرے بیت سے یہ مفہوم بعید از قیاس ہو جاتا ہے بلکہ اس بیت میں کچھ شائبہ تعریض اور طنز کا بھی پایا جاتا ہے، سوائے اس کے کہ "سخن اینست کہ من می گویم" کا یہ مطلب لیا جائے کہ "بات یہ ہے کہ میں کہتا ہوں۔" یعنی یہ کہ یہ فرض کرلیا جائے کہ حسن ایک ہندی محاورے کا فارسی ترجمہ کررہے ہیں۔ اس صورت میں پوری رباعی کا ترجمہ یوں ہوسکتا ہے کہ خسرو اپنے کرم وعنایت کی رو سے میرے کلام کی قدر کرتے ہیں اور اگرچہ میرا کلام خسرو کا سا نہیں ہے لیکن بات یہ ہے کہ میں کہتا ہوں (اس لیے خسرو کو پسند آتا ہے) لیکن ظاہر ہے کہ فارسی محاورے کے لحاظ سے یہ مفہوم صحیح نہ ہوگا۔ قیاس تو یہ کہتا ہے کہ اپنے زمانے کے ان دو بڑے شاعروں میں کچھ نہ کچھ رقابت اور رشک باہمی ضرور موجود ہوگا۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ رقابت یا رشک بھی اس حد تک مستقل نہ ہوا ہو کہ آپس کے دوستانہ تعلقات میں کوئی ظاہرا فرق رونما ہو۔ بہرحال خسرو اور حسن کی دوستی تسلیم کرنے میں کسی کو کوئی تامل نہیں ہوسکتا کیونکہ افضل الفوائد میں خسرو اکثر ان کے نام کے ساتھ برادرم کا لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن مذکورہ بالا روایت کے ماننے کے لیے کوئی صائب رائے شخص تیار نہ ہوگا۔

خسرو پانچ سال یعنی سنہ 678ھ سے 683ھ تک ملتان میں رہے اور بقول خود ملتان کے پانچوں دریاؤں کو اپنے اشعار میں سمندروں (بحروں) سے پانی دیتے رہے۔ اس عرصے میں غالباً انہیں شہزادے کے ساتھ ملتان سے دہلی آنے کا اتفاق ہوتا رہا، اس لیے کہ سلطان محمد ہر سال ایک پھیرا دہلی کا ضرور کرلیتا تھا۔ اس طرح خسرو کو اپنے اہلِ اعزہ سے ملاقات کا موقع مل جاتا ہوگا۔ ان کی شادی غالباً ہو چکی تھی۔ دہلی کی تعریف اور اس شہر کی دلچسپیوں کے بارے میں خسرو کی جو

عبارت اوپر نقل ہو چکی ہے اس سے یہی خیال گزرتا ہے۔ اگرچہ افسوس کی بات ہے کہ نہ تو یہ بات مسلمہ ہے کہ ان کی شادی ہوئی تھی اور کئی بچے بھی تھے چنانچہ اس کے متعلق آگے چل کر اور بیان کروں گا۔ دہلی سے روانہ اور اپنے بال بچوں سے رخصت ہوتے وقت خسرو کو ظاہر ہے کہ بہت رنج ہوتا ہوگا اور مجبوراً ہی وہ ملتان واپسی پر راضی ہوتے ہوں گے۔ ایک بہت دل کش غزل میں جو غالباً کسی ایسے ہی موقعے پر لکھی ہوگی، کہتے ہیں:

مشکلے سخت است تنہا ماندن کر دلدار خویش
باکہ گویم حال تنہا ماندن دشوار خویش
آن کہ روزی ناوکی خوردہ است اوداند کہ چیست
درد مجروحی کہ نالد از دل افگار خویش
مردہ راحسرت زمردن نیست ہست از بہرا نک
بازی می بند ندزو ہم صحبتان، دیدار خویش

خسرو کے اس پانچ سالہ قیام ملتان کا خاتمہ بہت ہی افسوس ناک واقعے یعنی مغلوں کے ہاتھوں شہزادہ محمد کی شہادت پر ہوا۔ جب سلطان محمد کو ملتان کی حکومت ملی تھی اسے برابر مغلوں سے واسطہ پڑتا رہا۔ اس لیے کہ مغل کسی نہ کسی سردار کی قیادت میں سال میں ایک دو مرتبہ ضرور ہندوستان کے زرخیز میدانوں پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح دھاوا بول دیا کرتے تھے اور ان سے اکثر خوں ریز معرکے ہوتے رہتے تھے جن میں زیادہ تر مغلوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا تھا اور لوٹ مار کا زیادہ موقع ملنے سے پہلے ہی راہِ فرار اختیار کرنا پڑتی تھی۔ شہزادے کی ان کامیابیوں کا ذکر خسرو نے بھی بعض مرصع قصیدوں میں کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شجاعت اور قابلیت کی دھاک مغلوں کے دلوں پر بھی بیٹھ چکی تھی، لیکن قسمت کو پلٹتے دیر نہیں لگتی اور بعض دفعہ اپنے آپ پر حد سے زیادہ اعتماد ہی انسان کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔

سنہ 683ھ کا آخری مہینہ یعنی ذی الحجہ تھا کہ شہزادہ محمد کو مغلوں کے ایک حملے کی خبر ملی، یہ حملہ ایک مغل سردار تیمور خاں نے، جو اس زمانے میں ہلاکو خاں کے پوتے ارغون خاں کی طرف سے ہرات، بلخ، بخارا، غزنین، غور اور بامیان کے صوبوں کا حاکم تھا، کوئی بیس ہزار کی جمعیت کے ساتھ کیا اور مغل

لشکر بڑھتے ہوئے لاہور اور دیوپال تک پہنچ گیا۔ شہزادے کو یہ سن کر ایسا غصہ آیا کہ ملتان سے فوراً روانہ ہوگیا اور فوج کی فراہمی یا ساز و سامان کی تیاری کا مطلق خیال نہ کیا۔ شاہی لشکر تیزی سے بڑھتا ہوا چند گھنٹے میں یعنی صبح سویرے سے دوپہر تک دریائے راوی (اب لاہور) تک پہنچ گیا۔ مغلوں کا لشکر دریا کے دوسرے کنارے پر تھا۔ تیمور خاں نے پیش دستی کی اور دریا کو عبور کر کے شہزادے کی فوج پر حملہ کر دیا۔ بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی اور کئی مغل سردار اس خوں ریزی میں کام آئے۔ ہندوستانی فوج مغلوں سے تعداد میں بہت کم تھی، لیکن اس نے مغلوں کے دانت کھٹے کر دیئے اور آخر انہیں بھاگتے ہی بنی۔ شہزادہ اور اس کے ساتھی یہ سمجھے کہ میدان جیت لیا اور اس لیے حزم اور دوراندیشی کو خیرآباد کہہ کر زیادہ تر ہندوستانی سپاہی بھاگتے ہوئے مغلوں کے تعاقب میں روانہ ہوگئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شہزادے کے ساتھ کل پانچ سو آدمی رہ گئے اور چونکہ نماز ظہر کا وقت تنگ ہو رہا تھا، ان لوگوں نے دریا کے کنارے نماز کی نیت باندھ لی۔ اُدھر مغلوں کا ایک سردار دو ہزار چیدہ سواروں کی ایک جمعیت کے ساتھ کمین گاہ میں بیٹھا موقع کا منتظر تھا اور شہزادے کو اس طرح مشغول دیکھ کر اس نے ایک دم یورش کر کے ہندوستانی فوج کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کیا۔ حملہ بالکل اچانک ہوا تھا اور ایک اور چار کی نسبت تھی، لیکن پھر بھی شہزادے اور اس کے ساتھیوں نے وہ شجاعت اور پامردی دکھائی کہ کئی گھنٹے لڑائی جاری رہی اور آخر مغل سردار اس اندیشے سے کہ کہیں بڑا شاہی لشکر بھی واپس آ کر اس کی فوج پر نہ ٹوٹ پڑے اور اس طرح اسے اپنے ساتھیوں سے ملنے کا موقع ہی نہ رہے، اپنے بچے کھچے سپاہیوں کو جمع کر کے بھاگنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ شومیٔ قسمت سے ایک تیر شہزادے کے آ کر لگا اور ایسا کاری زخم آیا کہ وہ گر پڑا اور گر کر جانِ شیریں جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ اب کیا تھا ہندوستانی فوج میں بھاگڑ مچ گئی اور مغلوں نے بھاگتے ہوئے ہندوستانیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا شروع کیا۔ کئی دریا میں غرق ہو کر شہید ہوئے اور مغل، شاہی خیموں کو تاخت و تاراج کر کے اور سینکڑوں قیدی گرفتار کر کے واپس روانہ ہوگئے، اور ان ہی قیدیوں میں امیر خسرو بھی تھے۔ اپنی اس مصیبت کو خسرو نے ایک نظم میں یوں بیان کیا ہے کہ:[4]

"کچھ تم نے بھی سنا کہ اس سال ملتان کے قریب مسلمان کا میمنہ کفار کے حملے سے کیسے ٹوٹ گیا؟ میں اس مصیبت کا بیان کیا کروں کہ جس سے ملک الموت بھی بچ کر بھاگنا چاہتا تھا؟ یا ان حملوں کا کیا حال لکھوں جو کہ شہزادہ

غازی نے حیدر کرار کی طرح کافروں پر کیے؟ لیکن تقدیر کے ان احکام کو جو خود خدا کی طرف سے نافذ ہوتے ہیں کوئی کس طرح ٹال سکتا ہے ......شہیدوں کا خون زمین کو پانی کی طرح سینچ رہا تھا اور قیدیوں کے گلوں میں رسیوں کے پھندے یوں پڑے ہوئے تھے جیسے پھول دھاگے میں باندھ رہے ہوں۔ زین کے گرہوں میں ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور لگاموں کے پھندوں میں ان کے گلے گھٹ رہے تھے۔ اگرچہ میں اس کشت وخون سے زندہ بچ رہا لیکن قید ہوا اور دہشت اور موت کے ڈر سے میرے کمزور جسم سے خون خشک ہوگیا۔ مجھے ایک پہاڑی نالے کی طرح بھاگنا پڑا اور پیدل چلتے میرے تلوؤں میں ہزاروں آبلے پانی کے بلبلوں کی طرح نمودار ہوگئے۔ میرا جسم ایک خزاں دیدہ درخت کی طرح برہنہ تھا، اور کانٹوں سے ہزاروں جگہ زخم پڑ گئے تھے۔ وہ سرکش باغی جو مجھے ہنکائے لیے جارہا تھا گھوڑے پر یوں بیٹھا تھا جیسے پہاڑ پر چیتا۔ اس کے منہ سے بُری بُو آرہی تھی اور اس کی غلیظ مونچھیں اس کے دہانے پر لٹکی ہوئی تھیں۔ اگر کبھی درماندگی سے ذرا رفتار ہلکی کردیتا تھا تو وہ کبھی تو اپنا طغافہ دکھاتا تھا اور کبھی طوغمار۔ یاس میں آہ بھرتا تھا اور میں دل میں سوچ رہا تھا کہ اس بلا سے اب زندہ بچ کر نہ نکلوں گا۔ مگر اس مہربان خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ جس نے مجھے اس سے رہائی دی، نہ تو تیر نے میرے دل کو چھیدا اور نہ تلوار نے میرے جسم کو گھائل کیا۔"

خسرو اس قیدِ مغل سے کب اور کس طرح رہا ہوئے اس کے متعلق صحیح طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن ان کے کچھ اشعار سے یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ ملتان سے کچھ زیادہ دور نہ گئے تھے کہ قسمت نے ان کی گلوخلاصی کی ایک عجیب صورت پیدا کردی، چنانچہ اپنی مثنوی خضر خاں دول رانی میں کہتے ہیں:

"ان دنوں جب میں گنہگار بندہ اب سے دور مغلوں کی قید میں گرفتار ہوگیا تھا تو ریگستان میں سرگرداں چلا جارہا تھا اور گرمی کی شدت سے سر دیگ کی طرح ابل رہا تھا۔ چلتے چلتے میں اور میرا ساتھی مغل سوار دونوں پیاسے

راستے میں ایک چشمے پر پہنچے، لیکن اگرچہ پیاس اور گرمی سے میرا تن بدن پھنک رہا تھا، میں نے اس سلگتی ہوئی آگ پر پانی سے تیل ڈالنا مناسب نہ سمجھا بلکہ ذرا سے لب تر کر لیے جس سے دل اور جگر میں کچھ ٹھنڈک پیدا ہو گئی، مگر اس پیاسے سوار اور اس سے زیادہ پیاسے گھوڑے نے خوب سیر ہو کر پانی پینا شروع کیا اور اتنا پیا کہ جلد ہی دونوں گر کر ہلاک ہو گئے۔''

اس بیان سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ خسرو کو بہت جلد ہی آزادی مل گئی اور غالباً وہ اسی روز ملتان واپس آ گئے۔ اس لیے شبلی نعمانی کا یہ بیان جو غالباً انہوں نے احمد سعید مارہروی کی کتاب ''حیاتِ خسروؔ'' سے اخذ کیا ہے، کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ مغل، خسرو کو قید کر کے بلخ لے گئے تھے اور وہاں سے دو سال کے عرصے کے بعد وہ ملتان واپس آئے۔ غرض جب خسرو ملتان پہنچے تو وہاں عجیب کیفیت دیکھی۔ گھر گھر کہرام مچا ہوا تھا ایک تو ایسے ہر دل عزیز اور ہونہار شہزادے کی موت، دوسرے عزیزوں اور دوستوں سے جدائی نے تقریباً ہر شخص کو غم سے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ چند گھنٹوں میں کیا کیا ہو گیا، کتنی امیدیں تھیں جو خاک میں مل گئیں، کتنی خوشیاں تھیں جو رنج سے بدل گئیں، اور کتنے گزشتہ کارناموں کا فخر تھا جو ملیا میٹ ہو گیا۔ خسرو نے اس اندوہناک واقعے پر دو مرثیے لکھے ہیں اور ان میں مغلوں سے لڑائی، شہزادے کی موت، اور اہلِ ملتان کے رنج و الم کی ایک ایسی تصویر کھینچ دی ہے کہ جو سچی بھی ہے اور انتہا درجے کی پُر اثر بھی۔ ان ہی میں سے ایک مرثیہ میں کہتے ہیں:

''سورج اور چاند بھی شہزادے کے خوب صورت چہرے کا ماتم کر رہے تھے اور رات اور دن اس کی جواں مرگی پر گریاں تھے۔ اس کے عہد میں چونکہ مرغ اور ماہی بھی امن چین سے رہتے تھے اس لیے ہوا اور پانی میں بھی نالہ و بکا برپا تھا۔ ملتان کے باشندے ہر گھر، ہر گلی اور ہر محلے میں رو رو کر اپنے کپڑے پھاڑ رہے تھے اور بال نوچ رہے تھے۔ رونے کی بلند صداؤں اور ڈھول کی مہیب آوازوں سے رات بھر، کسی کو نیند نہ آئی، آتی بھی تو کس طرح، جب کہ ہر ایک گھر میں کسی نہ کسی مرنے والے کا ماتم ہو رہا تھا...... ترکوں کی سفیدی اور ہندوؤں کی سیاہی دونوں غائب ہو گئیں اس لیے کہ سب کے سب یکساں نیلے ماتمی لباس میں ملبوس

ہیں...... نازنینوں کے چہروں کو اب نہ سرخی کی ضرورت ہے اور نہ وسے کی، کیونکہ پیٹنے سے ان کے رخسار سرخ ہو رہے ہیں اور ان کے ابرو نیلے۔" [5]

ایک اور جگہ لڑائی کا خاکہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ [6]

"یہ کوئی آفت ہے یا بلا ہے جو آسمان سے نمودار ہوئی ہے؟ اور یہ کوئی مصیبت ہے یا خود روز قیامت ہے جو آج دنیا کے پیشِ نظر ہے؟

وہ بھی کیا منحوس ساعت تھی جب شہزادہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ملتان سے روانہ ہوا اور اس نے اپنی کافر کش تلوار کو کافروں کے قتل کے لیے میان سے باہر نکال لیا۔ جب اسے دشمن کی آمد کی خبر ملی تو اس نے اس کی قوت کی کچھ بھی پروا نہ کرتے ہوئے غصے میں بھر کر فوراً علم اٹھا لیا، اور جو لشکر موجود تھا اس کے علاوہ اور لشکر حاصل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی، کیونکہ رستم کو لشکر کا ممنونِ احسان نہ ہونا چاہیے! ایک ہی کشش میں وہ ملتان سے لاہور پہنچ گیا اور دل میں سوچ رہا تھا کہ ہمارے عہد میں بھی کافر کی یہ ہمت ہو گئی کہ یوں سرکشی اختیار کرے۔ کیا میں وہی شیر نہیں ہوں کہ میری تلوار جو آب بھی ہے اور آتش بھی، انہیں ہر سال پانی اور راکھ میں گھسیٹا کرتی ہے؟ میں نے زمین پر ان کا اتنا خون بہایا ہے کہ اس میں گدھ یوں تیر رہے ہیں جیسے پانی پر بطخ اور اس سال ان کے خون سے خاک ایسی سرخ ہو رہی ہے کہ شفق کو اپنا لال رنگ زمین سے حاصل کرنا چاہیے۔ شہزادہ اس فکر میں تھا کہ تقدیرِ فلک نے تدبیر کے صفحے پر مشیتِ ایزدی کا خط کھینچ دیا۔ محرم کی پہلی رات کو وہ اپنے لشکر سمیت نکلا اور عاشورے کے آنے سے پہلے ہی حسینؓ کی طرح لڑائی کے میدان میں پہنچ گیا اور اس کے گھوڑے کے پاؤں کی گرد نے سورج کی آنکھ میں سُرمہ لگانا شروع کیا۔ افسوس وہ بھی کیا وقت تھا کہ کافر نے اس پر اپنی فوج سے حملہ کیا، وہ لوگ جوق در جوق دریا سے گزر کر آئے اور ناگاہ انہوں نے دھاوا بول دیا...... اب تو شہزادے کے گھوڑے کو دیکھتا تھا اور اس کے غبار

کو آسمان پر گرتے ہوئے، کس طرح وہ اپنے بادپا گھوڑے کو خاک ایسے دشمنوں کی طرف بڑھا رہا تھا۔ کس طرح وہ سپاہیوں کے جوش سے ستاروں میں غلغلہ پیدا کر رہا تھا اور سواروں کے سیلاب سے دنیا میں زلزلہ رونما کر رہا تھا۔ تُو نے یہ بھی دیکھا کہ ڈھول کی آواز، گھوڑوں کے ہنہنانے اور سواروں کی چیخ و پکار سے اس نے صحرا و دشت میں کس طرح لرزہ پیدا کر دیا۔ بہادر مخالفوں پر حملے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے اور بزدل اس فکر میں تھے کہ بھاگنے کا کوئی موقع ہاتھ آ جائے۔ اس شاہ مرد پرور کا کام اس میدانِ کار میں یہ تھا کہ مردوں کا سا کام کرے اور کام کرنے والے مردوں کو برانگیختہ کرے، جب دونوں فوجیں آپس میں گتھ گئیں تو دن تاریک ہو گیا، اور جب خنجر خنجر میں الجھا تو آفتاب بھی زرد پڑ گیا، دن غروب ہونے کو تھا کہ انہوں نے تلواروں کے زنگاری رنگ سے خورشیدِ لشکر کے سر پر ایک نیا آسمان کھڑا کر دیا۔ تلواروں کی صفیں دونوں طرف سے بڑھتی ہوئی کنگھی کی طرح نظر آئی تھیں، جب وہ ایک دوسرے کے بال کھینچ کر بال، سے بال گوندھ رہے تھے۔ وہ کافر، جو ہر طرف سے کافروں کی چوٹی کی طرح ایک دوسرے سے پیوستہ تھے، تلوار سے یوں صاف ہونے لگے جیسے ان ہی کافروں کا آدھا سر صاف تھا۔ اس سبز میدان میں کشتوں کی لاشیں یوں پڑی تھیں جیسے سبز دنیا میں تصویریں بنی ہوئی ہوں۔ اس کی شمشیر قتال ایک لمحے کے لیے بھی لڑائی سے فارغ نہ ہوئی تھی۔ لڑائی کے دن زوال کے وقت سے رات تک یہی حال رہا۔ یارب وہ خون تھا جو صحرا میں بہ رہا تھا یا کوئی دریا کی موج تھی جو دشمنوں کی طرف بڑھ رہی تھی؟ زخمی جب خاک میں جان دے رہے تھے اور تڑپ رہے تھے تو خون ان کے گلوں سے موجزن ہو کر اوپر کو جا رہا تھا۔ خان لشکر کش صفوں کو ترتیب دینے اور لڑائی کا انتظام کرنے کے لیے اپنے اشہب اقبال کو ہر طرف دوڑا رہا تھا، اور وہ دوڑ رہا تھا۔ آسمان فتح کو پھر بالوں

سے پکڑ کر واپس کھینچ لے جاتا تھا حالانکہ فتح ان مغلوں کی طرف سے بھاگ کر ہماری جانب آنا چاہتی تھی، کافر اس انتظار میں تھے کہ رات آئے اور وہ بچ کر میدانِ جنگ سے نکل جائیں، کہ ایک دم ہماری ترازو کا پلہ پلٹ گیا۔ آہ وہ بھی کیا رات تھی کہ آفتاب آسمان سے گر پڑا۔ دیو جہاں میں آگ لگاتے پھر رہے تھے اور شہاب زمین پر پڑا تھا، چونکہ اس آفتاب ملک کے دن ختم ہو چکے تھے۔ اس لیئے ابھی کچھ دن باقی تھا کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ اگر حسینؓ کربلا کو بے آبی کا راستہ طے کرنا پڑا تو یہ محمد تھا جو آب سے آگ میں گر پڑا، لوگوں کے دلوں میں مچھلی کے جال کی طرح روزن ہو گئے کیونکہ دیو کے دھوکے سے جم کے ہاتھ سے شاہی انگوٹھی پانی میں گر گئی تھی، کافر خون میں یوں پڑا تھا جیسے گوبر میں گدھا اور مومن کیچڑ میں یوں جیسے میلے پانی میں موتی۔ ایک فوج دریا میں آب بلا سے گزر رہی تھی اور دوسری فوج دیکھنا، کس سراب کے راستے میں پڑ گئی تھی۔ سب کے سب تختۂ خاک کے نیچے چلے جا رہے تھے، اس لیے کہ اب سب کا کام یومِ حساب کے دفتر ہی سے متعلق ہو چکا تھا۔ کشتوں کے سر، جو خون ناب میں غلطاں تھے ایسے تھے جیسے ناریل پر شنگرف سے نقش بنائے گئے ہوں۔ بہت سے زندہ ایسے بھی تھے کہ ہیبت کی وجہ سے مُردوں کے درمیان بدن پر خون ملے اور آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے تھے۔ یہ معمولی مصیبت نہ تھی جو میں نے دیکھی، میں نے خود قیامت کو دیکھ لیا، کیونکہ اگر قیامت ایسی ہی ہوگی تو میں نے اسے ضرور دیکھ لیا ہے۔ دائرۂ آسمان نے دیکھ کیا پُرکار کی سی گردش کی اور مرکز اسلام کی طرح سرگشتہ کر دیا، تو نے دیکھا کہ ذرے نے چشمہ خورشید کی آب چرا لی اور پتھر کو دیکھا کہ اس نے لولوے شہوار کا کام تمام کر دیا؟ اسے ہر سال مغلوں سے دین کی خاطر سروکار رہتا تھا، آخر دیکھا کہ اس نے سر بھی اسی کار دین کی نذر کر دیا؟ جمعہ کا دن اور ذی الحجہ کا آخری روز تھا کہ یہ واقعہ ہوا اور سنہ 683ھ کا آخر

اور 684ھ کا شروع تھا۔''

خسرو کے کتنے ہی عزیز دوست ہوں گے جو اس ہنگامے میں ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ کیسی کیسی صورتیں ہوں گی جو مغلوں کے بے پناہ تیروں اور بے محابا تلواروں نے ہمیشہ کے واسطے خاک میں پنہاں کر دیں۔ ان دوستوں کی موت کا رنج خسرو کو اپنی جان کی سلامتی کی خوشی سے کہیں زیادہ ہوا اور جگہ جگہ اپنے اس رنج و الم کا بہت ہی دردناک الفاظ میں ذکر کرتے ہیں، چنانچہ اپنے ایک مشہور قصیدے ''حکم الحکم'' میں کہتے ہیں:[7]

''صیاد کے پھندے سے اپنی رہائی سے مجھے کیا حاصل، جب دوستوں اور غم خواروں کا وہ سلسلہ ٹوٹ کر پرزے پرزے ہو گیا؟ چمن کی زمین پر اب رنگارنگ کے پھول کھل رہے ہیں اور لالے کے رنگ سے صحرا میں چنار کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، مگر افسوس جب مصیبت کی آندھی نے ان چہروں کو، جو گلاب کی مانند تھے، خاک میں بکھیر دیا تو میرا دل گلاب کی کلی کی طرح کس طرح خون نہ ہو جائے؟ گزشتہ سال کے دوستوں میں اس سال کوئی بھی باقی نہیں رہا۔ کاش یہ سال آخری سال ہوتا! لاؤ ایک جام دو کہ غم غلط کرنے کو اسے پی لوں، اور پھر اپنے آنسوؤں سے دوبارہ بھر دوں! اے ابرِ بہار پانی کو چھوڑ اور میری طرح خون کے آنسو برسا، اب جب کہ سنہ چھ سو چوراسی (684) ہے اور میری عمر چونتیس برس کی ہو گئی ہے، لیکن اس سے کیا حاصل ہے؟ اس لیے کہ اگر میری عمر کے سال بجائے تیس اور چار کے تیس ہزار بھی ہو جائیں تو ایک ہی بات ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ انجام فنا ہے، اور اگر میں شاعر نہیں بلکہ جادوگر بھی ہو جاؤں تو بھی مجھے معلوم ہے کہ خاک میری منتظر ہے، اگر میں خالی خسرو نہیں بلکہ کیخسرو ہوں تو بھی میری آخری منزل غار ہی ہو گی۔''

خسرو نے کئی رباعیوں میں بھی اپنے اس رنج والم کا اظہار کیا ہے، جن میں سے چند یہ ہیں:

در جنگ مغل که تیر کین شد پرتاب
هم تاب زروی رفت وہم روی زتاب
زاں کشتہ و خستہ کاندر آب افتادند
آں آب ہمہ خون شدوآن خون ہمہ آب

قومی کہ درآن عرصہ کین می خسپند
فریاد کہ بہرچہ چنین می خسپند
برخاک نہادہ اندسرھا گوئی
در ماتم خویش برزمین می خسپند

آں گرد بلا ببین کہ انگیختہ شد
تاگہ بہ سرپیر و جواں بیختہ شد
آں روی جوانان سیہ خط بر خاک
گرآب حیات بود ہم ریختہ شد

وقت می و باغ و زیلتی برکردہ
رفتند چو غنچہ دوستان سرکردہ
ای گل مگر ایں حال شنیدی امروز
رخسار ز خون دیدہ پرتو کردہ

جمعی ہمہ گردن برسن کردہ گرو
بودند چو خون کشتگان اندر رو
ہم خار ہمی گرفت دامن کہ مپری
ہم آبلہ می فتاد در پا کہ مرو

آن کیست کہ سوئی رفتگان مارہ جوید

مارا جز از حال اسیران گوید

پلی کہ ز برگ گل خراشیدہ شدی

یا رب کہ میاں خار چوں می پوید

ملتان کے افسوس ناک واقعے کے متعلق مصنف تاریخ فرشتہ نے ایک روایت نقل کی ہے۔ جس کا مقصد غالباً ایک بزرگ کی روحانی کرامات کو مبالغہ آمیز طریقے پر بیان کرنا ہے اور جو بالکل ممکن ہے کہ ان بزرگ کے کسی عقیدت مند مرید کی من گھڑت ہو۔ اس لیے کہ اس قسم کی روایت برنی یا کسی اور مورخ نے نقل نہیں کی۔ روایت یہ ہے کہ شہزادہ محمد کی بیوی سلطان رکن الدین کی بیٹی تھی اور بہت نیک پرہیز گار خاتون تھی۔ ہر چند کہ شہزادے کو اس سے بہت انس اور محبت تھی۔ ایک دن شراب کے نشے میں ایسا وارفتہ ہوگیا کہ بیوی کو طلاق دے دی۔ جب ہوش آیا تو اپنے کیے پر نادم ہوا اور رجوع کرنا چاہا، لیکن فقہا نے قانون شرع کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ فتویٰ دیا کہ اب رجوع صرف اس طرح ممکن ہے کہ اس خاتون کا نکاح پہلے کسی اور شخص سے ہو اور پھر وہ طلاق دیدے، چنانچہ شہزادے کو ایسے آدمی کی تلاش ہوئی اور اس نے شیخ صدرالدین کو اس کام کے لیے منتخب کیا اور ان بزرگ نے یہ منظور کرلیا کہ وہ شہزادی کو اپنے نکاح میں لانے کے بعد طلاق دے دیں گے تاکہ شرعی حجت پوری ہوسکے اور وہ دوبارہ سلطان محمد کے نکاح میں آسکے۔ لیکن نکاح کے بعد ان بزرگ نے طلاق دینے سے انکار کردیا، اس لیے کہ شہزادی نے کہا کہ میں ایک نیک اور متقی شخص کے پاس آنے کے بعد دوبارہ اس ''فاسق و فاجر'' کے پاس نہیں جانا چاہتی، اور اگرچہ شہزادے نے بہت کوشش کی کہ وہ بزرگ اپنا وعدہ پورا کریں۔ لیکن انہوں نے شہزادی کو اس کی خلاف مرضی چھوڑ دینا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر شہزادے کو اتنا غصہ آیا کہ اس نے شیخ کو کوئی سخت سزا دینے کی ٹھان لی۔ اس سے پیشتر کہ وہ اپنے اس ارادے کو پورا کرسکے اسے مغلوں کے حملے کی خبر ملی اور وہ لاہور کی طرف روانہ ہوگیا۔ اور پھر وہاں سے کبھی واپس نہ آیا۔ [8]

اس قسم کی لغو روایتوں پر یقیناً کوئی منصف مزاج آدمی اعتبار نہیں کرسکتا، کیونکہ اگر شہزادے کا ان بزرگ کو دھمکانے اور ان کو گزند پہنچانے کا ارادہ قابلِ عقوبت سمجھا جاسکتا ہے تو ان بزرگ کی وعدہ خلافی بھی لائقِ ملامت تصور ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ فرشتہ میں سلطان محمد کے حُسنِ

سیرت اور خوش اطواری کی اس قدر تعریف کی گئی ہے کہ اس کے بعد اسی شہزادے کے متعلق فاسق و فاجر کے الفاظ کا استعمال تعجب خیز معلوم ہوتا ہے۔ بالکل اسی قسم کی ایک روایت سلطان غیاث الدین تغلق اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے متعلق بھی مشہور ہے، اور اگر چہ اس دوسری روایت کی صحت کا کچھ گمان ہوسکتا ہے تو بھی وہ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہے۔ لیکن اس کا ذکر اپنی جگہ پر ہوگا۔ شہزادہ محمد کی شہادت پر جو عام ماتم ملتان اور دہلی میں ہوا اس کی نیک نفسی اور ہر دل عزیزی کا بین ثبوت ہے۔ جن لوگوں کو بھی اس سے قریب کا واسطہ پڑا وہ اس کے مداح ہی نہیں بلکہ جان و دل سے گرویدہ ہو گئے اور خسرو کو بھی اس سے ایک خاص محبت اور عقیدت پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ برنی کا بیان ہے کہ اس کے انتقال کے عرصے بعد تک خسرو اپنے دوستوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر ہماری قسمت اچھی ہوتی تو آج شہزادہ محمد مالک تاج وتخت ہوتا۔[9]

جب اس حادثۂ جان کاہ کی خبر دہلی پہنچی تو ایک کہرام مچ گیا اور گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ لوگ امیر خسرو اور سید حسن کے مرثیے پڑھتے تھے اور زار و قطار روتے تھے۔ سلطان بلبن کی عمر اب اسی سے کچھ زیادہ ہو چکی تھی، بڑھاپے میں ایسے منظورِ نظر اور قابل بیٹے کا صدمہ ناقابلِ برداشت تھا، بہت ضبط اور حوصلے کا آدمی تھا اس لیے اپنی ظاہرہ عادات اور اطوار میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ دربار کا دبدبہ اور شکوہ وہی پہلا سا اب بھی رہا، لیکن اصل میں دل ٹوٹ چکا تھا۔ خلوت میں لوگوں کی نظروں سے بچ کر اپنے دل کی بھڑاس آنسو بہا کر نکال لیا کرتا تھا۔ آخر اس صدمے میں بیمار پڑا اور جب بچنے کی کوئی امید نہ رہی تو اپنے جواں مرگ بیٹے کے خوردسال بچے کیخسرو کو اپنا جانشین نامزد کیا، حالانکہ اپنا چھوٹا بیٹا بغرا خاں، جو اب حاکم لکھنوتی تھا، موجود تھا۔ لیکن بغرا خاں سے بلبن شاید کبھی بھی بہت خوش نہ تھا اور اس موقع پر بھی بجائے اس کے کہ بغرا خاں باپ کی دلجوئی اور ہمدردی کے خیال سے دہلی میں کچھ عرصے تک اس کے پاس رہتا۔ وہ بلانے سے آیا بھی تو بہت مختصر قیام کے بعد لکھنوتی واپس چلا گیا۔ وہ آزاد منش اور عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور دہلی کی بندشیں اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھیں۔ اس کا یہ طرزِ عمل بھی غالباً بلبن کے لیے اسے تخت و تاج سے محروم کرنے کا باعث ہوا۔ کیخسرو کو ولی عہد قرار دینے کے بعد اپنے باپ کی جگہ ملتان بھیج دیا گیا، اور اس نے وہاں کی حکومت سنبھال لی۔

بلبن نے کیخسرو کی نامزدگی اکابر دولت کے سامنے جن میں فخر الامر کوتوال دہلی اور اس کا بھتیجا نظام الدین وزیر شامل تھے، باقاعدہ کی تھی۔ اور ان دونوں امرا سے خاص طور پر اس کی

نگہداشت اور وفاداری کی تلقین کی۔ لیکن کوتوال شہزادہ محمد سے ہمیشہ برگشتہ خاطر رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب بوڑھے بلبن نے سنہ 686ھ میں آنکھیں بند کیں تو اس نے اور ذمہ دار لوگوں سے سازش کر کے سلطان محمد کے بیٹے کو تو عملاً ملتان میں نظر بند کر دیا اور بغرا خاں کے نوجوان بیٹے کیقباد کو تخت دہلی پر بٹھا دیا۔ اس شہزادے کی عمر اس وقت سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ بلبن کی سخت نگرانی اور ہر وقت کی دیکھ بھال میں اس نے تربیت پائی تھی، لیکن فطرتاً رنگین مزاج اور شوقین واقع ہوا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کا تاج سر پر رکھتے ہی اس نے رنگ رلیاں منانا شروع کر دیں۔ جوان تھا اور بہت عرصے اپنی فطرتی خواہشوں کو دباتا رہا تھا۔ موقع ملتے ہی کھل کھیلا اور خوب جی بھر کر داد عیش وطرب دینے لگا۔ وہ دربار جس میں کبھی کسی مسخرے یا بھانڈ کا سایہ بھی نہ دکھائی دیتا تھا اور جہاں ارباب عیش ونشاط پر بھی نہ مار سکتے تھے اب راجہ اِندر کا اکھاڑہ بن گیا۔ دور دور سے گویے، مسخرے، بھانڈ، بازی گر امنڈے چلے آتے تھے اور بقول برنی ہر دیوار کے سایے میں ایک پری نظر آنے لگی اور ہر بالا خانے پر ایک حور جلوہ نما ہو گئی۔ ہر گلی سے ایک گویا اور سازندہ ظاہر ہو گیا اور ہر محلے سے کسی نہ کسی بھانڈ یا گویّے نے اپنا سر اٹھایا۔ [10]

بادشاہ نے دہلی کو چھوڑ کر کیلوگھری کو آباد کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں شاہی محل، خوش نما باغوں اور امراُ کے پُر تکلف اور شاندار مکانوں سے یہ مقام رشک دہلی ہو گیا۔ یہاں خوب عیش وطرب کے جلسے رہتے تھے، اور اربابِ نشاط کا ایک پورا عملہ دربار شاہی سے متعلق تھا۔

خسرو، شہزادہ محمد کے انتقال کے بعد دہلی آئے لیکن جلد ہی اپنی والدہ کے پاس پٹیالی چلے گئے اور کچھ عرصے اپنا وقت زیادہ تر وہیں گزارا۔ اس زمانے میں امیر علی سرجاندار سے ان کے مراسم بہت بڑھ گئے اور اس امیر نے خسرو کی خاطر ومدارت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ وہ حاتم کے لقب سے مشہور تھا اور واقعی دادِ سخاوت دینے میں حاتم سے کم نہ تھا۔ وزیر نظام الدین نے کئی مرتبہ کوشش کی کہ خسرو کو دربار شاہی میں بلالے، لیکن خسرو بھلا اس وزیر پر کیوں کر اعتماد کر سکتے تھے جس نے اپنے آقا کی آخری خواہش کا کچھ بھی پاس نہ کیا اور خسرو کے خاص مربی اور مہربان شہزادہ محمد کے بیٹے کو تخت سے محروم کر دیا، اس لیے انہوں نے امیر علی کا ساتھ نہ چھوڑا۔ نظام الدین کا اقتدار دن بدن بڑھتا جا رہا تھا اور وہ کیقباد کے مزاج میں بہت دخیل ہو گیا تھا۔ اپنے اس رسوخ سے اس نے ناجائز فائدہ اٹھا کر پہلے تو اپنے ایک رقیب اور مدمقابل کو قتل کرا دیا اور اس کے بعد کیقباد کے کان کیخسرو کے خلاف بھرنا شروع کر دیئے۔ آخر اس بدقسمت شہزادے کو ملتان سے کسی

بہانے دہلی بلوایا گیا اور راستے میں رہتک کے مقام پر اسے قتل کر دیا گیا۔

کیقباد کی بدعنوانیوں اور اس کے وزیر نظام الدین کی ناشائستہ حرکتوں کی خبر بغرا خاں کو لکھنوتی پہنچی تو اسے بہت غصہ آیا، باپ کے انتقال کے بعد اپنے بیٹے کو تخت دہلی پر بیٹھے دیکھ کر اسے کچھ نہ کچھ رشک اور حسد ضرور پیدا ہوا ہوگا، لیکن فطرتی تساہل اور آرام طلبی نے اسے اس کی مہلت نہ دی کہ وہ بیٹے سے تخت وتاج کے لیے برسر مخاصمت ہو۔ اس کے علاوہ اسے اپنے باپ کی یہ نصیحت بھی یاد تھی کہ لکھنوتی اور بنگالے کی حکومت پر اسے قناعت کرنا چاہیے اور دہلی میں جو بھی حکمران ہو اس کی اطاعت اور وفاداری کو اپنا فرض سمجھنا چاہیے۔ لیکن دہلی کے ان حالات کو معلوم کر کے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے یہ ارادہ کر لیا کہ بیٹے کو قرار واقعی فہمائش کرے اور اسے نظام الدین کے پنجے سے چھڑائے، یہ ٹھان کر اس نے ایک بڑی فوج کے ساتھ لکھنوتی سے دہلی کی طرف یلغار شروع کر دی۔ ادھر کیقباد کو بھی باپ کے ارادوں کی اطلاع ملی اور اس نے بھی فوج فراہم کر کے پیش دستی کے طور پر دہلی سے لکھنوتی کا رخ کیا۔ اس عیش پسند بادشاہ کو مغلوں کے خلاف ایک کامیابی حاصل ہو جانے سے بظاہر اپنی جنگی قابلیت کا بھی کچھ زعم ہو گیا تھا اور ہر چند کہ یہ فتح اس کے بعض قابل سپہ سالاروں کی سعی سے حاصل ہوئی تھی لیکن اس میں اپنی بڑائی اور نمود کا اچھا موقع مل گیا تھا۔ مغلوں نے سامانے سے لاہور تک کے علاقے پر تاخت کو لے کر خوب لوٹ مار کی لیکن شاہی فوجوں نے آخر کار انہیں ایک فیصلہ کن شکست دے کر سرحد پار بھگا دیا اور سینکڑوں ہزاروں مغل قتل ہوئے یا گرفتار ہو کر دہلی لائے گئے۔ ان سب کو بہت بے دردی سے قتل کر دیا گیا اور ان کے سر کاٹ کاٹ کر کوچہ و بازار میں نیزوں پر گھمائے گئے۔ اس واقعے کا خاصا مفصل ذکر خسرو نے اپنی مثنوی قرآن السعدین میں کیا ہے۔ مغلوں کی اس شکست کے بعد نظام الدین نے ایک اور بہت ہی قابلِ ملامت حرکت یہ کی کہ بادشاہ کو ان مغلوں سے بھی بدظن کر دیا، جو کچھ عرصے سے دہلی کے نواح میں آباد تھے اور ان سب کا قتل عام کروا کر اس وزیر نے اپنے نامہ اعمال کو اور سیاہ کر لیا۔

چوتھا باب

کیقباد اور بغرا خاں کی مخالفت اور مصالحت، خسرو کی دربار شاہی سے پہلی مرتبہ باقاعدہ وابستگی

بہر حال ادھر تو بغرا خاں دہلی کی طرف بڑھتا آ رہا تھا اور ادھر کیقباد لکھنوتی کی طرف کوچ بہ کوچ چلا جا رہا تھا۔ آخر دریائے سرو یا سرجو پر جا کر دونوں فوجوں کا اتصال ہوا، اور اب صورت یہ تھی کہ دریا کے ایک طرف تو باپ اور دوسری طرف بیٹا خیمہ زن تھے، اور ذرا سی چنگاری کی ضرورت تھی۔ جو دونوں اطراف کے جذبات کو مشتعل کر کے جنگ کی آگ کو ایسا بھڑکا دیتی کہ ہندوستان کی حکومت کا خرمن اگر جل کر راکھ نہ ہو جاتا تو کم از کم جھلس تو ضرور جاتا۔ لیکن بعض عقل مند اور معاملہ فہم امرأ کی کوشش سے یہ خطرناک صورتحال پیدا نہ ہونے پائی۔ ان امرأ میں امیر علی سرجاندار خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

یہ امیر، کیقباد کے لشکر کے ساتھ تھا اور اس تعلق کی بنا پر، جو اسے اب خسرو سے تھا، اس نے انہیں بھی اس سفر میں ہمراہ لے لیا تھا اور اس طرح خسرو کو ان سب واقعات کو اپنی آنکھ سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ قرآن السعدین میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ سب چشم دید واقعات ہیں، جنہیں بلا کم و کاست شاعرانہ خوب صورتی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ غرض یہ دونوں لشکر کئی روز تو آمنے سامنے پڑے رہے اور آپس میں نامہ و پیام ہوتا رہا۔ ایک مرتبہ کیقباد نے اپنے بیٹے کیکاوس کو قیمتی تحفے تحائف دے کر بغرا خاں کے پاس بھیجا اور اسی طرح بغرا خاں نے اپنے چھوٹے بیٹے کیا مورث کو کیقباد کی خدمت میں روانہ کیا۔ آپس کے کشیدہ تعلقات رفتہ رفتہ استوار ہوتے گئے، یہاں تک کہ باپ اور بیٹے کی ملاقات کا سامان فراہم ہو گیا۔ ابتدا باپ کی طرف سے ہوئی، اس لیے کہ بیٹا آخر بادشاہ تھا، چنانچہ بغراں خاں ایک آراستہ

پیراستہ کشتی میں جو سال کی لکڑی سے بنائی گئی تھی اور دس سال کے عرصے میں تیار ہوئی تھی، دریا کے پار پہنچا۔ بیٹے کو دیکھ کر پدری شفقت جوش میں آئی، ادھر بیٹے کے دل میں بھی باپ کی محبت نے خروش کیا اور تخت سے اتر آیا۔ دوڑ کر باپ سے لپٹ گیا اور اس طرح بقول خسرو دونوں دریا تشنہ لب ایک دوسرے سے ملے، اور ان کی تشنگی کو آنسوؤں کا وہ سیلاب بھی فرو نہ کر سکا جو دونوں کی آنکھوں سے رواتھا۔[1]

دوسرے دن کیقباد ملاقات بازدید کے لیے گیا اور یہ سلسلہ کئی دن جاری رہا۔ اس طرح بچھڑے ہوئے دوستوں کو بھی ایک دوسرے سے ملنے کا اچھا موقع مل گیا اور خسرو کو عرصے کے بعد اپنے پرانے مربی اور سرپرست شمس الدین دبیر سے دوبارہ نیاز اور شرف ملاقات حاصل ہوا۔

اس جھگڑے کے اس خوش اسلوبی سے طے ہو جانے پر بہت خوشیاں منائی گئیں اور رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوئیں۔ شاعروں نے قصیدے اور تہنیت کی نظمیں سنائیں اور بیش قدر انعام پائے، چنانچہ خسرو بھی باپ بیٹے کی ملاقات کی خوشی میں یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں:

> ''خوش قسمت ہے وہ ملک کہ جہاں دو بادشاہ ایک ہو گئے اور خوش نصیب ہے وہ محفل جس میں دو جام ایک دوسرے سے مل گئے۔ بیٹا بادشاہ اور باپ بھی سلطان، اب ملک کی رونق دیکھیے جب کہ دو سلطان ایک ہو گئے۔ دنیا پر حکومت کے لیے دو زبردست بادشاہ متحد ہو گئے ہیں، ایک ناصر زماں محمود سلطاں (بغرا خاں) جس کی حکومت، سلطنت کے چار ارکان پر پھیلی ہوئی ہے اور دوسرا معزالدنیا کیقباد جس کے ماتحت ایران بھی ہے اور توران بھی۔''

ان دلچسپ صحبتوں کا ذکر قرآن السعدین کے علاوہ خسرو نے نجم الدین حسن کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے، جو اعجاز خسروی میں موجود ہے۔

کچھ روز کے بعد کیقباد نے باپ سے رخصت چاہی اور باپ نے بہت کچھ پند و نصائح کے بعد بیٹے کو الوداع کہا۔ ان نصیحتوں میں سے ایک خاص نصیحت یہ بھی تھی کہ کیقباد کسی طرح نظام الدین کے چنگل سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہیے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کیقباد نے باپ کی اس وصیت پر یا تو قصداً عمل نہ کیا یا اسے اس کا موقع نہ ملا، کیونکہ نظام الدین اس کے آخر عہد تک برسراقتدار

رہا، اور اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے ہی کیقباد نے اسے زہر دلوا کر مروا دیا تھا، شاہی لشکر کے ساتھ خسرو بھی دہلی کی طرف روانہ ہوئے، مگر قسمت میں ابھی اپنے اعزہ اقارب سے ملنا نہ لکھا تھا کیونکہ بادشاہ کیتھو ر یا کیتھو ر پہنچا تو وہاں اس نے خان جہاں امیر علی کو اودھ کا حاکم نامزد کر کے پیچھے چھوڑ دیا۔ خسرو تو اب اس امیر سے وابستہ تھے ہی، انہیں بھی ٹھہرنا پڑا اور برابر دو سال تک ان کا قیام اودھ یا عیوض (اجودھیا) کے قدیم شہر میں رہا۔ اپنے شاہی لشکر سے اس طرح جدا ہو جانے کا خسرو کو بہت قلق ہوا۔ چنانچہ اپنے ایک خط میں اعجاز خسروی میں یوں لکھتے ہیں۔ [2]

''اس آقا (امیر علی) کے حکم کی تعمیل میں مجھے اپنے ان عزیز دوستوں کی صحبت سے علیحدہ ہونا پڑا جو شاہی لشکر کے ساتھ تھے اور ہندوستان کی سیاہی کی طرف واپس جانا پڑا یعنی اقلیم زحل کی طرف، برسات کا موسم تھا اور مجھے ایسے وقت میں سفر کرنا پڑا جب بارش خوب زور پر تھی۔ دوستوں کی جدائی سے میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور بادل میری ہمدردی میں گریاں تھے۔ میرے گھوڑے کا پاؤں پانی کے گڑھوں میں پھسل پھسل جاتا تھا اور بجلی میری پریشانی اور مصیبت پر ہنستی تھی۔ مینہ کی بوندیں ٹپک ٹپک کر میرے آنسوؤں کا پتہ دیتی تھیں، اس مصیبت سے آخر کار میں اودھ پہنچا۔''

اودھ کا یہ مجبوراً قیام خسرو کے لیے زیادہ خوش آیند نہ تھا، چنانچہ اس زمانے میں اپنے عزیز دوست تاج الدین زاہد کو انہوں نے ایک لمبا چوڑا خط لکھا تھا، جو اعجاز خسروی میں ہے اور جس کے بعض حصے دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ اس خط میں لکھتے ہیں کہ:

''جب میں تم سے یوں جدا ہوا جیسے روشنی سے محروم سایہ، تو میں نے سفر شروع کیا۔ لیکن حال یہ تھا کہ آنکھوں سے خون کے آنسو بہہ رہے تھے، دل میں درد تھا اور آنکھوں میں دید کا شوق، منزل سامنے تھی مگر میری نظریں پیچھے لگی ہوئی تھیں۔ جوں جوں آگے بڑھا رنج بھی بڑھتا گیا اور میرے قدموں سے زیادہ تیزی کے ساتھ آنسو میری آنکھوں سے رواں تھے۔ کوئی زادِ راہ نہ تھا بجز غم، اور دل میں کوئی یاد تھی تو تمہاری، ہر منزل

سے آنسو بہاتا ہوا شاہی لشکر کے ساتھ چلا جارہا تھا یہاں تک کہ دو ماہ کے طویل سفر کے بعد جب بادشاہ اودھ پہنچے تو انہوں نے ہمارے خان (امیر علی) کو اودھ کی حکومت عنایت کردی۔ اودھ کا شہر تو خان کو تفویض ہوا اور مجھے ایک جاں گسل زہر نصیب، دل میں صبر تھا مگر ٹھہرنے پر مجبور تھا، اودھ کا شہر بلاشبہ بہت دل فریب ہے مگر تمہارے بغیر مجھے کچھ بھی نہیں بھاتا۔ شہر کیا ایک باغ ہے جہاں آدمی خوشی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اس کی زمین دنیا کے لیے زینت ہے اور اس کے اطراف میں اسبابِ طرب جمع ہیں۔ دریائے سرو اس کے پاس سے گزرتا ہے جس کے دیکھنے سے ہی پیاسے کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ خوشی کے سب لوازم بکثرت موجود ہیں۔ پھولوں اور شراب کی بہتات ہے۔ باغوں میں درختوں کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکی جاتی ہیں۔ انگور، کھٹے انار، نارنگیاں اور بیسیوں قسم کے پھل، جن کے ہندوستانی نام ہیں، میٹھے اور ذائقہ دار، مثلاً کیلے اور آم، دماغ کو طراوت بخشتے ہیں۔ چمن میں سدا بہار پھول کھل رہے ہیں اور پرندوں کے سُر یلے اور اداس نغموں سے فضا گونج رہی ہے۔ مولسری، چمپا اور جوہی سے چمن بھرپور ہیں۔ ان کے علاوہ کیوڑا ہے جس کے سیمین نیزے کے سامنے گلاب کا بھی خون بہتا ہے۔ پھر طرح طرح کی خوشبودار چیزیں اور گرم مسالے، عود، عنبر، مشک، کافور اور قرنفل بھی ہیں اور کپڑے ایسے کہ عمر گزشتہ کو واپس لے آئیں، تن کی زینت اور بدن کا زیب، مثلاً جھلجھوتلی اور بہاری کہ موسم بہار کا ایک خوش نما تحفہ معلوم ہوتے ہیں اور بدن پر ایسے ہلکے معلوم ہوتے ہیں جیسے لالے پر چاندنی یا صبح کے وقت گلاب پر قطرۂ شبنم۔

یہاں کے باشندے سب کے سب مہمان نواز، خوش اخلاق، نیک مزاج، پسندیدہ اطوار، وفا شعار اور دریا دل ہیں۔ امیر غریب سب مطمئن ہیں اور خوش ہیں اور اپنے اپنے کاروبار میں مشغول۔ حاکم وہ ملک معظم

اورخان منصور، اختیار الدین حاتم خاں، علی بن ایبک ہے جو اپنے ہمراہیوں کو مدحیہ قصیدوں کے صلے میں بیش قیمت موتیوں کے تحفے عنایت کرتا ہے۔ مجھ پر تو وہ خاص طور پر مہربان اور کرم فرما ہے۔ اس طرح خوشی کے کسی ساز وسامان کی میرے لیے کمی نہیں اور نہ میں کسی چیز کا محتاج ہوں، لیکن تم سے جدائی نے مجھے لبِ گور لا کھڑا کیا ہے۔ شراب کا جام کبھی پی کر خالی نہیں کرتا مگر اسے دوبارہ اپنے خون کے آنسوؤں سے بھرتا ہوں۔ تم یہ کیوں تصور کرتے ہو کہ میں جامہائے شراب میں مزے سے بیٹھا ہوں اور میرے چاروں طرف نغمہ وسرود کی خوش آیند آوازیں اٹھ رہی ہیں؟ تم میرے آنسوؤں کی شراب کو میری آنکھوں سے گرتے دیکھو اور میرے جلے ہوئے دل کا نالہ بھی تو سُنو! میرا پیالہ شراب سے لبریز ہے لیکن مجھے یہ شراب ایسی تلخ معلوم ہوتی ہے جیسے زہر، یہ سچ ہے کہ پیڑ سے ٹوٹ کر گلاب کا پھول کچھ عرصے گلدان میں زندہ رہ سکتا ہے مگر پھر جلد مرجھا بھی جاتا ہے۔''

خسرو کو اپنی ضعیف والدہ خاص طور پر یاد آتی رہتی تھیں۔ چنانچہ اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ ''خان کی عنایتوں نے پردیس کو ایسا خوشگوار بنا دیا کہ مجھے اپنا گھر بھول گیا۔ یہ دو سال کا عرصہ جو میں نے یہاں بسر کیا، مال ودولت کے لالچ کی وجہ سے نہیں، بلکہ محض اپنے مہربان آقا کی دلجوئی کے خیال سے گزارا، میری ضعیف سجہ زن والدہ دہلی میں تھیں اور مجھے بہت یاد کرتی رہتی تھیں، ان کے شب و روز مجھ نالائق کے فکر میں بہت اضطراب اور بے چینی سے گزرتے تھے، اور میری جدائی کے غم سے بے قرار ہو کر مجھے برابر واپس آنے کے لیے لکھتی رہتی تھیں۔ میرا دل بھی ان کے غم میں بے چین رہتا تھا۔ کچھ عرصے میں اپنا غم کسی نہ کسی طریقے سے غلط کرتا رہا، لیکن جب تابِ ضبط نہ رہی اور شوق بے قابو ہو گیا تو میں نے اپنا ماجرا، خان کے سامنے ایک عرض حال کی شکل میں پیش کر دیا۔ خان نے اپنی مہربانی اور کرم کے مطابق میری مجبوری کو دیکھا اور بخوشی مجھے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ سفر خرچ کے لیے اس نے مجھے دو کشتیاں سونے کے سکوں کی بھری ہوئی عنایت کیں اور اس طرح اس کے احسان کی شکرگزاری سے اپنے دل کو

پُر کر کے میں نے راہِ سفر اختیار کی۔ شوقِ دید مجھے کشاں کشاں لے جاتا تھا اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہ رہے تھے۔ میں نے راستہ یوں طے کیا جیسے کوئی پیکان تیز یا تیز پراں ہو اور ایک مہینے تک قیام نہیں کیا۔ کیونکہ سفر لمبا تھا اور اشتیاق شدید، یہاں تک کہ عید کے چاند کی طرح خوش خوش ذی القعد کے مہینے میں دہلی پہنچا۔ گلاب کی طرح ہنس ہنس کر میں نے اپنی بھوکی نگاہیں عزیز چہروں پر ڈالیں، دوستوں کی زیارت کا شوق پورا ہوا اور دلی مقصد حاصل ہو گیا۔ گویا ایک پرند جس نے خزاں کی سختیاں جھیلی ہوں ایک پُر بہار چمن میں پہنچ جائے یا کوئی پیاسا آبِ حیات کے چشمے کو پالے۔ میرا دل، جو رنج سے مردہ ہو چکا تھا، اپنے عزیزوں کو دیکھ کر دوبارہ زندہ ہو گیا اور ہزاروں ممنون محبت جذبات کے ساتھ میں نے اپنی آنکھیں اپنی مہربان ماں کے قدموں پر رکھ دیں۔ میری والدہ نے، جن کو میری جدائی نے بیمار اور کمزور کر دیا تھا، مہر و محبت کے چہرے سے نقاب الٹ دی اور مجھے گلے لگا کر خوشی کے آنسو بہا دیئے، ان کا غم دیدہ دل اب خوش اور مطمئن ہو گیا اور جو منتیں انہوں نے مان رکھی تھیں، سب پوری کیں۔''

اس طرح خسرو دوبارہ دہلی پہنچے، کیقباد کے اطوار و عادات میں ابھی تک کوئی نمایاں فرق پیدا نہ ہوا تھا۔ باپ کی نصیحتوں کا اگر چہ اثر ہوا بھی ہوگا تو وہ دہلی آتے آتے زائل ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ نظام الدین اور اسی قماش کے اور امرا یہ نہیں چاہتے تھے کہ کیقباد اپنی عیش پرستی ترک کر کے امورِ سلطنت کی طرف متوجہ ہو۔ اس طرح وہ اختیار اور اقتدار جو انہیں اب تک حاصل رہا تھا، نہ رہتا۔ انہی لوگوں کی ترغیب اور تحریص کا غالباً یہ نتیجہ تھا کہ بادشاہ کی سواری جوں جوں دہلی کے قریب پہنچتی جاتی تھی، حسین رہزنوں اور خوب صورت غارت گروں کا جمگھٹ اس کے گرد و پیش بڑھتا جاتا تھا۔ بادشاہ میں بھلا یہ قوتِ ضبط کہاں تھی کہ ان عشوہ فروش اور زاہد فریب حسینوں کا مقابلہ پامردی سے کر سکتا۔ دہلی پہنچا تو وہی ندیم تھے اور وہی مصاحب، وہی پرانی صحبتیں اور وہی لیل و نہار، لیکن دل پر باپ کے ایثار اور محبت کا کچھ نقش باقی تھا اور ابھی دریائے سرو کے کنارے کی دلچسپ ملاقاتوں کی یاد دل سے بالکل محو نہ ہوئی تھی۔ اس لیے اس نے خسرو کو ایک دن بلا بھیجا اور ان سے خواہش کی وہ اس واقعے کو نظم کر دیں۔ خسرو کو دہلی واپس آئے ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے، لیکن بادشاہ کے فرمان کی تعمیل ضروری تھی، خصوصاً اس لیے کہ دربارِ شاہی میں یہ ان کی پہلی طلبی تھی۔ مدت کے بعد ان کی مراد بر آئی تھی۔ وہ اب شہرت اور عظمت کے زینے کی آخری

سیڑھی تک پہنچ گئے تھے کیونکہ بادشاہ کے دربار میں رسائی اس زمانے میں کسی صاحبِ کمال کے لیے گویا معراج تھی۔ اس ملاقات کے دوران میں بادشاہ سے ان کی جو گفتگو ہوئی، اسے انہوں نے قرآن السعدین میں خود بہت دلچسپ طریقے سے بیان کیا ہے۔ بادشاہ نے اس قصیدے کے صلے میں، جو خسرو اس موقع کے لیے لکھ کر لے گئے تھے، انہیں انعام واکرام دینے کے بعد ان سے یوں خطاب کیا:

''اے ختم الشعرا، جس کے دستر خوان کے بچے کھچے ٹکڑوں سے اوروں کا پیٹ بھرتا ہے، ہمیں تم سے ایک درخواست کرنا ہے۔ اگر تم اپنے درخشاں خیال کی مدد سے میری خواہش کو پورا کر دو تو تم جتنا سونا بھی مانگو میں دینے کو تیار ہوں تاکہ تمہیں پھر کبھی احتیاج کی زحمت نہ ہو۔ اس پر خسرو نے جواب دیا کہ! اے بادشاہ جمشید فر، جس کا مثل تخت نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا، میں آپ کا احسان مند غلام اس قابل کہاں کہ آپ کا سا شخص مجھ سے کوئی درخواست کرے، آپ ہی ہر غلام کو جو کچھ بھی وہ مانگے، دیتے ہیں، میں آپ کو کیا دے سکتا ہوں۔ گلستاں ایک گلاب کے پھول سے رنگ و بو نہیں لیتا اور بادل ایک قطرے سے پانی کا جویاں نہیں ہوتا، بادشاہ، جس کے قبضہ قدرت میں تمام دنیا ہے اگر مجھ سے میری جان بھی طلب کرے تو وہ تو اب بھی اسی کی ہے اپنے پریشان دماغ اور کند اور سست ذہن سے جو کچھ بھی مجھے حاصل ہوسکتا ہے وہ تو ٹوٹی پھوٹی فارسی ہے۔ اگر آپ کا مدعا اس سے پورا ہوسکتا ہے تو میں تعمیل حکم کو عین خوش قسمتی خیال کروں گا۔'' اس پر بادشاہ نے کہا:

اے ساحر! ہم تم سے یہ چاہتے ہیں کہ دقتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے تُو میری خاطر سے شاعری کے مردہ جسم میں ایک نئی جان ڈال دو، اس طرح کہ تم دونوں سلطانوں کی ملاقات کا حال نظم کرو۔ یعنی اپنی زبان کے جادو سے مہربان باپ سے میری ملاقات کا قصہ نظم کرو تاکہ اگر کبھی جدائی کا غم مجھے بے چین کر دے تو اس قصے کو پڑھ کر میرے دل کو کچھ سکون حاصل ہو سکے۔'' یہ کہہ کر بادشاہ نے خزانچی کو آنکھ سے اشارہ کیا اور خزانچی جلدی سے خسرو کو بادشاہ کے حضور سے باہر لے گیا اور انہیں ایک مہر زر اور خلعتِ شاہی دے کر رخصت کر دیا۔

بادشاہ کے اس احسان اور توجہ کا خسرو پر کافی اثر ہوا اور اسی لیے کہتے ہیں کہ:

تعجب ہے کہ: تعجب ہے کہ مجھے اس عزت کے لیے منتخب کیا گیا، کہ میرا نفع اس قدر زیادہ

ہو، حالانکہ میرے پاس کوئی سرمایہ بھی نہیں! نہ تو میری قلم کو ہنر سے کوئی بہرہ حاصل ہے اور نہ میرے ورق پر گوہر سے کوئی چمک دمک دی گئی ہے...... محل شاہی سے نکل کر میں اپنے غریب خانے پر آیا، پریشان بھی تھا اور شرمندہ بھی، موتیوں کے بوجھ کے نیچے میری گردن جھک رہی تھی اور اس لیے اب میرا یہ فرض تھا کہ بادشاہ کی خدمت کروں۔ لوحِ دل کو ہاتھ میں لے کر میں ایک گوشے میں جا بیٹھا۔ عقل مبہوت تھی، اور خیالات منتشر، میں نے خود کو اپنے ساتھیوں سے پوشیدہ کر لیا، نہیں، بلکہ جن و انس سے روپوش ہو بیٹھا۔ آخر کچھ عرصے کے بعد دل سے خیالات کا ایک چشمہ رواں ہو گیا اور میرے ذہن کے دھوئیں سے قلم سیاہ ہو گیا۔ چونکہ جب میں محوِ فکر تھا تو میں نے اپنے خدا ہی پر بھروسا رکھا، اس لیے میرے اس خاکی نفس سے ایک بیش قیمت خزانہ نمودار ہو گیا۔"

یہ خزانہ مثنوی قرآن السعدین بھی، جو بقول خسرو چھ مہینے کی سخت کاوش کے بعد رمضان سنہ 688ھ میں پوری ہوئی اور جو بعض لحاظ سے خسرو کی مثنویوں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے، خسرو کے بعض تذکرہ نویسوں کو اس پر تعجب ہے کہ انہوں نے کیقباد جیسے عیش پرست اور نااہل بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے اتنی محنت کی اور ایسی گراں بہار تصنیف اس کے نام پر کی۔ لیکن ہمیں یہ فراموش نہ کرنا چاہیے کہ کیقباد میں اگر بہت سی برائیاں تھیں تو بعض خوبیاں بھی موجود تھیں۔ وہ حسین اور خوب رو جوان تھا، مزاج کا اچھا اور دل کا سخی واقع ہوا تھا۔ علم و ہنر کا بھی بڑا قدر دان تھا اور اگر اسے اچھی صحبت مل جاتی تو ممکن ہے کہ بادشاہ ہونے کے بعد اس سے وہ بے اعتدالیاں سرزد نہ ہوتیں جن کا انجام قبل از وقت موت ہوا۔ اس کے اخلاق اور اطوار کو بگاڑنے میں سب سے بڑا حصہ اس کے وزیر نظام الدین کا تھا۔ ورنہ اپنی طبیعت سے وہ بُرا آدمی نہ تھا۔ اس کے علاوہ ایک خصوصیت جو اسے حاصل تھی وہ شائد اس زمانے کے کسی اور بادشاہ میں نہ پائی جاتی یعنی یہ کہ ماں اور باپ دونوں کی طرف سے شاہی نسل سے تھے، چنانچہ خسرو کہتے ہیں:

پشت بہ پشت از دو طرف شہریار
ہر طرف از ہر دو طرف تاجدار
شمس جہاں گیر جد بافرش
اظہر من شمس جد دیگرش

ناصر حق شاہ فرشتہ سرشت
خوی خوشش نسخۂ باغ بہشت
جد سیم شاہ غیاث امم
حاکم فرمان ز عرب تا عجم
ہرسہ جدش کعبۂ ارکان جود
کردہ دو عالم سہ جدش راجود

یعنی کیقباد کا دادا غیاث الدین بلبن سلطان شمس الدین التمش کا نواسا اوراس کی اپنی ماں سلطان ناصر الدین محمود کی بیٹی تھی یا دوسرے لفظوں میں التمش کی نواسی تھی۔ پھر ایک اور بات جو خسرو کے لیے اس مثنوی کے لکھنے کی محرک ہوئی، یہ تھی کہ خسرو نے وہ سب واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے تھے اوراس لیے انہیں ان واقعات سے اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی خود کیقباد کو، اس طرح کیقباد کی خواہش پورا کرنے میں انہیں اور بھی تامل نہ ہوا ہوگا۔

بہر حال کیقباد پہلا بادشاہ تھا جس کے دربار میں خسرو ایک مصاحب اور ندیم ہی کی صورت میں نہیں بلکہ ملک الشعراء کی حیثیت سے پہنچے، اور آئندہ بادشاہوں کے عہد میں ان کی یہ حیثیت برابر قائم رہی۔ کیقباد کی زندگی نے زیادہ عرصے وفا نہ کی اور سنہ 689ھ میں اپنے وزیر نظام الدین کو زہر دلوانے کے بعد وہ خود بھی راہی ملک عدم ہوگیا۔

اس انتقال کی کیفیت یہ ہے کہ نظام الدین سے اپنا پیچھا چھڑانے کے بعد کیقباد نے سامانے کے حاکم ملک جلال الدین فیروز یغرش خلجی کو دہلی بلا کر اسے شائستہ خان کا خطاب دیا اور عارض ممالک کے عہدے پر مامور کر دیا۔ فیروز خلجی کی عمر اس وقت کوئی ستر 80 سال کی تھی اوراس نے کئی سال سامانے میں رہ کر مغلوں کے حملوں کی روک تھام اور سرحدی علاقوں میں امن وامان قائم رکھنے میں بہت سے کارہائے نمایاں دکھائے تھے۔ اس تقرر کے تھوڑے ہی عرصے بعد کیقباد بیمار پڑ گیا اوراس کی بیماری دن بدن زیادہ خطرناک شکل اختیار کرتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ مفلوج ہو کر چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہوگیا۔ بادشاہ کی یہ حالت دیکھ کر ترکوں نے آپس میں سازش شروع کی اور کیقباد کی زندگی میں ہی اس کے خوردسال بیٹے کیا مورث کو بادشاہ بنا کر تخت پر

بٹھادیا، لیکن خلجی امرأ جن کا سردار فیروز خلجی تھا اور جن میں بعض اور سر کردہ ملک مثلاً ملک اتیمو چکن باربک اور ملک ا۔تمو سرخہ بھی شامل تھے، ان ترکوں سے مخاصمت رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں خانہ جنگی کی نوبت آئی گئی جس میں ترکوں کو شکست ہوئی اور انہیں اطراف و جوانب میں منتشر کردیا گیا۔ کیا مورث بدستور بادشاہ رہا اور ملک فیروز خلجی اس کا اتالیق بن گیا اور اس طرح سلطنت کا کل انتظام اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ایک ترک نے، جسے کیقباد سے کوئی ذاتی عداوت تھی، اسے بہت ہی بے دردی سے اس کے بسترِ علالت پر قتل کردیا۔ اسی شاندار قصرِ نو میں جہاں کبھی اس کے دبدبے اور ہیبت سے لوگ لرزہ براندام رہتے تھے اس کا نحیف اور لاغر جسم بے جان اور خون میں غلطاں پڑا ہوا نیرنگیٔ زمانہ کا پتہ دے رہا تھا۔

جلال الدین خلجی اور تختِ دہلی کے درمیان اب اگر کوئی حائل تھا تو وہ بیچارہ خورد سال کیا مورث ہی تھا، اس کو بھی راستے سے ہٹانے کا جلد ہی انتظام کردیا گیا۔ چنانچہ سنہ 689ھ میں بوڑھے فیروز خلجی نے اسے معزول کر کے سلطان کا لقب اختیار کرلیا اور اس طرح اپنے چترِ سفید کو بادشاہت کے چترِ سیاہ سے تبدیل کر کے ہندوستان کی وسیع سلطنت کا مالک بن بیٹھا۔ خسرو کے بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فیروز خلجی کے بادشاہ ہونے سے پہلے ہی اس سے وابستہ ہوگئے تھے، کیونکہ غرۃ الکمال کے دیباچے میں کہتے ہیں:

> ''کیقباد کا چہیتا بیٹا شمس الدین (کیا مورث) بادشاہ بنادیا گیا اور شائستی خاں نے اسے اپنی حفاظت اور اتالیقی میں لے لیا۔ میں اس آسمان فیروزی کا عطارد (سیکرٹری) اور مصاحبِ خاص ہوگیا۔ میری خوش نصیبی سے فیروز شاہ کا علم فیروزی بادشاہت کے چترِ سیہ سے مبدل ہوگیا اور خدا کی مہربانی سے اس نے اپنے مبارک قدموں سے تختِ سلطنت کو زینت بخشی۔''

ایک اور شخص جس سے فیروز خلجی کو کچھ خطرہ ہوسکتا تھا، بلبن کا بھتیجا اور خسرو کا سب سے پہلا مربی علاؤالدین کشلو خاں تھا، اسے دہلی سے دور رکھنے کی یہ تدبیر کی گئی کہ کڑا مانک پور کی حکومت اس کے سپرد ہوگئی اور وہ وہاں روانہ ہوگیا۔

☙

پانچواں باب

جلال الدین فیروز خلجی کی بادشاہت، اس کا قتل اور علاؤالدین کا تخت دہلی پر قبضہ، خسرو کی ملازمت فیروز خلجی اور علاءالدین کے دربار میں

ملک جلال الدین فیروز خلجی یوں تو اب اپنے آقاؤں کا وارث بن کر ان کے تخت و تاج پر قابض ہو چکا تھا۔ اس کے دل میں ان کی، خصوصاً اپنے آقائے نعمت بلبن کی، اب بھی وہی قدر و منزلت باقی تھی جو پہلے تھی۔ اس میں غرور اور تکبر یا خود نمائی بالکل نہ تھی اور نہ دراصل وہ طاقت یا حکومت کا خواہاں تھا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ دہلی کی سلطنت پر اس کا قبضہ زیادہ تر اپنے بیٹوں خصوصاً منجھلے بیٹے ارکلی خاں کی تحریص و ترغیب کی وجہ سے ہوا۔ اسی لیے بادشاہ بننے کے بھی بہت عرصے بعد تک اس کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ دہلی جائے اور بلبن کے تخت پر بیٹھے۔ چنانچہ کلوکھری کے قریب کیقباد کے بنائے قصرِ نو ہی میں مقیم رہا۔ بادشاہ کے مستقل قیام کی وجہ سے وہاں محل کے اردگرد ایک خاصا شہر آباد ہو گیا جو نئے شہر (شہرِ نو) کے نام سے مشہور ہوا۔ آخر بہت دن کے بعد جلال الدین نے جی کڑا کر کے دہلی کا رخ کیا۔ جب قصر لعل (سرخ محل) کے پاس پہنچا تو گھوڑے سے اتر آیا۔ احمد چپ نے، جو اس کا وزیر اور مشیر خاص تھا، اس پر احتجاج کیا کہ حضور آپ یہ کیا غضب کر رہے ہیں؟ مگر جلال الدین نے اسے خاموش کر دیا اور کہا کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اپنی اصل کو بھول گیا ہوں اور اپنے آقا بلبن کے احسانوں کو بالکل فراموش کر چکا ہوں؟ واقعہ یہ ہے کہ جب میں محل کے قریب آیا تو میرے دل میں ایک خاص ہیبت اور خوف طاری ہو گیا اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ بلبن اپنی قدیم شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ تخت پر جلوہ افروز ہے، چنانچہ جب وہ تخت کے پاس پہنچا تو تعظیم کے لیے سر جھکا دیا اور اس کے بعد دربار کیا تو وہاں

نہیں جہاں تختِ شاہی رکھا ہوا تھا بلکہ محل کے ایک حصے میں علیحدہ جا کر کیا۔ جلال الدین کی اس سادگی اور منکسر مزاجی نے آہستہ آہستہ ان سرکش ترکوں کو اور دہلی کے باشندوں کو رام کر لیا جو اب تک اسے حقیر اور بادشاہت کے لیے نااہل تصور کرتے تھے۔

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ خسرو اسی زمانے میں فیروز خلجی سے متعلق ہو گئے تھے جب وہ کیامورث کے اتالیق یا اتابیک کا منصب رکھتا تھا، چنانچہ غرۃ الکمال میں دو ایک قصیدے جو خسرو نے اس کی تعریف میں کہے تھے اسی زمانے کے لکھے ہوئے ہیں، بادشاہ ہونے کے بعد فیروز خلجی نے خسرو کی اور بھی قدر و منزلت کی، انہیں امیر کا لقب دیا اور مصحف دار کا عہدہ تفویض کیا۔ اس کے ساتھ بارہ ہزار تنکہ سالانہ کا وظیفہ بھی ان کے لیے مقرر کر دیا، اور انہیں اپنا خاص مصاحب اور ندیم بنا لیا۔ بادشاہ کا بڑھاپا تھا لیکن اس کی محفلوں کی رونق اور چہل پہل ایسی تھی کہ شائد کیقباد کو بھی نصیب نہ ہوئی ہو۔ شراب ارغوانی کے دور خوب چلتے تھے، بڑے بڑے گویے اور موسیقی کے استاد آتے تھے اور امیر خسرو اور خواجہ حسن کی غزلیں سنا سنا کر حاضرین کو مسحور کیا کرتے تھے، ان میں محمد شاہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو علم موسیقی میں اپنے زمانے کا استاد سمجھا جاتا تھا۔ گانے والیوں میں فتوحہ اور نصرت خاتون خاص پایہ رکھتی تھیں اور ناچنے میں نصرت بی بی اور مہر افروز یگانہ عصر تھیں۔ ان دل کش اور خوش آئندہ صحبتوں میں ارباب علم و فضل کا مجمع بھی رہتا تھا اور شاعروں کو اپنے جوہر دکھانے کا اچھا موقع مل جاتا تھا۔ مورخ ضیاء الدین برنی کا ان دنوں آغاز جوانی تھا اور خوش قسمتی سے اسے بھی ان محلوں میں کبھی کبھی شرکت کا موقع مل جاتا تھا، اس نے جن حسرت بھرے الفاظ میں جوانی کی ان صحبتوں کا ذکر کیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ واقعی کس قدر دلفریب ہوں گی۔ وہ کہتا ہے: یہ بوڑھا گنہگار جو صحرائے ناامیدی میں سرگرداں ہے اور جواب بڑھاپے سے اتنا نحیف و لاغر ہو گیا ہے کہ ہوا کا ایک جھونکا یا دھویں کا ایک مرغولہ معلوم ہوتا ہے، جب ان مجلسوں کا ذکر لکھ رہا ہے تو اس کا جی یہ چاہتا ہے کہ گلے میں زنار پہن لے اور ماتھے پر برہمنوں کا ٹیکہ لگا لے، ان خوب رو جوانوں اور ان حسین عورتوں کی یاد میں جن کا ناچ و گانا اس نے اتنی مرتبہ دیکھا اور سنا ہے، ہاں میرا یہی جی چاہتا ہے کہ اپنے چہرے کو سیاہ کر لوں اور ان اقلیم حسن کے بادشاہوں اور آسمان خوبی کے سورجوں کا ماتم کرتا ہوا کوچۂ بازار میں نکل کر اپنے آپ کو ہدف ملامت و تذلل بنا لوں، اور ان کے غالب ہو جانے کے ساٹھ سال بعد نالہ و بکا کرتا ہوا

نکلوں، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالوں اور سر کے بال نوچ لوں اور ان کی قبروں کے پاس اپنی جان دے دوں۔[1]

جلال الدین کی نرمی اور دھیمی طبیعت سے زیادہ تر لوگ خوش تھے، لیکن اس کی وجہ سے بعض مفاد پرستوں کو سرکشی کا موقع بھی مل جاتا تھا، چنانچہ بعض ترک امرا اپنی مجلسوں میں کھلم کھلا اس کی ہنسی اڑاتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مغلوں سے لڑ لینا اور بات ہے اور ہندوستان پر حکومت کرنا اور۔ یہ فیروز کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بادشاہ کو سب خبریں ملتی رہتی تھیں لیکن وہ کوئی باز پرس نہ کرتا تھا بلکہ یہاں تک ہوا کہ جب چند امراء نے مل کر اسے قتل کرنے کی ناکام سازش کی اور وہ امراء گرفتار ہو کے اس کے حضور میں آئے تو اس نے اپنی تلوار کھول کر ان کے آگے ڈال دی اور کہا کہ اگر تم میں سے کسی کو میرے مارنے کی ہمت ہے تو شوق سے تلوار اٹھا کر مجھے قتل کر دے، اور جب شرمندگی اور ندامت سے ان لوگوں کو کوئی جواب نہ بن پڑا تو اس نے ان سب کو معاف کر دیا اور وہ رہا کر دیئے گئے۔ حالانکہ اس پر بادشاہ کے مشیر کار بہت معترض بھی ہوئے۔
پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ فیروز خلجی نے حکومت کو سنبھالنے کے بعد ملک علاؤالدین کشلو خاں کو کڑے کا حاکم بنا دیا تھا اور ترک امراء کی طرح اس ملک کو بھی جلال الدین کی نرمی اور سادگی سے مغالطہ ہوا اور چونکہ بلبن کا بھتیجا ہونے کی حیثیت سے وہ ایک طرح تخت کا حقدار بھی تھا، اس نے اپنے دل میں بغاوت کی ٹھان لی۔ ہندوستانیوں کا ایک بڑا لشکر اپنے گردو پیش اپنی ضرب المثل داد و دہش سے اکٹھا کر کے اپنے خود مختار ہونے کا اعلان کر دیا اور طغرل کی طرح اپنا لقب مغیث الدین رکھا، یہی نہیں بلکہ کچھ عرصے بعد اس نے دہلی کی طرف چڑھائی بھی شروع کر دی۔ اس بغاوت کی خبر دہلی پہنچی تو جلال الدین نے اپنے منجھلے بیٹے ارکلک خاں کو کچھ فوج دے کر فوراً آگے روانہ کیا اور خود باقی فوج کے ساتھ انتظامات مکمل کر کے پیچھے پیچھے چلا۔ ارکلک خان تیزی سے بڑھتا ہوا جمنا اور گنگا کو پار کر کے دریا رہب (رام گنگا) کے کنارے جا پہنچا۔ ادھر سے کشلو خان بھی اس دریا تک اپنا لشکر لے کر آ گیا تھا۔ بادشاہی فوج دریا کے ایک کنارے پر اور ملک چھجو کی دوسرے کنارے پر تھی۔ چند روز دونوں فوجیں اسی طرح آمنے سامنے پڑی رہیں۔ اب بادشاہ کی اپنی فوج بھی قریب آ گئی تھی اور اس کی آمد کی خبر سن کر کشلو خاں نے حوصلہ ہار دیا اور ایک دن رات کے اندھیرے میں بھاگ نکلا۔ ارکلک خاں نے پیچھا کیا اور اسے جا پکڑا۔ وہ اور اس کے ساتھی

گرفتار ہوئے اور انہیں بادشاہ کے حضور پیش کیا گیا اس طرح کہ وہ اونٹوں پر سوار تھے، ہاتھ دوشاخوں میں بندے ہوئے، چہروں پر سیاہی ملی ہوئی اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے ان کی یہ حالت دیکھی تو فوراً چلا اٹھا، یہ کیا تماشا بنایا ہے، دوشاخے فوراً کھول دو۔ اس کے بعد انہیں اونٹوں پر سے اتار کر حمام میں بھیج دیا گیا۔ جب نہا دھو کر اور نئے کپڑے پہن کر وہ پھر بادشاہ کے حضور میں آئے تو بادشاہ نے انہیں عذر و معذرت کا موقع ہی نہیں دیا بلکہ انہیں اپنے پاس بیٹھا کر ان کے ساتھ شراب پیتا رہا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ان سب کی جان بخشی کا اعلان کر کے کشلو خاں کو ملتان کا حاکم بنا دیا[2] ایسی فیاضی اور نیک نفسی کی مثال اس زمانے کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ تقدیر کے کرشمے دیکھو کہ یہی رحمدل اور فرشتہ خصلت بادشاہ تھا جسے خود اس کے اپنے بھتیجے نے ایسی دغا بازی اور بے رحمی سے قتل کیا، یہ قصہ ابھی آگے آئے گا۔

فیروز خلجی کی اس مہم میں خسرو بھی اس کے ہمراہ تھے اور اپنے چشم دید واقعات کو انہوں نے مثنوی مفتاح الفتوح میں بہت خوبی سے بیان کیا ہے۔ ایک اور مہم جس کا اس مثنوی میں ذکر ہے، لیکن جس میں بظاہر خسرو شریک نہ تھے، جھابن کے مضبوط قلعے کے خلاف تھی۔ یہ مقام رنتھمبور کے مشہور قلعے کے قریب تھا۔ بادشاہ جب کشلو خاں کی سرکوبی کے بعد دہلی کی طرف واپس آیا تو سیری ہی میں مقیم رہا اور جھابن کے خلاف چڑھائی کی تیاریاں مکمل کرنے میں مصروف رہا۔ آخر شاہی لشکر سیری سے لہراوت اور چندیری وغیرہ ہوتا ہوا جھابن کے سامنے پہنچا۔ راجہ تو اس کی آمد کی خبر سن کر بھاگ گیا، لیکن اس کے سپہ سالار ساہنی یا ساہنین نے خوب بہادری سے مقابلہ کیا۔ آخر شکست کھائی اور گرفتار ہوا۔ لوٹ کا بہت سا مال حملہ آوروں کے ہاتھ لگا۔ بادشاہ نے ایک ملک کو راجہ کے تعاقب میں روانہ کیا اور خود سیری کی طرف واپس آ گیا۔ جھابن کی تسخیر کے بعد ترک امراء یہ چاہتے تھے کہ رنتھمبور کے قلعے پر چڑھائی کی جائے، لیکن بادشاہ، جو فطرتاً بھی تساہل پسند واقع ہوا تھا اور جواب بڑھاپے کی وجہ سے اور بھی اس طرح کے دشوار کاموں سے گھبرانے لگا تھا، راضی نہ ہوا اور باوجود اپنے مشیروں کی انتہائی کوشش کے رنتھمبور کو سر کرنے کا اس نے کبھی خیال نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خسرو نے بھی اس زمانے میں اپنے کئی ایک قصیدوں میں بادشاہ کی طبیعت میں اولوالعزمی اور تسخیرِ ممالک کا شوق اور جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً اپنے ایک قصیدے میں لکھتے ہیں:

اے علم بالا زدہ ملک جہاں خواہی گرفت
چو خراساں بستدی ہندوستان خواہی گرفت

لیکن فیروز خلجی پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ پہلے دونوں بڑے بیٹوں خان خانان اور ارکلیک خان کو جھابن کی فتح کی خوشی میں سنہری دور باش اور چھوٹے بیٹے ابراہیم قدر خاں کو خلعت اور چتر عطا کیا اور دوسرے شہزادوں اور امراء کو بھی حسب مراتب انعام و اکرام دیا۔ اس کے بعد وہ اطمینان سے دہلی میں مقیم ہو گیا۔

مگر یہ اطمینان اور عافیت صرف چند روزہ تھی۔ اس کا پیمانۂ حیات اب لبریز ہو چکا تھا اور بجائے اس کے کہ وہ خود ہی چھلک جاتا، اس کے ایک اپنے عزیز قریب کے بے درد ہاتھوں نے اسے زمین پر پٹخ کر پاش پاش کر دیا۔ علاؤالدین خلجی، فیروز خلجی کا بھتیجا بھی تھا اور داماد بھی، فیروز خلجی نے اسے کڑا مانک پور کا حاکم بنا دیا تھا اور وہاں اس نے اپنے پاؤں خوب مضبوطی سے جما لیے تھے۔ ان ترک امراء کو جو فیروز خلجی سے برگشتہ خاطر رہتے تھے، اس نے اپنے گرد و پیش جمع کر کے ایک خاصا جتھا قائم کر لیا تھا۔ دلیر اور اولوالعزم بھی انتہا کا تھا اور اپنے مستقر حکومت کے اردگرد کے علاقوں پر اکثر تاخت کرتا رہتا تھا۔ سنہ 691ھ کا ذکر ہے کہ اس نے بھیلسا کے علاقے پر چھاپا مار کر بہت سا مال و دولت اور ہاتھی گھوڑے لوٹ لیے اور انہیں لا کر اپنے چچا فیروز خلجی کی خدمت میں پیش کیا۔ بھتیجے کی اس سعادت مندی سے بادشاہ بہت خوش ہوا اور اگر کبھی اس کے نیک دل میں علاؤالدین کی طرف سے کوئی شبہ بھی پیدا ہوتا تھا تو اس سے دور ہو گیا۔ چچا کو خوش اور مہربان دیکھ کر علاؤالدین نے یہ درخواست کہ اسے چندیری کے علاقے پر مزید تاخت کی اجازت دے دی جائے۔ بادشاہ نے منظور کر لیا اور علاؤالدین دہلی سے روانہ ہو گیا۔ دہلی کا قیام اسے ہمیشہ ناگوار ہوا کرتا تھا۔ اس لیے کہ اس کی ساس یعنی ملکۂ جہاں بہت سخت گیر اور مغرور عورت تھی اور علاؤالدین اس سے اکثر نالاں رہتا تھا۔ اس لیے اس درخواست کی تہ میں دہلی سے کسی طرح دور چلے جانے کی خواہش مضمر تھی۔ اس کے علاوہ لوٹ مار سے اور روپیہ حاصل کر کے اپنی طاقت کو بڑھانا بھی مقصود تھا۔

علاؤالدین دہلی سے یہ بہانہ کر کے چل دیا کہ چندیری پر چڑھائی کرے گا، لیکن اس نے

دہلی سے تھوڑی دور جا کر ہی دوسرا راستہ اختیار کیا یعنی سیدھا کڑے پہنچا اور وہاں جا کر فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو بغیر کسی پر یہ ظاہر کیے کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے، پامال شاہراہوں کو ترک کر کے جنگلوں کے راستے دیو گیر یا دیو گڑھ کا رخ کیا۔ برار اور دکن کا علاقہ اب تک ترکوں کی تاخت سے بچا رہا تھا اور یہاں کے راجہ امن وامان سے اپنے اپنے علاقوں پر حکومت کرتے رہے تھے۔ اس خلفشار کا اثر، جو شمالی ہندوستان کے بہت سے علاقوں کو تہ و بالا کر چکا تھا، اب تک ہندوستان کے اس حصے میں نہ پہنچا تھا اور اسی لیے یہاں کے شہروں میں بے انتہا مال و دولت، ہاتھی گھوڑے، ہیرے جواہرات موجود تھے، جو صدیوں کی حکومت اور امن وامان کی پیداوار تھے۔ علاؤالدین ان شہروں کے حالات سنتا رہا تھا اور وہاں کی دولت کے قصے سن کر عرصے سے اس فکر میں تھا کہ کسی طریقے سے انہیں اپنے قبضے میں لے آئے۔ ان شہروں میں دیو گیر خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس لیے کہ یہ ایک مضبوط فوجی مقام بھی تھا اور صنعت وحرفت کا بڑا مرکز بھی۔ روپیہ پیسہ یہاں حد سے زیادہ تھا اور اسی مناسبت سے مسلمانوں کی فتح کے بعد اس کا نام دولت آباد ہو گیا۔ غرض علاؤالدین خلجی جب یلغار کرتا ہوا دیو گیر کے بالکل سامنے آ گیا تو راجہ کو اس کے آنے کی خبر ملی۔ اس گھبراہٹ اور سراسیمگی میں ظاہر ہے وہ کیا مقابلہ کر سکتا تھا، لیکن دیو گیر کو سر کرنا بھی آسان نہ تھا۔ اس لیے علاؤالدین نے یہ ترکیب کی کہ اس شہر کو گرد و پیش کے علاقے سے بالکل منقطع کر کے رسد و رسائل کے سب راستے مسدود کر دیئے۔ اگرچہ راجہ کے بیٹے نے بہت دادِ مردانگی دی، لیکن آخر کار مجبوراً ہار ماننا پڑی اور علاؤالدین نے جو کڑی شرطیں پیش کیں وہ سب منظور کر لیں۔ دیو گیر کی مال و دولت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ علاؤالدین کو وہاں سے جو ہاتھ لگا اس میں یہ چیزیں بھی شامل تھیں۔ چھ سو من آدھ سیر سونا، سات من موتی، دو من ہیرے، زمرد اور یاقوت، ایک ہزار من چاندی، ریشمی کپڑوں کے بے شمار تھان اور ہاتھی اور گھوڑے۔ یہ سب سامان اتنا قیمتی تھا کہ بقول احمد چپ، جو فیروز خلجی کا وفادار وزیر اور مشیر کار تھا۔ اس سے سات سلطنتوں کی بنا ڈالی جا سکتی تھی۔ جب علاؤالدین یہ سب مال و دولت لے کر کڑے کی طرف واپس جا رہا تھا تو اس وزیر نے فیروز خلجی کو آنے والے خطرے سے متنبہ کرنے کی بہت کوشش کی اور اسے یہ مشورہ دیا کہ علاؤالدین کو راستے ہی میں روکنے کی ترکیب کی جائے، لیکن صاف باطن اور نیک طبیعت فیروز نے اس کی ان باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی اور علاؤالدین کی

طرف سے اس کے دل میں شبہ یا ملال پیدا نہیں ہوا بلکہ وہ اس امید میں رہا کہ علاؤالدین کڑے سے دہلی آ کر یہ سب خزانہ اس کے سامنے پیش کرے گا۔

ادھر علاؤالدین جب اطمینان سے اپنے مستقر میں پہنچ گیا تو اس نے فریب اور چاپلوسی سے پُر خط اپنے چچا کو لکھنے شروع کیے اور یہ ظاہر کیا کہ وہ بادشاہ کی قدم بوسی کو دہلی آنا چاہتا ہے، لیکن چوں کہ اس کی بغیر اجازت دیوگیر پر چڑھائی کی تھی، اس لیے شرمندگی اور خوف سے ہمت نہیں ہوتی۔ اس کا بھائی الماس بیگ جو بعد میں اولوغ خاں کے لقب سے مشہور ہوا، دہلی میں موجود تھا۔ یہ بھی فیروز خلجی کا داماد تھا اور اس کے خلاف سازش میں اپنے بھائی کا شریک کار، اس نے علاؤالدین کے خوف اور ہراس کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا شروع کیا کہ وہ تو بادشاہ کی زیارت کے لیے بے قرار ہے لیکن اپنے کیے پر بے انتہا نادم ہے۔ اسی لیے ہر وقت رومال میں زہر رکھتا ہے تا کہ اگر بادشاہ کی طرف سے ذرا بھی خفگی کا اظہار ہو تو زہر کھا کر اپنی جان دے دے۔ غرض ان دونوں بھائیوں نے جلال الدین کو اتنا بے وقوف بنایا کہ وہ ان کے کہنے سے اس پر راضی ہو گیا کہ وہ خود کڑے جائے گا اور علاؤالدین سے مل کر اس سے اپنی خوشنودی کا اظہار اور اس کی خطاؤں سے درگزر کرنے کا اعلان اپنے منہ سے کرے گا۔ چنانچہ وہ ایک مختصری جمعیت کے ساتھ کڑے روانہ ہو گیا۔ اس ملاقات کا جو نتیجہ ہوا وہ تاریخ کے اوراق میں مفصل درج ہے۔ دغا اور فریب کی ایسی مکمل کامیابی کی مثال کم ملے گی۔ بوڑھا فیروز خلجی نہ صرف اپنی جان سے گیا بلکہ اس کے جائز وارث بھی تخت و تاج سے محروم ہو گئے۔

یہ افسوس ناک واقعہ دریا کے ایک کنارے پر ظہور میں آیا، دوسرے کنارے پر فیروز خلجی کا وزیر احمد چپ اس تھوڑی بہت فوج کے ساتھ تھا جو بادشاہ کے جلو میں تھی اور اس نے مصلحت اسی میں سمجھی کہ فوراً دہلی کی طرف روانہ ہو جائے۔ ادھر دلی میں اس حادثے کی خبر پہنچی تو ملکۂ جہاں کو بہت تشویش ہوئی۔ بڑے بیٹے خان جہاں کا تو پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا دوسرا بیٹا ارکلک خاں جو سب بھائیوں میں زیادہ قابل اور جری تھا، ملتان میں تھا۔ اس لیے ملکہ نے سب سے چھوٹے بیٹے رکن الدین ابراہیم قدر خاں کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا اور جو امراء دہلی میں تھے انہوں نے بھی اس فیصلے کو منظور کر لیا۔ یہ خبر ارکلیک خاں کو ملی تو اسے چھوٹے بھائی کی بادشاہت اور اپنی محرومی شاق گزری۔ چنانچہ ناراض ہو کر وہ ملتان ہی میں بیٹھا رہا اور اس نے علاؤالدین کے خلاف کوئی

فوری کارروائی کرنے کی طرف توجہ نہ کی۔ ادھر علاؤالدین اپنے چچا کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد فوراً دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ مال و دولت جو اسے دیوگیر سے حاصل ہوئی تھی اب اس کے خوب کام آئی۔ کڑے سے لے کر دہلی تک وہ بڑا روپیہ بانٹتا ہوا چلا۔ گویا اپنی اس داد و دہش سے اس کلنک کے ٹیکے کو دھونا چاہتا تھا جو اس بے رحمانہ قتل سے اس کے ماتھے پر لگ گیا تھا۔ دہلی کے قریب پہنچا تو حکم دیا کہ سواری کے آگے منجنیق سے سونے چاندی کی بارش ہوتی چلے۔ ہزارہا لوگ روپے کی لالچ میں جوق در جوق چلے آتے تھے اور علاؤالدین کی سخاوت اور دریا دلی کے قصے دہلی پہنچ رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس ناشکرگزاری اور احسان فراموشی کی وجہ سے، جو انسان کی فطرت میں مضمر ہے، لوگ سونے کی دل کش آب و تاب کو دیکھ کر اس خون آلود سر اور سفید داڑھی کو بھول گئے جو نیزے کی نوک پر سے انتقام کے لیے فریادی تھی۔ امیر خسرو نے علاؤالدین کی کڑے سے دہلی کی طرف یلغار کا ایک مثنوی میں ذکر کیا ہے۔ اسی میں کہتے ہیں:

کشیدہ ازکرہ تیغ فتح آختہ
بفتح افگنی رایت افراختہ
بہ یک دست آہن بہ یک دست زر
ازاین تاج داد و ازان بودسر [3]

غرض یہ کہ خوف اور لالچ نے دہلی کے امراء کو علاؤالدین کی طرف مائل کر دیا اور وہ اس سے ملنا شروع ہو گئے۔ اس مضمون کو خسرو نے مثنوی عشقیہ میں یوں باندھا ہے۔

ملوک وہ خان زاندازہ فزوں بود
کہ ہر یک تخت رکنی راستون بود
زبانگ زر کہ در رقص آورد پای
ستونہا جملہ در رقص آمد از جلی
ستونہا چوں سوی تخت دگر راند
زارکان تخت رکنی بے ستون ماند

اب بیچارے رکن الدین اور اس کی ماں کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ ارکلیک خاں کے پاس ملتان میں پناہ لیں۔ چنانچہ یہ دونوں وہیں چلے گئے اور 22 ذی الحجہ سن 695ھ کو علاؤ الدین باقاعدہ دہلی میں تخت نشین ہو گیا۔

امیر خسرو کو اپنے ولی نعمت فیروز خلجی کا قتل گراں گزرا ہوگا، لیکن بہ حیثیت ایک درباری مصاحب اور شاہی ندیم کے انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار مناسب نہ سمجھا، برخلاف اس کے جدھر ہوا کا رخ دیکھا ادھر وہ بھی مڑ گئے۔ بلکہ قرآئن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی علاؤ الدین بادشاہ ہوا بھی نہ تھا کہ انہوں نے اس کی مدح سرائی شروع کر دی تھی اس لیے کہ ایک مثنوی میں علاؤ الدین خلجی کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔[4]

نہ من بودم از طبع دریا نشان
جلوس ترا اولین درفشاں؟
مبارک زبانی من بیں کہ بخت
بدرگاہ دہلی ترا داد تخت

قسمت کے فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا اور ایک بادشاہ کے بعد دوسرے کی تعریف اور ستائش شروع کر دینا شاید چنداں قابلِ اعتراض نہیں۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ خسرو نے فیروز خلجی کے بیٹوں کی مصیبت اور ادبار کا ذکر ایسے پیرائے میں کیا ہے جو یقیناً کسی منصف مزاج آدمی کے لیے اور خصوصاً خسرو کے لیے، جو ان کے زیر بارِ احسان رہ چکے تھے، شایانِ شان نہیں ہو سکتا، چنانچہ خزائن الفتوح میں کہتے ہیں کہ:

''جتنے خوش نصیب لوگ تھے سب نے بادشاہ کے آگے گردن جھکا دی، ایک بد بخت میر ملتان (ارکلیک خاں) باقی رہ گیا، چونکہ یہ دشمن اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا کہ بادشاہ خود اس کے خلاف چڑھائی کرتا، اس لیے اولوغ خان اس رکاوٹ کو راستے سے دور کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ ایک لشکرِ جرار جو ستاروں کی طرح منظم تھا اور جس سے آسمان بھی پناہ مانگتا تھا برستے ہوئے بادلوں کی طرح، دنیا کو موجِ تیغ سے غرقاب کرتا ہوا

آگے بڑھا۔ جب دشمن کو اس فوج کی آمد کی خبر ملی تو اس نے چیونٹی کی طرح اپنے کو ادبار کی دیوار میں پوشیدہ کرلیا (یعنی قلعہ بند ہوگیا) اور اولوغ خاں اپنا کام کرنے آگے بڑھا، وہ قلعے کی فصیلوں تک پہنچ گیا اور چاہتا تھا کہ دشمن کو قعرِ ہلاکت میں گرادے اور اس کو اپنے قلعہ شکن آلات کے صدموں سے سرنگوں کردے، لیکن پھر اسے یہ خیال آیا کہ دونوں طرف کے لڑنے والے مسلمان ہیں اور اس نے اپنے غصے کو ذرا دھیما کیا۔ قلعے میں جو لوگ محصور تھے، انہوں نے بھی یہ مناسب نہ سمجھا کہ ذرہ، آفتاب کی برابری کا دعویٰ کرے۔ لہٰذا دو تین ہفتے کے مقابلے کے بعد ہی وہ اپنے گمراہ سردار سے بیزار ہوگئے۔ قلعہ بند فوج کے افسر آپس میں مشورے کے بعد پناہ اور اماں مانگتے ہوئے باہر نکلے۔ اب دشمن (ارکلیک خاں) کو بھی اندیشہ پیدا ہوا اور اس نے خلوت نشینوں سے مدد کی درخواست کی۔ ان بزرگوں میں سے ایک دونوں شہزادوں کو اپنے ساتھ لے کر آئے اور شاہی فوج کے سپہ سالاروں کے سپرد کردیا، اس طرح خاں مبارک فتح اور کامیابی کے ساتھ درگاہ بادشاہی کی طرف واپس لوٹ آیا۔''

خلوت نشینوں سے خسرو کی مراد ملتان کے صوفیہ کرام ہیں۔ شہزادوں کو یہ خیال تھا کہ ان لوگوں کی سفارش اور توسط سے ان کی جان بخشی ہوجائے گی۔ چنانچہ شیخ صدرالدین کے بیٹے شیخ رکن الدین، اولوغ خاں سے ملے اور جب اس نے ان شہزادوں کی جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کرلیا تو انہیں اپنے ساتھ لاکر اس کے حوالے کردیا۔ خسرو نے یہ نہیں بتایا کہ ان بدنصیب شہزادوں کا انجام کیا ہوا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہیں دہلی لاکر پہلے تو اندھا کرکے قید کردیا گیا اور اس کے کچھ عرصہ بعد انہیں چپ چپاتے قتل کردیا گیا۔ ارکلیک خاں کے دو خوردسال لڑکوں کا بھی یہی حشر ہوا اور اس طرح جلال الدین کی اولاد میں سے کوئی بھی تخت کا دعوے دار نہ رہا۔ خسرو کا وہ قصیدہ، جس میں انہوں نے علاؤالدین کو وہ خوشخبری یا مژدہ سنایا تھا جس کا ذکر مندرجہ بالا اشعار میں کیا ہے، ان کے دیوان غرۃ الکمال میں موجود ہے۔ اس میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں کہ:

''خدا کرے کہ تو دہلی کے خطبے کی عزت سے سرفراز ہو۔ میں یہ فال نیک تو قرعۂ آسمان سے

لیتا ہوں۔" یہی خسرو جلال الدین کی زندگی میں اس کے دوام سلطنت اور عروج اقبال کی دعائیں کئی مرصع قصیدوں میں مانگ چکے تھے، چنانچہ ایک قصیدے میں جو خاقانی کے ایک مشہور قصیدے کی طرز میں لکھا گیا ہے، یوں سخن پیرا ہوتے ہیں:

"اگر استاد خاقانی شیرواں کی شان و شوکت پر فخر کرتا تھا تو میں ہندوستان کے جاہ و حشم پر نازاں ہوں۔ اس کے بادشاہ جلال الدین کا تاج اور اس کی شان و شوکت اب خاک میں مل چکی ہے، مگر خدا کرے ہمارا جلال الدین اس عظیم الشان سلطنت کے سر پر ہمیشہ قائم رہے، اور ہماری ثناء اور ستائش سے اس کی سخاوت کے کارنامے دنیا کی تاریخ میں ثبت ہو جائیں۔"[5]

لیکن خسرو کے اس طرزِ عمل کا ہمیں سختی سے جائزہ نہیں لینا چاہیے اس لیے کہ یہ قصیدے ان کی درباری زندگی کا ایک جزو تھے۔ ان سے شاعر کے اصل جذبات کا اندازہ ہرگز نہیں لگایا جاسکتا۔ باقی رہا یہ سوال کہ اگر دل میں وہ علاؤالدین کے فعل کو قابلِ نفرت خیال کرتے تو اس کی خوشامد میں یوں رطب اللسان کیوں ہوتے اور کیوں اس کی ملازمت اختیار کرتے۔ اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ بھی امیر تھے اور اس حیثیت سے اپنے زمانے کے اور امراء کے طرزِ عمل سے ان کا رویہ مختلف نہیں ہو سکتا تھا۔"

چھٹا باب

علاؤالدین کا دورِ حکومت، خسرو سے اس کا سلوک، اس بادشاہ کے عہد میں خسرو کا اپنے منتہائے کمال کو پہنچنا، دیوان غرۃ الکمال کی ترتیب اور خمسہ وغیرہ کی تصنیف

علاؤالدین نے بادشاہ بننے کے بعد کچھ عرصہ تک خوب دادِ عیش وطرب دی۔ لیکن اس کے بعد اسے اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہوا اور اس نے امورِ سلطنت کی طرف اپنی توجہ مصروف کی۔ دہلی کے تخت پر ایسی آسانی سے قبضہ ہو جانے کی وجہ سے اس کا حوصلہ بلند ہو گیا تھا اور ہمت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ اب اس کے دماغ میں خبط سمایا کہ سکندر اعظم کی طرح دور دور کے ملکوں کو تسخیر کے لیے نکلے، اور اسی لیے اپنا لقب اسکندر ثانی تجویز کیا۔ ایک نئے مذہب کی بناڈالنے کا بھی کچھ دنوں شوق رہا۔ لیکن غنیمت ہے کہ نہ تو اس نے اکبر کی طرح واقعی کوئی دین الٰہی قائم کیا اور نہ ہی اس کی نوبت آئی کہ محمد تغلق کی طرح چین اور تبت کی فتح کے لیے کوئی مہم روانہ ہوتی۔ اس کے مشیر اور وزیر سمجھ دار لوگ تھے اور انہوں نے بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ ابھی ایک طرف تو مغلوں کے حملوں سے ہندوستان کا بچاؤ کرنا ہے اور دوسری طرف خود اس ملک میں اپنی سلطنت اور حکومت بڑھانے کی کافی گنجائش موجود ہے اور یہ بات علاؤالدین کی سمجھ میں آ گئی۔

اس کے عہد میں مغلوں کے کئی حملے ہوئے۔ پہلے تو سنہ 697ھ میں ایک مغل سردار کدر نامی جودی پہاڑ کے راستے بیاس، جہلم اور ستلج کو پار کر کے قصور اور جالندھر (جارن منجور) کے علاقوں پر حملہ آور ہوا۔ وہاں خوب لوٹ مچائی، لیکن اولوغ خاں نے مغلوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اس کے بعد سنہ 698ھ میں ایک اور سردار قتلغ خواجہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور دہلی کے بہت قریب آ پہنچا، چنانچہ خسرو ''عشقیہ'' میں کہتے ہیں:

ازاں پس بود قتلغ خواجہ گستاخ
قوی تر شجرۂ معلونہ راشاخ
بعد کتلغ آمد کافر آں سال
شہ آن جرأت مبارک دید درفال

اس مرتبہ بادشاہ کو خود مغلوں سے مقابلے کے لیے نکلنا پڑا۔اب کے بھی شاہی فوجوں کو فتح حاصل ہوئی، لیکن لڑائی میں علاؤالدین کا ایک بہت بہادر سپہ سالار یعنی ظفر خاں مارا گیا۔تیسرا حملہ بہت سخت تھا اور توغی کی قیادت میں مغل دہلی تک آپہنچے۔انہوں نے شہر کو تقریباً محصور کرلیا۔شہر میں فوجوں کی بھی قلت تھی اور سامان خورد ونوش کی بھی، اس لیے بادشاہ اور رعیت دونوں بہت پریشان اور ہراساں تھے، لیکن معلوم نہیں کیا بات ہوئی کہ مغل دو مہینے کے محاصرے کے بعد خود بخود ہی اپنے ڈیرے خیمے اٹھا کر چل دیئے۔خوش عقیدہ لوگ اس واقعے کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی کرامات میں شمار کرتے ہیں، باقی خدا بہتر جانتا ہے۔تیسری مرتبہ سن 765ھ میں توغی، علی بیگ اور تورتاق ایک بڑی فوج لے کر حملہ آور ہوئے اور سوالک کی پہاڑیوں کا رخ کیا۔امروہے تک پہنچ کر قتل وغارت کا بازار گرم کیا۔اس مرتبہ ملک مانک، جو بعد میں ملک کافور کے لقب سے مشہور ہوا، ان کے مقابلے کے لیے بھیجا گیا اور اس نے مغلوں کو شکست فاش دی۔توغی تو پہلے ہی واپس چلا گیا تھا، علی بیگ اور توتاق دونوں قید ہوئے اور انہیں دہلی لایا گیا۔اگرچہ فرشتہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ہاتھیوں سے کچلوا کر قتل کیا گیا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی جان بخشی کی گئی اور وہ دہلی میں مقیم ہوگئے۔بعد میں ان میں سے ایک کسی بیماری سے فوت ہوگیا۔لیکن ان کے ساتھیوں پر اس قسم کا کوئی رحم نہیں کیا گیا بلکہ زیادہ تر کو تلوار کے گھاٹ اتار کر ان کے سروں اور دوسرے اعضاء سے سیری وغیرہ میں مینار بنائے گئے۔اس حملے کے تھوڑے ہی عرصے بعد کبک نے ہندوستان پر حملہ کیا اور ناگور تک پہنچ گیا۔اس مرتبہ بھی ملک کافور مقابلے پر گیا اور کبک خاں کو گرفتار کر کے دہلی لے آیا۔علاؤالدین کے عہد کا پانچواں مغل حملہ دو سرداروں اقبال اور شاہیوں کی سرکردگی میں ہوا، لیکن مغل سندھ کے پار زیادہ دور نہ آنے پائے تھے کہ ملک کافور اور ملک غازی (تغلق) نے انہیں سخت ہزیمت کے بعد بھگا دیا۔سینکڑوں مغل قید ہوئے، انہیں

دہلی لا کر یا تو ہاتھیوں کے پاؤں تلے روندا گیا یا قلعے کی دیواروں پر لٹکا دیا گیا اور بقول خسرو:

شد از حصار تاری و چینی آویزاں
چو زنگیاں نگو نسار از عمارت نو

اب کے بھی بد بخت مغلوں کے سروں سے ایک بڑا مینار کھڑا کیا گیا اور اس حملے کے بعد کم از کم علاؤالدین کے عہد تک مغلوں کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ پھر ہندوستان کا رخ کریں علاؤالدین کے بخت اور اقبال کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ اس کے ہندو غلام بھی مغلوں جیسی جری اور دلیر فوجوں کو یوں پے در پے شکستیں دے سکیں، چنانچہ خسرو بھی اپنے ایک قصیدے کے مطلع میں اسی خیال کو یوں ظاہر کرتے ہیں: [1]

اے لوائے فتح و فیروزی بہ چار ارکان زدہ
بندگان ہندوت برقلب ترکستان زدہ

ایک اور جگہ کہتے ہیں: [2]

بہ ترکستان چناں ہندی نمودہ
کہ از ترکان بہ ہندی ربودہ

بادشاہ کی ان کامیابیوں سے رعایا کے دلوں میں اس کی قدر و منزلت اور زیادہ ہوگئی۔ مغلوں کو جس بُری طرح قتل کیا گیا، اس کا منظر دیکھ کر لوگ خوش ہوتے تھے اور ان زبردست دشمنوں کی تذلیل و توہین پر دہلی اور ہندوستان کے اور شہروں میں شادیانے بجتے تھے۔ خسرو بھی، معلوم ہوتا ہے کہ، ان وحشی مغلوں سے خاص طور پر متنفر تھا، جس کی وجہ غالباً وہی ملتان کا واقعہ ہے جس میں وہ گرفتار ہو گئے تھے، چنانچہ خزائن الفتوح میں یوں لکھتے ہیں:

"خدا کا شکر و احسان ہے کہ میں نے ان کتوں کو اونٹوں پر بندھا ہوا دیکھا جن کے ہاتھوں اونٹ بھی فریادی تھے، اگر اب سے پہلے "شتر گربہ" ایک عام مثل تھی تو اب سے "شتر سگ" کی مثل دنیا میں مشہور ہو جائے گی، ان

کی گردنوں میں جو دو شاخ پڑے ہوئے تھے وہ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کوئی عاشق زاد اپنے معشوق کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے ہو۔اسی طرح اعجاز خسروی میں لکھتے ہیں کہ:"وہ بے سر جو ہر سال تمرتیق کے پاس سے بختی کی زنجیریں لے کر ہندوستان سے قیدی پکڑنے کے لیے آیا کرتے تھے،خود یا تو تیغ تیز سے کٹ کر ٹکڑے ہو گئے اور جہنم رسید ہوئے یا قید کر کے ان کی جان بخشی کی گئی۔لیکن چونکہ جن لوگوں کو اس طرح چھوڑ دیا گیا تھا انہوں نے اپنی زنجیریں توڑنے کی کوشش کی اور فساد برپا کیا تو بادشاہ نے یہ حکم دیا کہ ان میں سے بعض کو دریا میں پھینک دیا جائے اور بعض کی گردنوں سے خون کی بارش زمین پر کی جائے اور ان کے گندم گوں جسموں کو زمین میں دبا دیا گیا اور ان کی خاکستر سے گلاب اور مرغ کیس کے پھول کھلنے لگے۔اس کے بعد ان مریخی کتوں کے سروں سے ایک مینار (دہلی) میں تعمیر کیا گیا اور ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ایسے ہی مینار کھڑے کیے گئے۔"[3]

لیکن علاؤالدین جب مغلوں کی روک تھام کر رہا تھا اور سرحدی قلعوں کو مستحکم اور مضبوط بنانے کی فکر میں تھا تو اس نے ہندوستان کے ان حصوں کی فتح کے خیال کو بھی فراموش نہیں کیا جو اب تک دہلی کی سلطنت کے زیرِ نگیں نہ تھے۔اس سلسلے میں سب سے پہلے سنہ 698ھ میں اولوغ اور نصرت خاں کو گجرات کی طرف روانہ کیا گیا۔بادشاہی فوج ابرِ باراں کی طرح بڑھتی ہوئی سومنات پہنچی اور بہت سا مالِ غنیمت اسے ہاتھ لگا۔اس کے بعد کھنبایت اور نہروالہ پر یورش کی گئی اور ان دونوں جگہوں کو تسخیر کر لیا گیا،آخر میں رنتھنبور کے مستحکم قلعے کا محاصرہ ہوا۔یہاں کے راجہ نے بہت بہادری سے مقابلہ کیا اور تیغ ہندی کے خوب جوہر دکھائے لیکن پانچ مہینے کے محاصرے کی سختیاں جھیلنے کے بعد اسے راجپوتوں کی قدیم روایت کے مطابق جوہر کی رسم ادا کرنا پڑی۔عورتوں کو سپردِ آتش کر کے راجہ خود لڑتا ہوا مارا گیا۔شاہی سپہ سالار اب بہت سا مالِ غنیمت ہاتھی،گھوڑے اور لونڈی غلام لے کر دارالسلطنت کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔اس مالِ غنیمت میں نہروالہ کے راجہ کرن کی خوب صورت رانی کنولہ دی یا دیوی بھی جو بعد میں علاؤالدین کے حرم

میں داخل ہوئی اور ملک مانک بھی، جسے بادشاہ نے اپنا مقرب خاص بنا کر ملک کافور کا لقب دیا۔

اس کامیابی کے بعد سنہ 702ھ میں بادشاہ خود چتوڑ کی تسخیر کے لیے روانہ ہوا اور اس مہم میں خسرو بھی بادشاہ کے ہمرکاب تھے۔ اس مضبوط مقام کو سر کرنا آسان نہ تھا۔ بادشاہ 8 جمادی الثانی کو دہلی سے روانہ ہوا اور 11 محرم کو قلعہ فتح ہوا۔ اس عرصے میں محاصرین کو برسات کی وجہ سے خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ خسرو بھی گھبرا اٹھے کیونکہ خزائن الفتوح میں کہتے ہیں کہ:

> ''میں جو کہ اس سلیمان کا ہُد ہُد ہوں، ساتھ تھا اور اگرچہ لوگوں نے مجھے کئی بار کہا کہ میں دہلی واپس چلا جاؤں، میں برابر وہیں رہا۔ اس لیے کہ مجھے اپنے آقا کی ناراضگی کا ڈر تھا کیونکہ اگر وہ کہیں پوچھ بیٹھتے کہ کیا بات ہے مجھے کہیں ہُد ہُد نظر نہیں آتا؟ کیا وہ کہیں چل دیا ہے؟ تو مجھے خطرہ تھا کہ مجھ سے کوئی معقول جواب نہ بن پڑے گا اور بادشاہ کے اس حکم کی کہ ''اسے کوئی بیّن وجہ اس غیر حاضری کی پیش کرنا چاہیے۔'' میں تعمیل سے قاصر رہوں گا۔''

اس طرح خسرو نے چتوڑ کی مہم کے سب واقعات اپنی آنکھ سے دیکھے۔ قلعے کی تسخیر کے بعد راجہ کی جان بخشی ہوگئی، لیکن چتوڑ کا قلعہ اس سے چھن گیا۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے خضر خان کو اس کا حاکم بنا کر اسے دور باش اور چتر لعل عطا کیا اور شہر کا نام بجائے چتوڑ کے خضر آباد رکھا گیا۔

ان فوجی مہموں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد علاؤالدین ملک کے انتظام اور امن و امان قائم کرنے میں مشغول ہوا اور اپنے وزیروں سے مشورہ کیا کہ سلطنت میں بے چینی اور بدنظمی کے بڑے اسباب کیا ہو سکتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ شراب اور دولت کی افراط سے زیادہ تر خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ علاؤالدین نے دل میں ٹھان لی کہ شراب خوری اور دولت کی کثرت کو ہر ممکن طریقے سے روکا جائے۔ پہلے تو خود شراب ترک کی، اور اس کے بعد عام طور پر ملک میں اس کی ممانعت کردی۔ شراب کے ذخیرے جہاں بھی ملے ضبط کر لیے گئے۔ منوں شراب بازاروں اور گلیوں میں لنڈھا دی گئی یا ہاتھیوں کو پینے کے لیے دے دی گئی۔ چنانچہ مصنف تاریخ فرشتہ بظاہر بڑی حسرت سے کہتے ہیں کہ ''اس زمانے کے ہاتھی بھی کیا خوش قسمت تھے کہ انہوں

نے ایسی کامرانیاں کیں۔[4]

تاجروں اور سوداگروں کے پاس زیادہ روپیہ جمع ہونے کی روک تھام یوں کی گئی کہ بادشاہ نے سب چیزوں کے نرخ مقرر کر دیئے اور دہلی میں ایک بازار منڈی دارالعدل کے نام سے بنائی جس میں مقررہ نرخوں پر ہر قسم کی چیزیں مل سکتی تھیں۔ ناجائز نفع کما۔نے والوں کے لیے بہت سخت سزائیں مقرر کیں اور اس کی خاص نگرانی رکھی جاتی تھی کہ وہ کسی کو دھوکا نہ دے سکیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ علاؤ الدین پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس نے ہندوستان میں رعیت کی خوش حالی اور تاجروں کے ہتھکنڈوں سے غریب رعایا کے بچاؤ کی تدابیر سوچیں اور ان پر عمل پیرا ہوا۔ اس لیے جب خسرو یہ کہتے ہیں کہ ''عدل فاروقی کو سات سو سال انتظار کرنا پڑا جب جا کر اسے ایک نیا مربی ملا'' تو اس کو محض شاعرانہ بلند پروازی اور مبالغہ نہ سمجھنا چاہیے۔

اس طرح اگرچہ بظاہر علاؤ الدین خاص طور پر دیندار آدمی نہ تھا اور نہ غالباً اس میں کوئی مذہبی جوش تھا۔ لیکن ایک بیدار مغز حاکم کی طرح وہ یہ خوب جانتا تھا کہ اخلاق کی دوستی اور مذہبی عقائد کی استواری بھی سلطنت کے نظم ونسق کے لیے ایسی ہی ضروری ہے جیسے معاشرتی حالات کی اصلاح۔ ملک بھر میں عموماً اور دہلی میں خصوصاً کیقباد کے وقت سے لوگوں کی اخلاقی حالت بہت پست ہوگئی تھی اور وہ عیش وطرب کے ضرورت سے زیادہ گرویدہ ہوگئے تھے۔ اب بقول خسرو ''زنان بازاری جو اپنی حلقہ حلقہ زلفوں کا جال اِدھر اُدھر پھیلاتی پھرتی تھیں اور شہر میں جہاں جی چاہا ایلی گیلی پڑی پھرتی تھیں، مجبور کی گئیں کہ گھروں کی چاردیواری میں بیٹھیں، اور اب افسوس اور ندامت کے باعث وہ اپنے ہاتھ مل مل کر اپنے نقابوں کے تار بٹتی تھیں۔''

اسی طرح فرقہ اسماعیلیہ کے کچھ لوگ ہندوستان کے بعض حصوں میں آکر آباد ہوگئے تھے، اور اباحتیہ کے نام سے مشہور تھے، علاؤ الدین نے اس فرقے کا بھی قلع قمع کیا اور جادوگر اور جادوگرنیاں بھی جو بقول خسرو ''اپنے دانتوں کو بچوں کا خون پینے کے لیے تیز کیا کرتی تھیں، بادشاہ کی توجہ سے نہ بچیں، ان کو سخت سزائیں دی گئیں اور بعض کو سنگسار کر دیا گیا تا کہ وہ خون جو انہوں نے پیا تھا ان کی ناپاک کھوپڑیوں سے واپس نکالا جائے۔''[5]

علاؤ الدین کی اولوالعزمی نے شہر دہلی کی توسیع اور وہاں کی عمارتوں کی اصلاح اور تجدید کی طرف بھی خاص توجہ موڑی۔ سلطان التمش کے زمانے سے، جس نے قطب مینار، مسجد قوۃ الاسلام

اور شمسی حوض تعمیر کیا تھا، دہلی کے قدیم اور تاریخی شہر میں کئی تغیرات رونما ہو چکے تھے، غیاث الدین بلبن نے اپنی رہائش کے لیے رائے پتھورا کے پرانے قلعے، اندر پرت یا اندر پرستھ کو چھوڑ کر جہاں قطب الدین ایبک اور التمش نے سکونت اختیار کی تھی، اپنے لیے ایک اور قلعہ مرزغن کے نام سے بنوالیا تھا اور ایک محل بھی تعمیر کیا تھا جو قصرِ لعل کہلاتا تھا۔ اس کے بعد کیقباد نے کیلوگھری کو آباد کیا۔ یہ مقام ہمایوں کے مقبرے کے جنوب مشرق میں دریائے جمنا کے کنارے واقع تھا، اگرچہ اب جمنا کا رخ پلٹ جانے کی وجہ سے دریا سے دور ہو گیا ہے، یہی شہر بعد میں شہرِ نو کے نام سے مشہور ہوا۔ علاؤالدین نے سیری نام کا ایک قلعہ بنا کر گویا ایک اور نئے شہر کی بنیاد قائم کر دی۔ کچھ عرصے کے بعد دہلی کا پرانا شہر اور سیری مل کر ایک ہو گئے اور ان دونوں کے درمیان کا حصہ جہاں پناہ کہلانے لگا۔[6] مسجد قوۃ الاسلام کے صحن میں علاؤالدین نے اضافہ کیا اور ایک دروازہ جو عمارت گری میں فن کا ایک نادر نمونہ ہے اور آج کل علائی دروازہ کہلاتا ہے، تعمیر کیا۔ اس کے بعد اسے خیال آیا کہ قطب مینار کا ایک جواب تعمیر کیا جائے، جو گھیری اور بلندی میں قطب مینار سے بھی زیادہ ہو، اگرچہ یہ مینار نا تمام رہا اور ایک کھنڈر یا منزل سے زائد بلند نہ ہو سکا تھا کہ علاؤالدین کا دور ختم ہو گیا۔

ان تعمیرات کے لیے دور دور سے پتھر اور کاریگر حاصل کیے گئے تھے۔ ''ہند کے سنگتراش جو اپنے فن میں فرہاد کو مات کرتے تھے، پتھروں کو ایسا صاف اور چکنا بنا دیتے تھے کہ ان کی سطح پر سے خیال کا پاؤں بھی پھسل جائے۔ دہلی کے معمار، جو فنِ عمارت میں نعمان منذر کو بھی جاہل محض سمجھتے تھے، ایک پتھر کو دوسرے سے ایسی صفائی سے جوڑتے تھے کہ اندیشۂ رازی بھی ان کی درزوں میں سے نہیں گزر سکتا تھا۔'' حوض شمسی سے اس زمانے میں دہلی کے باشندے زیادہ تر ضروریات کے لیے پانی لیتے تھے۔ حوض میں مٹی بھرتے بھرتے پانی بہت کم رہ گیا تھا، اس لیے علاؤالدین نے اس کی صفائی کی طرف بھی توجہ کی اور بقول خسرو ہر مزدور کے ہاتھ نے عصائے موسیٰ کا کام کیا اور جلد ہی حوض پھر پانی سے پُر ہو گیا۔[7]

بادشاہ جب ان کاموں سے مطمئن اور فارغ ہوا تو اسے پھر دکن اور جنوبی ہندوستان کے زرخیز اور مالدار علاقوں کا خیال آیا۔ دیوگیر کا راجہ رام دیو جس نے علاؤالدین کے پہلے حملے کے وقت خراج اور تاوان دے کر اپنی گلوخلاصی کرائی تھی، ابھی زندہ تھا، لیکن چونکہ اس نے خراج کی

قسطوں کے ادا کرنے میں کچھ کوتاہی کی، اس لیے علاؤالدین کو ایک اچھا بہانہ ہاتھ لگ گیا اور سب سے پہلے ملک کافور کو سنہ 706ھ میں دیوگیر ہی کی طرف روانہ کیا گیا۔

دیوگیر پہنچ کر ملک کافور نے راجہ رام دیو کو تنبیہ اور فہمائش کی اور اسے اپنے ساتھ دہلی لے آیا جہاں وہ کوئی چھ مہینے مقیم رہا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اسے خلعت اور نیلا چتر دے کر اس کے ملک واپس بھیج دیا۔ اسی اثناء میں علاؤالدین خود سیوانے کی مہم پر روانہ ہوا۔ سیرانہ دہلی سے کوئی سو میل کے فاصلے پر واقع تھا، وہاں کے راجہ سیتل دیو نے سرکشی اختیار کر رکھی تھی۔ اس لیے علاؤالدین نے اس کے قلعہ کا محاصرہ کر کے اسے سر کیا اور سیتل دیو لڑتا ہوا مارا گیا۔

سنہ 709ھ میں ملک کافور جنوبی ہند کی تسخیر کے لیے بڑے ساز و سامان سے روانہ ہوا۔ دیوگیر پہنچنے سے پہلے گجرات کے راجہ کرن کی بیٹی دیول دی، الپ خاں حاکم گجرات کی سعی سے اس کے ہاتھ لگ گئی، اسے دہلی بھیج دیا گیا اور جب وہ وہاں پہنچی تو شہزادہ خضر خاں اسے دیکھ کر فریفتہ ہو گیا اور ان دونوں کے عشق و محبت کی وہ داستان شروع ہوئی جسے خسرو نے مثنوی خضر خاں و دیول رانی میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شروع میں خضر خاں کی ماں نہیں چاہتی تھی کہ اس کی شادی دیول دی سے ہو، چنانچہ اس نے اپنے بھائی الپ خاں کی لڑکی سے بیٹے کی شادی ٹھہرادی اور شہزادے کو مجبوراً ماں کا حکم ماننا پڑا۔ لیکن بعد میں اسے دیول دی سے بھی شادی کرنے کی اجازت مل گئی۔ ادھر کافور دیوگیر پہنچ کر کچھ عرصے راجہ کا مہمان رہا اور اس کے بعد اس نے وارنگل کا رخ کیا۔ انم کنڈا یا ہاتم کنڈا کے مشہور مقام تک پہنچ کر اس نے روداد یوا کو، جسے امیر خسرو نے لدر دیو الکھا ہے، شکست دی اور اسے مجبور کیا کہ وہ ہتھیار ڈال دے اور شاہی بارگاہ میں اظہار عقیدت و اطاعت کے لیے حاضر ہو۔ روداد یوا نے بجائے خود آنے کے اپنا ایک سونے کا بت بنوا کر اور اس کے گلے میں ایک رسی ڈال کر بھیج دیا اور بہت سے تحفے تحائف دینے کا وعدہ کیا۔ ملک کافور نے اس کی درخواست کو منظور کر لیا اور وہاں سے بے شمار مال غنیمت ہاتھی، گھوڑے، سونا، چاندی، جواہرات وغیرہ لے کر دہلی واپس آیا۔ اس کے تھوڑے عرصے بعد ہی علاؤالدین نے اسے دوبارہ جنوبی ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ اب کے معبر اور تلنگ کی تسخیر منظور تھی، چنانچہ شاہی لشکر پھر دیوگیر وارد ہوا۔ اس شہر کی فوجی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ ہر مرتبہ جنوب کی طرف جاتے ہوئے ملک کافور نے یہی راستہ اختیار کیا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے لحاظ سے بھی دیوگیر خاص حیثیت رکھتا تھا۔ امیر خسرو نے

اس شہر کی تعریف ''خزائن الفتوح'' میں کی ہے۔ جس کے بعض فقروں کا ترجمہ قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، چنانچہ کہتے ہیں:

''جب شاہی فوج دیو گیر پہنچی تو ایک شہر نظر پڑا جو تازگی اور لطافت میں قصرِ شداد سے بھی بازی لے گیا تھا۔ ہر بازار ایک باغ معلوم ہوتا تھا، جہاں جوہری اور صراف چھوٹے بڑے اچھووں[8] اور سونے چاندی کے سکوں کے ڈھیر سامنے لیے بیٹھے تھے۔ ہر قسم کے کپڑوں کے، جو ہندوستان میں بہار سے لے کر خراسان تک کہیں نہ مل سکتے تھے، دکانوں میں تھان موجود تھے، اور ایسے خوش رنگ کہ جیسے پہاڑوں پر گل ولالہ یا چمن میں ریحان ونسرین، ہر قسم کے خوش ذائقہ اور لذیذ پھلوں کے تودے لگے ہوئے تھے اور سپاہیوں کے لیے ہر طرح کا سامان، سوتی، اونی، اور چمڑے کے کپڑے اور پیتل اور فولاد کی زرہیں تیار رکھی تھیں۔''

یہی وجہ تھی کہ کافور کو دیو گیر میں اپنی فوجوں کے لیے کافی ساز وسامان مل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ راجہ رام دیو اس کی ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اس مرتبہ اس نے اپنے ایک نائب یا حاکم (دلوی) پرس رام کو شاہی لشکر کی رہنمائی اور اعانت کے لیے خاص ہدایتیں دے دی تھیں۔ اس کی مدد سے کافور بلال دیو کی راج دھانی، دھور سمندر یا دھول سمندر تک جا پہنچا اور بلال دیو کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پیش کردہ شرائط کو منظور کرے۔ یہاں سے بہت سا مالِ غنیمت لینے کے بعد وہ معبر کی طرف چلا اور راجہ بیر پندیا کی سلطنت پر تاخت کر کے لوٹ مار شروع کی۔ راجہ جنگلوں کی طرف نکل گیا اور باوجود اس کے کہ کافور اس کی تلاش میں کیم اور کندور اور مدورا تک پہنچ گیا اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر ملک کافور نے یہی غنیمت سمجھا کہ جو مال و دولت راجہ کے علاقے سے وہ اب تک لے چکا تھا اسے ساتھ لے کر دہلی واپس روانہ ہو جائے۔ اس لوٹ کے مال کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان ہاتھیوں کی قطار، جو اس کے ہاتھ لگے تھے، تین فرسنگ لمبی تھی، بے شمار معبری گھوڑے تھے اور پانچ سو من جواہرت اور سونا تھا۔ جب کافور یہ سب بیش قیمت تحایف لے کر دہلی پہنچا تو علاؤالدین نے ایک بڑا دربار کیا اور دل کھول کر انعام واکرام تقسیم کیا۔ شاید اس وقت سے لے کر جب وہ کڑے سے دہلی سونا بکھیرتا ہوا آیا تھا اس نے کبھی ایسی سخاوت نہ دکھائی تھی۔ ایک

ایک امیر کو چار چار پانچ پانچ من سونا ملا، اس طرح تمام ملک میں خوشیاں منائی گئیں اور خیرات تقسیم کی گئی۔

بداؤنی نے اپنی کتاب منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ امیر خسرو بھی اس آخری اور عظیم الشان مہم میں شاہی لشکر کے ہمرکاب تھے۔ لیکن یہ بات قرین قیاس نہیں، اس لیے کہ اگر بادشاہ خود مہم میں شریک ہوتا تو خسرو کی شرکت کا بھی امکان تھا۔ لیکن ملک کافور کے ساتھ ان کا ایک ایسے دور دراز اور دشوار گزار سفر پر جانا بہت غیر اغلب معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے خسرو نے کہیں یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ اس مہم میں شریک تھے، حالانکہ انہوں نے خزائن الفتوح میں ملک کافور کی جنوبی ہندوستان پر چڑھائیوں کی بہت مفصل کیفیت لکھی ہے۔ خسرو کی اس وقت عمر کوئی ساٹھ سال کی تھی اور اس سن میں ان سے ایسی ہمت اور سیر و سیاحت کے اتنے شوق کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔

یہ زمانہ علاؤالدین کے عین عروج اور کمال قوت کا زمانہ تھا۔ اس کی سلطنت ایک طرف اڑیسہ سے گجرات اور سندھ تک اور دوسری طرف پنجاب سے تقریباً راس کماری تک پھیلی ہوئی تھی اور اگرچہ غالباً بعض دور دراز حصوں مثلاً جنوبی ہند میں اس کی حکومت کبھی مضبوطی سے قائم نہ ہو سکی تو بھی یہ واقعہ ہے کہ اس حصۂ ملک کے حکمران بھی اس کے حلقہ بگوش اور باج گزار ہو چکے تھے۔ ملک میں عام طور پر امن و امان اور فارغ البالی تھی۔ خسرو کی زبانی اس کے عدل و انصاف کا تذکرہ آپ سن چکے ہیں، اب اس کے عہد کی عام معاشرتی اور معاشی حالت کے متعلق جو کچھ وہ کہتے ہیں وہ بھی سن لیجیے۔

> "کیا عجب امن و امان کا زمانہ ہے کہ دہلی کی فصیلوں سے لے کر خراسان کے گرد و نواح تک سرخ چہرے والے چینیوں (تاتاریوں) کے خون سے ایک سرخ فرش بچھا ہوا ہے۔ چنانچہ سب فتنے محو خواب ہیں اور ہر قسم کی بدنظمی اور فساد معدوم ...... ایک طرف تو چنگیز خاں کی پہاڑ جیسی فوجوں کو اس کی یاد ہیبت نے اڑا کر جیحون کے پار پھینک دیا اور دوسری طرف ہندوستان کے وہ زبردست راجہ جو اپنے ہاتھیوں سے ترکوں کی صفوں کو پامال کیا کرتے تھے، ہاتھی اور خزانے دینے پر مجبور کر دیئے گئے...... انصاف اور رعایا کی بہبود کے لیے اس نے ایسے قواعد اور آئین قائم

کر دیئے ہیں کہ جن کی صورت نہ تو آئینۂ اسکندری میں نظر آسکتی تھی اور نہ جام جمشید میں دکھائی دیتی تھی۔ اپنی صائب رائے سے اس نے اناج کے سستا کرنے کے لیے، جو سرمایۂ زندگی کا خمیر ہے، ایک ایسا قانون بنا دیا ہے کہ اگر سالوں تک ابرِرواں اپنی پیشانی کا پسینہ نہ ٹپکائے، ہَوا اپنا پنکھا نہ ہلائے، زمین سرخ سبزہ نہ پیدا کرے اور گندم سورج فصلوں کو نہ پکائے، تو بھی وہ عام رعایا کو اپنے غلے کے ذخیروں سے کھانا مہیا کرسکتا ہے۔ لوگوں کی اور ضروریات بھی، خواہ وہ کبریت احمر یا لعل سفید ہی کیوں نہ ہوں۔ ایسی ارزاں ہیں اور ایسی آسانی سے دستیاب ہوسکتی ہیں جیسے زرد عنبر یا سرخ اناج۔ علاوہ ازیں روپیہ جو خواہشوں کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے اور لوگوں کو سب سے زیادہ عزیز ہے، اس کے گراں قدر عطیوں اور کثیر انعام و اکرام کی وجہ سے اتنا ارزاں ہوگیا ہے کہ کسی کو بھی چیزوں کی گرانی سے دقت محسوس نہیں ہوتی اور خوش حالی اور آسائش تمام سلطنت میں پھیلی ہوئی ہے...... چور، روپے کے سایے سے بھی یوں بھاگتے ہیں جیسے سایہ سورج سے، اور انصاف، ظلم کا یوں قلع قمع کر رہا ہے، جیسے چراغ اندھیرے کا، زبردست ہاتھی کو یہ یارا نہیں کہ کمزور چیونٹی کے راستے میں اکڑ کر پاؤں رکھے اور بھوکے شیروں کی یہ ہمت نہیں کہ لنگڑے ہرن کی چال پر ہنسے۔"[10]

خسرو نے جو کچھ لکھا اس کی تائید ان کے ہم عصر برنی کے بیان سے بھی ہوتی ہے، وہ کہتا ہے کہ علاؤالدین کے عہد کی پہلی تعجب خیز بات یہ تھی کہ اناج، کپڑا اور ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی بہت ارزاں تھیں اور ان کی قیمتوں میں قحط اور خشک سالی کے باوجود بھی کوئی فرق نہ آتا تھا۔ جب تک علاؤالدین زندہ رہا یہ ارزانی برابر قائم رہی۔[11] مگر تعجب ہے کہ یہی برنی کیقباد کے بادشاہ ہونے کا ذکر کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے۔

"بہت عرصے کے بعد چھیل اور تنکے تھیلیوں اور بٹوؤں میں دکھائی دینے لگے ...... لوگوں کو علاؤالدین کی بدمزاجی، تُند خوئی اور طرح طرح کے

ٹیکسوں سے نجات مل گئی، سونا چاندی گھروں کے اندر اور باہر، بازاروں اور محلوں میں پھر آنے لگا۔“[12]

واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین اپنے روپے کو بہت احتیاط سے صرف کرتا تھا، اس میں وہ فضول خرچی اور فیاضی نہ تھی جو مثلاً فیروز خلجی یا کیقباد میں تھی۔ اس کی حکمت عملی برابر یہ رہی کہ مال داروں سے روپہ وصول کیا جائے اور غریبوں کی حالت بہتر بنائی جائے، چنانچہ خسرو بھی ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

”اس کی طبیعت کے تمام خواص قانون اعتدال کے مطابق تھے۔ اس کا غضب ایسی آگ تھا جو پکاتی ہے مگر جلاتی نہیں۔ اس کا رحم ایسی نرم ہوا تھا جو ہر کس و ناکس پر چلتی ہے لیکن گرد نہیں اڑاتی، اس کا مزاج پانی کی طرح تھا جو پیاس بجھاتا لیکن ڈبوتا نہیں اور اس کی سخاوت ایسی کان کی مانند تھی جو خزانے کو جمع کرتی ہے اور اسے برباد نہیں کرتی۔“[13]

یہ آخری فقرہ قابلِ توجہ ہے۔ علاؤالدین اپنے عطیوں اور انعام و اکرام میں یقیناً حدِ اعتدال کو ملحوظ رکھتا تھا بلکہ اپنے منصبداروں کو بھی بہت واجبی تنخواہیں دیتا تھا۔ چنانچہ برنی نے علاؤالدین کے عہد کے عجائب کا ذکر کرتے ہوئے یہ بات خاص طور پر لکھی ہے کہ اس کے خدم و حشم بہت کثرت سے تھے لیکن سب کو بہت قلیل مشاہرے ملتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ جتنے جتنے بڑے بڑے ادیب، عالم، شاعر اور ہر نوع کے اربابِ کمال اس بادشاہ کے عہد میں جمع تھے اس کے پیشرو بادشاہوں کے زمانے میں کبھی جمع نہ ہوئے تھے اور بظاہر علاؤالدین کی جزرسی اور کفایت شعاری کے ان میں سے بہت سے دربارِ شاہی سے متعلق تھے اور بادشاہ کے مرہونِ احسان ثناء خواں۔ ان میں سے بعض کا ذکر آئندہ کسی جگہ ہوگا لیکن اس وقت ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ خسرو اس بادشاہ کے عہد میں کس حالت میں رہے اور اس نے کہاں تک ان کی قدردانی اور ہمت افزائی کی۔

اس میں تو کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ علاؤالدین کا عہد خسرو کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا اور ان کی زیادہ تر تصنیفات اسی زمانے میں مکمل ہوئیں۔ چنانچہ غرۃ الکمال جو خسرو کا سب سے ضخیم دیوان ہے، علاؤالدین کے عہد میں مرتب ہوا اور اس کے بعد چوتھا دیوان بقیہ نقیہ کی تالیف بھی اسی دور میں عمل میں آئی۔ ”خمسہ“ کی پانچوں مثنویاں، عشقیہ کا زیادہ تر حصہ خزائن، الفتوح اور اعجاز

خسروی بھی اسی زمانے کی یادگار ہیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ان کے کلام میں وہ پختگی اور متانت وہ سوز وگداز، وہ دل فریبی اور جاذبیت پیدا ہوئی جو ہر ماہرِفن اور صاحبِ کمال کو سرورِ زمانہ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ بعد میں بیان ہوگا علاؤالدین ہی کے عہد میں خسرو کو نظام الدین اولیاءؒ سے بیعت کا شرف حاصل ہوا اور ان بزرگ کے فیض صحبت سے ان کے کلام میں ایک خاص لطافت اور شادابی آگئی جو اس سے پہلے ان کے کلام میں کمتر پائی جاتی تھی۔ خسرو کی شہرت دور دور تک پہلے ہی پھیل چکی تھی لیکن اب انہیں ہندوستان کے شعراء میں ہی نہیں بلکہ تمام فارسی گو شعراء میں ایک ایسی حیثیت اور مرتبہ حاصل ہو گیا تھا جس کو ہر وہ شخص جو ذوقِ ادب اور نظر حقیقت بین رکھتا ہے، تسلیم کرے گا۔ ان کے اپنے زمانے میں دہلی شہر اہلِ کمال کی کان تھا، خود ان کے الفاظ میں، جس پتھر کو اٹھاؤ اس کے نیچے سے ایک شاعری کا موتی نکل آتا تھا، اور ہر گز زمین سے، جو کھودی جائے، خیالات کا ایک چشمہ ابل پڑتا تھا۔ لیکن ان سب اہل کمال شاعروں اور ادیبوں میں جو عزت امیر خسرو کو حاصل تھی اور کسی کو نصیب نہ تھی۔ اگرچہ خواجہ حسن بھی کافی شہرت رکھتے تھے اور غزل گو شعراء میں انہیں ایک ممتاز درجہ حاصل تھا اس لیے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ بادشاہ امیر خسرو کی کماحقہ تربیت اور قدردانی ضرور کرتا ہوگا، مگر برخلاف اس کے خسرو کے اپنے بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی مالی حالت میں علاؤالدین کے عہد میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا، اور برنی کا یہ قول کہ علاؤالدین نے خسرو کے لیے وہی ایک ہزار تنکہ سالانہ وظیفہ مقرر کیا تھا، جو فیروز خلجی کے عہد میں انہیں ملتا تھا، صحیح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک قطعے میں میں بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے خسرو کہتے ہیں:

اے شہنشاہی کہ گردون روبسویت کرد وگفت
بندۂ مستظہرم من از عطای عام شاہ
خواہشم از ختم شاہان شغل مصحف داریست
تاشود حرز دعایم جوشن اندام شاہ
ہست مقصود آنکہ باری دولتم حاصل کنم
خاصہ چوں دریافت بختم نوبت و ایام شاہ

اور ایک مثنوی میں کہتے ہیں:

بود از احسان جلالی بددوام
تنکہ ز امردہ ہزار انعام (کذا)[14]
ہست از شاہ امید جانم
کہ مقرر شود آن فرمانم

ان اشعار سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خسرو کو مصحف داری کا عہدہ اور اس کے ساتھ ایک ہزار تنکہ سالانہ کا وظیفہ بھی ان کی اپنی جد وجہد کے بغیر نہیں ملا۔

اسی طرح ایک مثنوی میں، جسے انہوں نے ''عرض حال'' کا نام دیا ہے، وہ بادشاہ کو خطاب کرتے ہوئے اسے شاعروں پر دادودہش کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ یہ مثنوی علاؤالدین کے دورِ حکومت کے چوتھے سال میں لکھی گئی تھی[15] اور اس سے یہ بات اور بھی واضح ہوجاتی ہے کہ کم ازکم بادشاہت کے آغاز کے کچھ عرصے بعد تک علاؤالدین نے خسرو پر کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی، چنانچہ کہتے ہیں:

> ''جس سال ظلِ الٰہی نے تخت پر جلوہ فرمایا، پہلا اعزاز جو مقدر سے مجھے ملا یہ تھا کہ دربار میں میری رسائی ہوگئی، جہاں میں بادشاہ کے سامنے موزوں مقام خدمت میں کھڑا رہتا تھا۔ ایک دن جب ایک رنگین قصیدے سے میں نے بساطِ شاہی پر شکر فشانی کی تو بادشاہ عالم نے مہربان ہو کر مجھے بیٹھنے کا حکم دے دیا۔ فتح نامہ سن کر خان خانان نے بھی مجھ پر بہت عنایت کی اور مجھے ایک خاص خلعت عطا کیا اور مجھے پانچ سو چاندی کے تنکے بھی دیئے۔ اس احسان کی یاد اب تک میرے دل میں تازہ ہے۔ خدا اس بزرگ خان کی روح کو اپنی مشعل عفو سے روشن کرے، اور خدا کرے کہ بادشاہ وقت زمانے کی قید سے آزاد ہو کر ہمیشہ تخت مسرت پر جلوہ افروز رہے۔ اے بادشاہ میں جانتا ہوں کہ آپ ایسا عقل مند کوئی بادشاہ نہیں ہوا، اس لیے کہ آپ ہنر کے پورے قدر شناس، اشعار کے قابل نقاد

اور شاعری کے دوست اور مددگار ہیں۔ لیکن افسوس! مجھ پر ایسا بُرا وقت آن پڑا ہے کہ ڈھنگ سے کسبِ معاش بھی نہیں کر سکتا۔ اگر آپ کے وقت میں بھی میری حالت نہ سدھری تو پھر کب سدھرے گی؟ کیسے افسوس کی بات ہے کہ آپ جیسا بادشاہ ہو اور مجھ جیسا شاعر ایسی تنگی میں گزران کرے۔ جو وظیفہ مجھے آپ سے ملتا ہے وہ میرا حق ہے اور میری خدمت کا صلہ ہے اس لیے کہ میں ہمیشہ رکابِ شاہی کے ہمراہ رہتا ہوں...... لیکن دل میں آپ کی ثناہ خوانی کی خواہش ہے، بغیر صلے کے یہ خواہش کیونکر پوری ہو سکتی ہے؟ آپ اس بخشش و کرم سے ناواقف نہیں، جو پچھلے بادشاہ شاعروں پر کیا کرتے تھے، جو بعض دفعہ ایک قصیدے کے صلے میں ایک خزانہ بخش دیتے تھے۔ ایک قصیدہ لکھنے پر خاقانی کو فی بیت ایک ہزار دینار انعام میں ملے اور مرو میں معزی سونے کی کرسی پر بیٹھا کرتا تھا۔ جب فردوسی نے شاہ نامہ لکھا تو بادشاہ نے اسے ایک ہاتھی کے بوجھ کا سونا دیا اور پھر بھی اس کے بخل کا افسانہ بن گیا۔ عنصری کو بھی سلطان محمود سے بے شمار انعام ملتا رہا، یہاں تک کہ اس کے گھر کا سب سامان سونے کا تھا۔ اس تربیت کی وجہ سے، جو بادشاہ شاعروں کی کرتے تھے، ہمیشہ رہنے والے قصیدے لکھے گئے اور ان کی سخاوت کی شہرت کو دوام حاصل ہو گیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ لوگ کس زمانے میں تھے اور بادشاہوں نے ان کی کیسی تربیت کی، مگر کل جب ہم مٹ کر فنا ہو جائیں گے تو ہمارے متعلق لوگ کیا بتا سکیں گے؟ اے بادشاہ جہاں، اس لیے شاعروں کو خیرات دینا بہت لازمی ہے۔ اگر اُس زمانے کے سحر آفریں شاعر بے مثل تھے تو میں بھی اپنے وقت میں ان سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوں، اور اگرچہ میرا نام عنصری نہیں مگر میری شاعری اس کی شاعری سے ہرگز ادنیٰ نہیں ہے۔ وہ اپنی شاعری کے ہنر سے پیالوں میں شراب پیتا تھا، حضور کی عنایت سے مجھے بھی ایسا کرنے کی امید ہے۔ اگر آپ کی

تربیت شاہانہ میرے شامل ہو تو میں اس سے بھی بازی لے جاسکتا ہوں۔ اس لیے کہ سبزہ بغیر بارش کے نہیں ہوتا اور شاعری بغیر سخی بادشاہوں کی مہربانی کے فروغ نہیں پاسکتی۔آپ جو توقع کی شکایت کو دور کر سکتے ہیں مجھے میری شاعری کی خوبی کے مطابق صلہ دیجیے۔آج آپ کے گرد و پیش سینکڑوں غلام ہیں جو دن رات آپ کی خدمت میں مشغول ہیں،ان میں سب سے ادنیٰ خادم میں بھی ہوں۔آج سے سو سال بعد دنیا ایک اور ہی دنیا ہو جائے گی اور جو لوگ بادشاہ کی ثناء و توصیف پڑھیں گے وہ میری خدمت کی قدر کریں گے آپ باقی رہیں گے اگر چہ میں نہ رہوں گا!

میں نہ ہوں گا مگر میری خدمت باقی رہے گی......

ایک روز آپ نے مجھ پر مہربان ہو کر یہ فرمایا تھا کہ اے ہمارے عہد کے ثنا خواں، خوش ہو کہ تجھے ہماری حکومت سے بلندی نصیب ہوئی اور تو ہمارا مقرب بنا۔ہم تجھے اتنا مال و دولت دیں گے کہ تُو ہر اندیشے اور فکر سے بے نیاز ہو جائے گا۔اس وعدہ سے یہ کمترین خادم اب تک قانع رہا،لیکن اس بات کو چار سال گزر گئے حضور کا اقبال سینکڑوں برس قائم رہے،اس خیال سے یہ یاددہانی کراتا ہوں کہ شاید آپ وہ وعدہ بھول گئے ہوں،اگر چہ میں جانتا ہوں کہ آپ جیسا شخص جو وعدہ کرے وہ ضرور پورا ہوگا،آپ کے لطف و کرم سے ہزاروں غلام مرتبے میں آسمان کو پہنچ گئے،انہی خوش قسمت غلاموں میں سے ایک مجھے بنا دیجئے۔''

خسرو نے تقریباً اسی مضمون کو ایک اور مثنوی میں بھی ادا کیا ہے[16] بقول ان کے پہلے بادشاہ شاعروں کی اتنی قدر کرتے تھے کہ رودکی کو ہر عمدہ شعر پر ایک ''من'' سونا مل گیا۔خاقانی کے پاس اکسوں کے پردے،اطلس کے فرش،جواہرات سے مرصع سازہائے نشاط اور جام ہائے شراب تھے اور رومی اور حبشی غلام اسے سونے کی رکابیوں اور یاقوت کے قابوں میں کھانا کھلایا کرتے تھے۔پھر بادشاہ سے یوں خطاب کرتے ہیں:

''میں نے اس کوچے میں اپنا گھوڑا اس لیے نہیں ڈالا کہ بادشاہ کی

داد و دہش سے مجھے بھی حصہ ملے، میں ان لالچی آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو حرص میں عزت بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ میرا صلہ کم ہو یا زیادہ میں ہر طرح خوش ہوں، اور اگر کم اور زیادہ کچھ بھی نہ ہو تو بھی مجھے کوئی شکایت نہیں۔ اگر اپنی عنایت سے آپ مجھے بلند کریں تو میں آسمان تک پہنچ سکتا ہوں، لیکن اگر آپ میرا بالکل بھی خیال نہ کریں تو (کیا عجب ہے) اس لیے کہ کسی فقیر کے مرنے کا بادشاہ کو کیا خیال ہو سکتا ہے؟ میں اپنے افلاس اور اپنی تنہائی سے قانع ہوں، میرا بھروسا خدا پر ہے اور وہی مجھے میری روزی دے گا...... لیکن بہت افسوس کی بات ہے کہ ساری دنیا تو یوں خوش ہو اور مجھ سا شاعر فاقے کرے۔ میں اس پرند کی طرح ہوں جس نے ابھی ابھی گانا سیکھا ہو اور اس کی زبان باندھ دی جائے اور گلا سی دیا جائے۔ اب بھی جو شاعری کے خزانے مَیں لٹا چکا ہوں۔ ان کے مقابلے میں میرا صلہ بہت ہی کم ہے، لیکن ابھی تو کتنے ہی آبدار موتی میرے دماغ میں چُھپے پڑے ہیں۔ اگر میں رے یا روم میں پیدا ہوتا تو میری خاردار جھاڑیاں بھی موم کے درختوں کی طرح نرم و نازک معلوم ہوتیں اور وہ دل میں یوں کہتا کہ واللہ وہ ساحر کیسا ہوگا جس نے اتنی کاوش سے ایسی سحر آفریں شاعری کی ہے! مگر اب تو میرے پھولوں میں سے بھی سرکہ ہی نکلتا ہے جس کا رنگ سیہ اور بُو ناگوار ہے۔ موتی قیمتی ہے اس لیے کہ ہر شخص کے ہاتھ نہیں لگ سکتا، لیکن پانی جو کہ زندگی کا جوہر ہے، ارزاں ہے اس لیے کہ اس کی اتنی فراوانی ہے۔

اے زبردست بادشاہ! مجھے یوں نشانہ ملامت نہ بنائیے کیونکہ اپنے ہنر میں میں بے مثل ہوں، اور جو خدمت میں آپ کی کرتا ہوں اگر وہ اس قابل نہیں کہ آپ اس کی قدر کریں، تو بھی میں نے ان چند مہینوں میں، جو میں نے آپ کی خدمت میں گزارے ہیں، آپ کے قدموں میں اتنے خزانے نثار کیے ہیں کہ ان کی وجہ سے جناب خضر آپ کو آبِ حیات اس

وقت تک دیتے رہیں گے جب تک کہ حرفوں کی سیاہی قائم ہے۔ شاعر جب اپنی قلم کو سیاہی میں تر کرتا ہے تو وہ دو سو برس کی خدمت ایک لمحے میں ادا کر دیتا ہے۔ شاعروں کے الفاظ کو حقارت سے نہ دیکھئے، اس لیے کہ ان کے ہر ایک شیریں لفظ میں ایک زندگی مضمر ہے، زر خالص آپ کے کس کام کا ہے جب کہ مرنے کے بعد آپ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے، آپ کو اس سونے سے حیات ابدی خریدنا چاہیے تا کہ آپ کی شہرت ہمیشہ باقی رہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین نہ صرف خسرو کو صلہ یا انعام دینے ہی میں کچھ بخل برتتا تھا بلکہ ان سے یہ بھی توقع رکھتا تھا کہ وہ ایک منصب دار کی حیثیت سے درباری داری بھی کریں اور اس کی خدمت میں حاضر رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بات کسی شاعر کو بھی گوارا نہیں ہو سکتی اور پھر خسرو جیسے شاعر کے لیے تو یقیناً بہت تکلیف دہ ہوگی۔ اپنے زمانے کے سب سے ممتاز شاعر ہوتے ہوئے بھی انہیں اس عہد میں اور منصب داروں کی طرح حاضری کی مجبوری اور فرصت اور فراغت سے محرومی جس قدر بھی شاق گزرتی ہو کم ہے۔ غالباً وہ اس کے عادی نہ تھے، اس لیے کہ اس سے پہلے انہیں جن مربیوں سے واسطہ پڑا وہ سب ان کا بہت پاس اور لحاظ رکھتے تھے اور ان سے اس سے زیادہ توقع نہ رکھتے تھے کہ وہ ان کی مدح و ثنا کرتے رہیں اور ان کی خاص خاص خوش گوار صحبتوں میں ایک ندیم کی طرح شرکت کریں۔ اپنے جذبات کو خسرو یوں ادا کرتے ہیں۔

"اگر دن رات مَیں جہاں پناہ کے دربار میں اپنی حقیر خدمات انجام دینے کے لیے حاضر نہ رہ سکوں تو اس سے کیا حرج ہے؟ اس لیے کہ جب سو تاج دار سر آپ کے سامنے ہر روز جھکتے ہوں تو آپ ایک گداگر کی غیر حاضری کو آسانی سے معاف کر سکتے ہیں۔ میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں آپ کی خدمت نہیں کر سکتا بلکہ میں تو آپ کی خدمت میں دن اور رات، صبح اور شام موجود رہتا ہوں، مجلس میں مَیں اپنے کلام کی جادوگری دکھا سکتا ہوں اور لڑائی کے وقت تلواروں سے کھیل سکتا ہوں، بلکہ اگر چاند سے تیروں اور نیزوں کی بارش ہو رہی ہو تو بھی میں آپ کی رکاب مبارک کو

چھوڑ کر نہ جاؤں گا۔ لیکن مجھے تو موتی پرونا ہیں اور دقیق باتوں کو تازگی خیال کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ کبھی تو میں کسی چشمہ رواں کا رخ کرتا ہوں اور کبھی کسی سرسبز مرغزار کی طرف جاتا ہوں اور آپ کے گوش مبارک کے شایان کوئی موتی حاصل کرنے سے پہلے میرا خون سمندر کی طرح اُبلتا ہے۔ اگر وہ موتی آپ کے قابل نہ بھی ہو تو بھی آپ کے غلام کے کان کے لائق تو ہوتا ہے، اور میں آپ کے حلقہ خدمت سے اس لیے دور رہنا چاہتا ہوں کہ کہیں میرا موتی لوگوں کے انبوہ میں گم نہ ہو جائے۔ اگر میں دن رات آپ کی خدمت میں کھڑا رہوں تو میرے دماغ سے کیا شاعری ہو سکتی ہے؟ بغیر غور و فکر کے یقیناً میرے کلام میں نہ تو گہرائی ہوگی نہ متانت۔"

اسی طرح مجنوں و لیلیٰ کے خاتمے میں نظامی کا اپنے سے مقابلہ کرتے ہوئے مثنوی میں اس کی فوقیت اور برتری کے دو اسباب بیان کرتے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے صرف مثنوی میں طبع آزمائی کی اور اس لیے اس میں کمال حاصل کر لیا:

او بود بیک فنی نشانہ
چوں یک فنہ بود شد یگانہ

اور دوسرے یہ کہ اسے نہ تو معاش کا فکر تھا اور نہ غمِ روزگار:

وانکہ ز جہاں فراغ جستہ
وز شغل زمانہ دست شستہ
بارے نہ بدل مگر ہمیں بار
کاری نہ دگر مگر ہمیں کار
کوشش ہمہ در سخن سگالی
خاطر ز ہر التفات خالی

کنجے و دلی ز محنت آزاد
آسودگی تمام بنیاد

برخلاف اس کے اپنی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں:

"لیکن میں بے چارہ ضرورت منداور بے ہوش وحواس رہتا ہوں اور فکر سے میرا خون دیگ کی طرح کھولتا رہتا ہے۔رات سے صبح تک اور صبح سے شام تک مجھے گوشۂ غم میں آرام کرنے کی مہلت نہیں ملتی۔اپنے اس سرکش نفس کی وجہ سے اپنے جیسے ایک انسان کے سامنے کھڑا رہتا ہوں۔ جب تک سر سے پاؤں تک پسینے میں نہ بھیگ جاؤں، میرا ہاتھ کسی کے پانی سے تو نہیں ہوتا (یعنی کوئی مجھے کھانا نہیں کھلاتا) جو مزدوری مجھے ملتی ہے اسے لوگ اپنا احسان سمجھتے ہیں اور جو محنت میں کرتا ہوں وہ سب بے کار محض سمجھی جاتی ہے۔میرا حال اس گدھے کی طرح ہے جو کہ اتنی مشقت اور رنج سے چارہ لادکر لاتا ہے اور اسے تھوڑے سے جو کھانے کو دانے دیئے جاتے ہیں لیکن وہ بھی بہت ذلت کے ساتھ۔اگر کبھی چند دن کے لیے مجھے اطمینان اور فراغت ملتی بھی ہے تو اتنی تنگ فرصت میں کیا یہ آسان بات ہے کہ کھودنے والا پتھر سے سونا کھود کر نکال سکے؟اس فرصت میں اپنے ممدوح فجستہ کو یاد کروں (یعنی بادشاہ کی تعریف میں قصیدے لکھوں) یا اپنے دل کی خواہش کو پورا کروں (یعنی غزلیہ اشعار کہوں)، وہ تو غنیمت ہے کہ میرا کلام سبک عنان ہے۔معانی کی کان دل میں ہے اور گنجینہ زبان پر، اور میری قلم جس کی نوک زبان غیب ہے، کان غیب کی گنجینہ کشا بھی ہے۔میں جب جلدی میں آواز دیتا ہوں تو معانی لبیک کہتے ہوئے بھاگتے چلے آتے ہیں، چنانچہ میری گرم رفتار نظم کی حرکت پر ولالہ فکر کی بھی نظر نہیں جم سکتی، اس لیے باوجود ایسے مشاغل کے جو دماغ کو پراگندہ کردیتے ہیں، ایک شاخ سے میں اتنے نئے پھل پیدا کرسکتا ہوں اگر روٹی اور پانی کی تگ ودو سے ذرا میری جان کو نجات ملتی تو پھر تمہیں معلوم ہوتا کہ ایسے موتیوں سے میں کس طرح آفاق کو پُر کردیتا۔"

ان اشعار سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ خسرو اپنی زندگی کے اس پہلو یعنی بادشاہ اور امیروں کی مصاحبت اور ملازمت سے اب بالکل متنفر ہو گئے تھے۔اس لیے کہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ آخر دم تک کسی نہ کسی حیثیت سے دربارشاہی سے وابستہ رہے۔جس کی وجہ ایک حد تک کسبِ معاش ضرور

تھی لیکن دوسرا سبب یقیناً یہ بھی تھا کہ وہ اس طرزِ زندگی کے عادی ہو گئے تھے۔ اس لیے کہ اگر ایک طرف درباداری اور خدمت شاہی میں پابندیاں اور ناگوار بندشیں تھیں تو دوسری طرف شاہی محفلوں کی دلچسپیاں اور دل فریب مشاغل بھی تھے، اور اگر ان کے احساس خودی کو بادشاہوں کی رعونت اور تلون مزاجی سے کبھی کبھی ٹھیس لگ بھی جاتی تھی تو اس کا کفارہ اس تعریف اور قدر شناسی سے ہو جاتا تھا جو وقتاً فوقتاً بادشاہوں کی طرف سے ظہور میں آتی رہتی تھیں۔ چنانچہ علاؤالدین جیسے جزرس بادشاہ نے بھی ایک موقع پر انہیں ایک قصیدہ کے صلے میں ایک گانوؤں دے دیا تھا، پھر بھی مذکورہ بالا اشعار سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ خسرو میں اب زمانہ سازی اور دنیاوی مشاغل میں انہماک کا شوق کم ہوتا جارہا تھا۔ ممکن ہے کسی حد تک یہ عمر کا تقاضا ہو، مگر اس کی ایک بڑی وجہ غالباً یہ تھی کہ وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے اب باقاعدہ بیعت ہو چکے تھے اور ان بزرگ کے فیض صحبت سے ان کے خیالات اور جذبات میں ایک بڑا تغیر واقع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ اب بھی بادشاہوں کے دربار میں حاضری دیتے تھے اور اب بھی ان کی مدح و ثنا میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کو تیار رہتے تھے لیکن ان کی زیادہ تر توجہ اب دنیاوی معاملات سے ہٹ کر عاقبت سے پیچیدہ مسائل کی طرف منعطف ہوگئی تھی۔ انہیں شاہی محفلوں کی زیب و زینت، وہاں کے ناچ رنگ، وہاں کی دلچسپ صحبتیں پھیکی اور بے جان معلوم ہونے لگی تھیں اور اپنے پیر و مرشد کا غریبانہ مسکن اور درویشانہ نشیمن ان کے لیے زیادہ جاذبیت رکھتا تھا اور جو سکون اور آرام انہیں وہاں میسر آتا تھا وہ کہیں اور نصیب نہ ہوتا تھا۔ دربار سے چھوٹتے تھے تو سیدھے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے زاویے میں پہنچتے تھے اور اس کی چار دیواری میں داخل ہوتے ہی درباری لباس کے ساتھ ہی طبیعت کا وہ بوجھ بھی جو جھوٹی خوشامد اور ریاکار ظاہرداری کا لازمی نتیجہ ہے، اتر جاتا تھا۔ دل میں ایک نیا ولولہ، ایک نئی طاقت اور ہمت پیدا ہو جاتی تھی جو انہیں دنیاوی مصائب اور افکار کے مقابلے کے لیے قوی تر بنادیتی تھی۔ یہ نظام الدین کون تھے اور خسرو سے ان کا تعلق کب اور کن حالات میں قائم ہوا؟ اس کا جواب آپ کو آئندہ باب میں ملے گا۔

ساتواں باب

حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور خسروؒ، علاؤالدین خلجی کا انتقال اور ملک کافور کی سرکشی، اس کا قتل اور قطب الدین مبارک شاہ کی تخت نشینی

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا پورا نام محمد بن احمد علی البخاری نظام الدین اولیا تھا اور آپ عام طور پر سلطان المشائخ یا سلطان الاولیاء کے لقب سے مشہور ہیں۔ مصنف اخبار الاخیار کے قول کے مطابق آپ کے دادا خواجہ علی بخارا سے ہندوستان آئے اور کچھ عرصے لاہور میں قیام کرنے کے بعد بدایوں میں مقیم ہوگئے۔[1] اور وہیں حضرت نظام الدین پیدا ہوئے، لیکن مصنف تاریخ فرشتہ نے لکھا ہے کہ ان کے والد کا نام احمد بن دانیال تھا اور وہ غزنین سے ہندوستان میں آئے تھے، بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ آپ کا خاندان بدایوں میں آباد تھا اور یہی شہر آپ کی جائے پیدائش ہے۔ ابھی آپ کا سن پانچ ہی برس کا تھا کہ آپ کے والد اس دنیائے فانی سے رحلت فرما گئے اور اب آپ کی تعلیم وتربیت کا پورا بار آپ کی والدہ بی بی زلیخا پر پڑا۔ یہ بی بی بے انتہا نیک اور فرشتہ خصلت تھیں اور حضرت نظام الدین اولیا کے دل پر ان کی تلقین اور تعلیم کا بچپن میں بہت گہرا اثر ہوا اور شروع ہی سے ان کی طبیعت میں مذہب کی طرف میلان پیدا ہوگیا۔ شوہر کے انتقال کے کچھ عرصے بعد بی بی زلیخا حضرت نظام الدین کو لے کر دہلی آگئیں اور یہاں ایک مسجد کے زیرِ سایہ ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگیں۔ روپے پیسے کی تنگی کی وجہ سے ماں بیٹے بہت ہی عسرت میں زندگی بسر کرتے تھے لیکن حضرت نظام الدین کی تعلیم کی طرف سے ماں نے غفلت نہ برتی، اور جو کچھ بھی تھوڑا بہت اس سلسلہ میں کرسکیں، کرتی رہیں۔

اس زمانے میں دہلی میں ایک بڑے متقی اور عالم آدمی تھے، جن کا نام شمس الدین خوارزمی تھا

اور جن کو بعد میں بلبن نے اپنا وزیر بنالیا تھا، خوش قسمتی سے حضرت نظام الدین کو ان سے استفادے کا موقع مل گیا اور استاد نے بھی شاگرد کو ذہین اور ہونہار دیکھ کر پوری توجہ سے تعلیم دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بارہ سال سے کم عمر میں ہی حضرت نظام الدین سب علوم ظاہریہ اور باطنیہ میں ماہر ہو گئے۔ ان کے ہمسائے میں ایک اور بزرگ رہتے تھے جن کا نام نجیب الدین المتوکل تھا اور جو خواجہ فرید الدین گنج شکر کے بھائی تھے۔ آپ ان بزرگ کے گھر اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ آپ وہاں موجود تھے کہ ملتان سے ایک قوال، جس کا نام ابوبکر تھا، نجیب الدین المتوکل کی زیارت کو آیا، یہ اجودھن (پاک پٹن) میں خواجہ فرید الدین کے پاس رہ کر آیا تھا اور اس نے خواجہ فرید کی دین داری اور بزرگی، اجودھن کی خانقاہ کے حالات اور وہاں کے مشاغل کی کیفیت کچھ ایسے دلچسپ طریقے پر بیان کی کہ حضرت نظام الدین اولیا کو اجودھن جانے اور خواجہ فرید الدین سے ملنے کا بہت اشتیاق پیدا ہو گیا، چنانچہ آپ اجودھن روانہ ہو گئے اور چند سال خواجہ فرید الدین کی خدمت میں گزار کر ان سے معرفت کے حقائق اور تصوف کے رموز سیکھے۔ استاد اپنے ہونہار شاگرد سے ایسے خوش ہوئے کہ انہوں نے ایک چغہ اور ایک سجادہ دیا اور دہلی میں اپنا نائب بنا کر انہیں رخصت کیا۔

دہلی پہنچ کر حضرت نظام الدین کچھ عرصے اس شش و پنج میں رہے کہ شہر میں قیام کریں یا شہر سے کہیں دور، اس لیے کہ دہلی کا شہر ان دنوں سب قسم کے لوگوں کا ملجا بن گیا تھا۔ آوارہ اور اوباش، بدچلن اور گمراہ غرض یہ کہ اخلاقی نقطہ نظر سے قابل ملامت اشخاص کا وہاں بہت ازدحام تھا اور آپ ایسے لوگوں کی صحبت اور قرب سے دور بھاگنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ بھی خیال تھا کہ ایسے لوگوں کی اصلاح اور درستی کا بیڑا اگر آپ نہ اٹھائیں گے تو کون اٹھائے گا۔ آخر بہت غور و فکر کے بعد آپ نے ایک ایسی جگہ کو پسند کیا جو شہر میں تو نہ تھی لیکن وہاں سے زیادہ دور بھی نہ تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں غیاث پور تھا اور یہ وہی مقام ہے جس کے گرد و پیش بعد میں کیلوگھری کا نیا شہر آباد ہوا۔ یہاں آپ نے اس زاویے یا خانقاہ کی بنیاد رکھی جو ان کی زندگی میں دہلی کے باشندوں کا سب سے بڑا مذہبی اور روحانی مرکز بن گئی، اور ان کے انتقال کے بعد چھ سو سال تک ہندوستان بھر کے خوش عقیدہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی زیارت گاہ رہی ہے، جب خواجہ فرید الدین کا انتقال ہو گیا تو ان کی وصیت کے مطابق آپ ہندوستان میں چشتیہ فرقے کے

صدر اور صوفیہ بزرگوں کے پیشوا کی حیثیت سے ان کے جانشین ہو گئے، اور یہ کوئی معمولی بات نہ تھی، اس لیے کہ خواجہ فرید الدین کے اپنے بیٹے بھی موجود تھے جو یقیناً اس اعزاز کی تمنا رکھتے ہوں گے اور ان کے ایک بھانجے خواجہ علاؤ الدین صابر کو تو ایک روایت کے مطابق اس وصیت پر خاصا اعتراض ہوا اور وہ ناراض ہو کر اجودھن سے کلیر چلے گئے۔ اس طرح گویا حضرت نظام الدین ہندوستان میں صوفیہ چشت کے چوتھے پیشوا ہوئے اور آپ نے اپنے پیش رووں کی گدی پر بیٹھ کر اس تلقین اور تبلیغ کے کام کو، جسے سب سے پہلے خواجہ معین الدین نے شروع کیا تھا، پہلے سے بھی زیادہ سرگرمی سے شروع کر دیا۔

آپ کو غیاث پور میں قیام کیے ابھی زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ آپ کے تقدس کا شہرہ تمام دہلی میں ہو گیا اور لوگ دور دور سے آپ سے روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے آنے لگے۔ اس زمانے کے مورخ برنی نے اپنی تاریخ میں حضرت نظام الدین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں، وہ کہتا ہے:

> حضرت شیخ الاسلام نظام الدین نے بیعت کا دروازہ سب کے لیے کھول رکھا تھا اور سب گنہگاروں کو چغے اور معافی عطا کر کے انہیں اپنے حلقۂ ارادات میں داخل کرتے رہتے تھے، خواص اور عوام، دولت مند اور غریب، امیر اور فقیر، عالم اور جاہل، تندخُو، شہری اور دیہاتی، آزاد اور غلام غرض سب قسم کے لوگوں کو آپ کلاہ چہار گوشہ اور مسواک طہارت عطا کرتے تھے اور ان کے لیے دعائے خیر کیا کرتے تھے...... سب لوگ، جو ان کے معتقد تھے، تقویٰ اور پرہیز گاری میں آپ کی تقلید کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ عورت اور مرد جوان اور بوڑھے، ادنیٰ اور اعلیٰ خادم اور غلام بلکہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی باقاعدہ نماز پڑھنے لگے تھے...... نیک دل امرا نے شہر اور غیاث پور کے درمیان کئی خوشگوار مقاموں پر چبوترے بنوا کر ان پر چھپر ڈال دیئے تھے اور کوئیں کھدوا دیئے تھے۔ ان چبوتروں میں پانی کے بڑے بڑے مٹکے اور مٹی کے لوٹے رکھے رہتے تھے، چٹائیاں بھی موجود رہتی تھیں اور قاری اور محافظ مقرر

کردیئے گئے تھے تا کہ جو زائرین شیخ الاسلام کی خانقاہ کی زیارت کو آئیں انہیں آتے جاتے راستے میں نمازیوں کی بہت بڑی تعداد نظر آئے، لوگوں نے خلاف شرع باتوں کا ذکر یا ان پر عمل بالکل ترک کر دیا تھا اور اب زیادہ تر مذہبی معاملات ہی پر گفتگو کرتے تھے۔ تقویٰ اور پرہیز گاری کا جذبہ اس قدر ترقی پذیر تھا کہ بادشاہ کے محل کے بہت سے منصب دار، سلاحدار، کاتب اور غلام جو حضرت شیخ کے مرید ہو گئے تھے چاشت اور اشراق کی نماز پڑھنے لگے تھے اور ایام بیض اور عاشورہ محرم کے روزے رکھا کرتے تھے۔ شہر کا کوئی ایسا محلّہ نہ تھا کہ جہاں بیسویں دن یا ہر مہینے لوگ جمع ہو کر سماع میں شریک نہ ہوتے ہوں اور وجد کی حالت میں نالہ و بکا نہ کرتے ہوں، خود سلطان علاؤ الدین اپنے خاندان سمیت آپ کا بہت معتقد تھا اور سب قسم کے لوگوں کے دل نیکی اور راستبازی کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ چنانچہ علاؤ الدین کے عہد کے آخری دور میں یہ کیفیت تھی کہ شراب، عورت، جوئے یا اور بُری باتوں کا نام بھی لوگوں کی زبان پر نہ آتا تھا، زیادہ تر امرا اور بڑے لوگ اور طالب جو شیخ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے مذہبی کتابوں کے مطالعے میں مصروف نظر آتے تھے، ایسی کتابیں جیسے احیاء العلوم اور اس کا ترجمہ، عوارف، کشف المحجوب، قوۃ القلوب، شرح تعرف، رسالہ قشیری، مرصاد العباد، مکتوبات عین القضاۃ، قاضی حمید الدین ناگوری کی کتاب لوائح اور لوامع اور امیر حسن کی تصنیف فوائد الفواد کے بہت سے گاہک مشتاق رہتے تھے اور کتب فروشوں کی دکانوں پر لوگ زیادہ تر تصوف اور حقائق کی کتابیں تلاش کیا کرتے تھے۔ کوئی پگڑی ایسی نظر نہ آتی تھی جس میں مسواک اور کنگھا آویزاں نہ ہو اور چمڑے کے بنے ہوئے لوٹے اور برتن صوفی خریداروں کی کثرت کے سبب بہت گراں ہو گئے تھے۔''

برنی کے اس بیان سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ حضرت نظام الدین کا

روحانی اثر خصوصاً علاؤالدین کے زمانے میں بہت وسیع تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک ایسے دور میں جب کہ سیاسی ساز باز، کشت و خون اور لڑائی جھگڑے اس قدر عام تھے، آپ کی خانقاہ ایک ایسی جائے پناہ تھی کہ جہاں ان کے مرید دنیا کے ان جھگڑوں کو بھول کر کم از کم کچھ عرصے کے لیے وہ اطمینان قلب حاصل کر سکتے تھے کہ جو انہیں اور کہیں میسر نہ ہو سکتا تھا۔ حضرت نظام الدین کی اپنی نیک اور راہبانہ زندگی سب قسم کے لوگوں کے لیے ایک مشعلِ ہدایت تھی۔ آپ نے عمر بھر شادی نہ کی، اور آپ کے زیادہ تر اوقات عبادت میں گزرتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ آپ رات رات بھر جاگ کر یادِ خدا میں مصروف رہتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی آپ میں جو خاص صفت تھی کہ آپ زہد و تقویٰ کے ساتھ ایک زندہ دل رکھتے تھے، وہ مذہبی تقشف جو بعض خشک زاہدوں میں پیدا ہو جاتا ہے آپ میں بالکل نہ تھا۔ خوش مزاج اور ظریف طبع تھے۔ شعر و شاعری کا اچھا ذوق رکھتے تھے اور اپنے فرقے کے عقائد کے بموجب سماع کو جائز سمجھتے تھے، چنانچہ آپ کے زاویے میں اکثر اچھے اچھے قوال دف یا ڈھولک کے ساتھ امیر خسرو، سید حسن اور دیگر شعراً کی غزلیں پڑھتے تھے اور آپ ان سے حظ اٹھاتے تھے۔ اگرچہ بعض خلاف شرع عادتوں مثلاً تالی بجانا یا مزامیر کے استعمال کو بُرا سمجھتے تھے۔ آپ کا یہ وصف ایسا تھا جس نے آپ کو لوگوں میں اور بھی ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ سب طبقے کے لوگ آپ کے معتقد تھے۔ شہزادہ خضر خاں تو باقاعدہ مرید ہو گیا تھا، چنانچہ خسرو کہتے ہیں: خضر دستش گرفت و خضر خاں پائے، مگر شاہی خاندان کے تقریباً سب لوگ ہی آپ کے عقیدت مند تھے۔ خود علاؤالدین فکر اور پریشانی کے زمانے میں اکثر آپ کی طرف رجوع کرتا تھا۔ ایک موقع پر اس نے اپنے مقرب خاص قرا بیگ کے ہاتھ دو لاکھ تنکے آپ کی خدمت میں بھیجے اور ایک موقع پر جب ملک کافور جنوبی ہندوستان کی مہم پر گیا تھا اور کچھ عرصے تک شاہی فوج کی کوئی خیر خبر نہیں آئی تھی تو اس نے آپ سے درخواست کی تھی کہ آپ دعا کریں کہ خدا اس مہم میں کامیابی عطا کرے، بعض ایسے طبقوں کے لوگ بھی، کہ جن کو جرائم پیشہ کہا جا سکتا تھا جیسے ٹھگ وغیرہ بھی آپ کے ارادت مند تھے اور سب قسم کے لوگوں کی طرف سے آپ کو نذریں اور تحائف پہنچتے رہتے تھے جو کچھ بھی آپ کے ہاتھ میں آتا تھا آپ اسے غریبوں اور درویشوں پر صرف کر دیتے تھے۔ لنگر خانہ برابر جاری رہتا تھا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کے اخراجات کے لیے آپ کو کسی قسم کی تنگی محسوس ہوئی ہو۔

خسرو بھی ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو حضرت نظام الدینؒ کی بزرگی کے معترف اور ان کے فیضِ صحبت سے بہرہ مند تھے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے تو لکھا ہے کہ وہ آٹھ سال کی عمر میں ہی حضرت نظام الدین کے حلقہ ارادت میں داخل ہو گئے تھے لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں بلکہ خسرو کے اپنے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنہ 671ھ میں باقاعدہ مرید ہوئے۔ اگرچہ غالباً اس سے پہلے بھی انہیں شیخ الاسلام سے ملنے کا شرف ضرور حاصل ہو چکا تھا ادھر حضرت نظام الدین بھی طوطیٔ ہند خسرو سے ناواقف نہ تھے اور ان کے کلام کی شیرینی سے اکثر چاشنی گیر ہوتے رہے تھے، اس لیے جب خسرو مرید ہونے کے ارادے سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے اپنے ملازم سے کہا کہ ایک ترک ہم سے ملنے آیا ہے اسے اندر بلا لو۔ جب خسرو اندر آئے تو آپ نے انہیں بہت لطف و کرم سے اپنے پاس بٹھایا اور ان سے باتیں کیں۔ اس کے بعد ان سے بیعت لی اور انہیں ایک بارانی اور کلاہ چہار ترکی عنایت کیا۔ آپ تھوڑے عرصے بعد ہی خسرو سے بے حد مانوس ہو گئے۔ انہیں آپ نے ترک اللہ کا لقب دیا تھا اور اکثر کہا کرتے تھے کہ میں اور سب سے اکتا جاتا ہوں لیکن خسرو سے کبھی نہیں اکتاتا۔ اسی طرح ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے روز مجھے یہ امید ہے کہ اس ترک کے دل میں جو آگ سلگ رہی ہے اس کی گرمی سے میرا نامۂ اعمال پاک ہو جائے گا۔ خسرو کی تعریف میں آپ نے ایک رباعی بھی کہی تھی جو حسبِ ذیل ہے:

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست
ملکیست کہ ملک سخن آن خسرو راست
آن خسرو ماست ناصر خسرو نیست
زیرا کہ خدا اے ناصر خسرو ماست

یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایک قبر میں دو آدمیوں کو دفن کرنے کی اجازت ہوتی تو میں یہ چاہتا کہ خسرو کو میرے ساتھ دفن کیا جائے۔ چونکہ یہ ممکن نہ تھا اس لیے آپ نے یہ وصیت کی کہ خسرو کی قبر آپ کے پہلو میں بنے، لیکن بعد میں اس پر عمل نہ ہو سکا اس لیے کہ بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا کہ اس طرح نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کی قبر میں مغالطے کا امکان رہے گا۔

حضرت نظام الدین کی نظر میں خسرو کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ جو بات آپ کے سامنے اور لوگ نہ کر سکتے، خسرو کر سکتے تھے اور اس لیے لوگ خسرو کے ذریعے ہی اکثر آپ سے عرض معروض کیا کرتے تھے، خسرو کی گونا گوں صفات کا آپ سے بڑھ کر اور کون قدر دان ہو سکتا تھا، جب خسرو نے اپنا تذکرہ، جو افضل الفواید کے نام سے مشہور ہے، لکھنا شروع کیا تو اس کے چند اوراق آپ کے ملاحظہ کے لیے پیش کیے۔ آپ نے انہیں دیکھ کر فرمایا کہ ''نیکو نوشتہ و نیکو نام کردہ'' (یعنی تُو نے خوب لکھا اور نام بھی اچھا رکھا ہے) آپ نے اس مسودے کو جگہ جگہ اپنے ہاتھ سے درست بھی کیا اور پھر حاضرین سے کہنے لگے کہ خسرو کے لیے واقعی یہ بات قابل فخر ہے کہ اس نے اتنی باتیں یاد رکھیں اور لکھیں، حالانکہ وہ ہر وقت سر سے پاؤں تک خیالات کے سمندر میں غرق رہتا ہے۔ لیکن خدا نے خسرو کے تمام اعضا کو علم اور دانش سے خمیر کیا ہے کیونکہ وہ دن رات خیالات کے بحر میں شناوری کرتا ہے اور ہزاروں موتی نکال کر لاتا ہے۔ یہ سن کر خسرو تعظیم بجا لائے اور کہنے لگے کہ ''یہ سب خیالات جو میرے دماغ میں آتے ہیں آپ ہی کی برکت سے ہیں، اس لیے کہ آپ ہی نے اپنی بابرکت تلقین سے میری تربیت کی ہے۔''[2]

دوسری طرف خسرو کے دل میں جو عقیدت مند اور نیاز مندی اپنے مرشد کی طرف پیدا ہو گئی تھی وہ ان کے کلام سے بخوبی عیاں ہے۔ بیعت کے بعد کوئی ایسی تصنیف نہیں ہے جس میں حضرت نظام الدین کی بزرگی اور کرامات کا ذکر یا ان سے اپنی ارادات کا اظہار نہ ہو، چنانچہ ''نہ سپہر'' میں کہتے ہیں:

خوش آن دم کہ من زاعتقاد ضمیر
گرفتم بحق دست آں دست گیر
بنہ بحر از آنجا مرا راہ شد
کہ کشتی مرا دست آں شاہ شد
من ازوی لعاب دہن یافتم
کہ زیں گونہ آب سخن یافتم
زلالم کہ خضر آب جوی ویست

بداں زندہ ام چوں زجوی ویست
دو قطرہ کز آن در دوات افگنم
بظلمت در آب حیات افگنم
چوں آں قطرہ از خامہ رانم برون
ازاں قطرۂ دریا فشا نم بروں
شد ایں قطرہا گرچہ گوہر نظیر
نگر دو محیط صفحہائے پیر
ولی زیں خجالت نیارم برو
کہ ہم زاں او می نثارم برو

اسی جذبۂ عقیدت کے ماتحت خسرو نے حضرت نظام الدین کے اقوال کو جمع کرنا شروع کیا اور ایک مختصر سا رسالہ، افضل الفوائد، جس کا ابھی ذکر ہو چکا ہے، تصنیف کیا۔ خسرو کو یہ خیال غالبًا خواجہ حسن کی اسی نوعیت کی کتاب فوائد الفواد کو دیکھ کر پیدا ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حسن کی تصنیف زیادہ ضخیم اور جامع ہے، لیکن خسرو کا رسالہ بھی بعض لحاظ سے قابلِ قدر ہے اور کم از کم اس حیثیت سے کہ یہ ایک نذرانہ عقیدت تھا جو شرف قبول بھی حاصل ہوا۔ اس رسالے سے بعض ان لوگوں کے نام بھی معلوم ہوتے ہیں جو اکثر حضرت نظام الدین کے گرد و پیش رہتے تھے اور ان میں خواجہ حسن برہان الدین غریب، شہاب الدین میرٹھی اور مغیث الدین ہانسوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

حضرت نظام الدین کی صحبت سے خسرو کو اطمینان اور سکون قلب حاصل ہو سکتا تھا، اس کی انہیں ان دنوں ضرورت بھی تھی اس لیے کہ جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے علاؤ الدین کے عہد میں وہ ایک حد تک اس فارغ البالی سے محروم ہو گئے تھے جس کے وہ اس سے پہلے عادی رہے تھے، دوسرے اسی زمانے میں انہیں دو اور بڑے صدمے برداشت کرنا پڑے یعنی ایک سال کے اندر ہی والدہ اور چھوٹے بھائی حسام الدین قتلغ دونوں کا انتقال ہو گیا اور اس طرح خسرو اپنی والدۂ مہربان کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئے اور ایک ایسے بھائی سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے جوان

کے دست و بازو تھے۔ اس بڑے اور جان کاہ صدمے کا ذکر انہوں نے اپنی مثنوی مجنون اور لیلیٰ میں بہت دردناک الفاظ میں کیا ہے۔ ان کے یہ اشعار بے ساختگی کلام اور سادگی زبان کا بہت اچھا نمونہ ہیں، اس لیے ان میں سے چند یہاں درج کیے جا رہے ہیں:

ماتم کدہ شد جہاں نیست
ماتم زدہ کیست کز جہاں نیست
زاں جملہ منم یکی دریں سوز
از روزی خویشتن بدیں روز
کامسال دو نور ز اخترم رفت
ہم مادر و ہم برادرم رفت
ماتم دو شد و غم دو افتاد
فریاد کہ ماتم دو افتاد
حیف است دو داغ چو منی را
یک شعلہ بس است خرمنی را
یک سینہ دو بار برنگیرد
یک سر دو خمار برنگیرد
چوں مادر من بزیر خاک ست
گر خاک بسر کنم چہ باک ست
اے مادر من کجائی آخر؟
رو از چہ نمی نمائی آخر؟
خنداں ز دل زمین بروں آی
بر گریۂ زار من بخشای
راندی بہ بہشت کشتی خویش
روتا فتنی از بہشتی خویش

امیر خسرو

ہرجا کہ زپائے تو غباریست
مارا ز بہشت یادگاریست
شیرازۂ جزو من ز تقدیر
آمیختہ خون تست باشیر
مہرے کہ بشیر شد فراہم
تا جان نرود کجا شود کم
گیرم کہ شدی ز دیدہ مستور
از سینۂ من کجا شوی دور
زانجا کہ نوازشت فزوں بود
گستاخی من زحد بروں بود
زاں بھی ادبی کہ بیش کردم
ایک ز فراق زخم خوردم
با ناز نماند دولتم جفت
ناز از چہ کنم چو دولتم خفت
نے نے کہ ترا چو نام زندہ است
خود دولت من ہمان بندہ است
نام تو پناہ خویش سازم
تعویذ کلاہ خویش سازم
روزی کہ لب تو در سخن بود
پند تو صلاح کار من بود
امروز ہم بمہر و پیوند
خاموشی تو ہمی دھد پند
دانم کہ تو در بہشت جاوید
رخشندہ تری ز ماہ و خورشید

امیر خسرو

چوں ست بر تو ہمسر من
فرزند تو و برادر من
قتلغ کہ مرا ز حق تبارک
بودہ است چونام خود مبارک
در معرکہ اژدھے نظیرے
در مستی بادہ شیر گیرے
روز از ہمہ سو برزم چوں تیغ
تیغ از ہمہ روچو برق درمیغ
آئین غزا تمام کردہ
دولت بقش حسام کردہ
در حملہ دوست چوں پدر شیر
نے ہم چو من شکستہ شمشیر
چوں حرف پدر ہمہ زبر کرد
ہم عزم ولایت پدر کرد
شد جان پدر ز جان او شاد
لیکن غم او بجانم افتاد
اے مونس و یاورم غم تو
نہ از دل کہ ز جان خورم غم تو
بے مونس بے رفیق و بے یار
چونی وچہ میکنی در آن غار
رفتی و توان زبا زوم رفت
نقد شرف از ترا زوم رفت
خواہم کہ بجستنت شتابم
جویم ولی از کجات یابم
بسیار شبت بشاد مانی

امیر خسرو

آمد صبوح کامرانی
دوران کہ قدح لبالبت داد
در خورد نشستن شبت داد
چہ شد کہ تنگ شراب گشتی
پیش از دگراں خراب گشتی
ہر نیم شبی و صبح گاہی
از حسرت تو بر آرم آہی
چوں تو نگی بسوی من راہ
از آہ چہ خیزدم ہمان آہ
دانم کے بدیں شغب فزائی
زانجا کہ تو رفتہ نیائی
لیکن چہ کنم کہ شکیبم
خود را بہ بہانہ می فریبم
نائی چوبکوششم فراچنگ
از بی گہری بدل نہم سنگ
سنگین کنم ایں دل پر آتش
کاتش باشد بسنگ درخوش
در سینہ نہم ز سوگواری
غمہای ترا بہ ہم گساری
نقش تو بدل نگار سازم
وز یاد تو یادگار سازم

یارب کہ برحمت گنہ شوی
از گرد گنہ بشوی شان روی
آمرزش خویش یار شان کن

امیر خسرو

بخشائش خود نثار شان کن
میداد بخلد شان فراہم
نوبت چو بمن رسد مراہم

لیکن اب علاؤالدین خلجی کا وقت بھی قریب آپہنچا تھا۔ وہ بیمار پڑا اور ایسا بیمار ہوا کہ صاحب فراش ہو گیا، بڑھاپے میں آدمی کی قدریوں بھی کم ہو جاتی ہے اور جب وہ بیکار ہو جائے تو ظاہر ہے لوگ اور بھی اس کی طرف سے غافل ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس کی اس علالت کے زمانے میں گھر کے لوگوں نے اس کی طرف خاص توجہ نہ کی اور اتنا عظیم الشان بادشاہ اپنے غلام ملک کافور کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ اس کی بیویوں کو اپنے بچوں کی بیاہ شادی کے مشغلے سے فرصت نہ ملتی تھی، بڑا لڑکا خضر خاں امروہے میں تھا دوسرے لڑکے ابھی نسبتاً ناسمجھ تھے، اور اس کے بھائی الماس بیگ اولوغ قتلغ کا، جو اس کا بڑا ہمدرد اور بازوے کار تھا، انتقال ہو چکا تھا۔ اب لے دے کر ملکہ جہاں کا بھائی الپ خاں ایک قابل اور وفادار ملک رہ گیا تھا۔ وہ اس زمانے میں گجرات کا حاکم تھا۔ ملک کافور کی نظر میں یہ ملک بہت کھٹکتا تھا، چنانچہ اس نے اسے آخر کسی حیلے سے قتل کروا دیا۔ اس قتل کا نتیجہ یہ ہوا کہ گجرات میں شورش اور فساد رونما ہو گیا اور ملک بھر میں ایک عام بے چینی رونما ہو گئی۔ ادھر خضر خاں کی طرف سے ملک کافور نے بادشاہ کو ایسا بدظن کر دیا کہ اس کا دہلی میں داخلہ بند ہو گیا اور اس نے غلطی کی کہ وہ باپ کی اجازت کے بغیر اس سے ملنے دہلی چلا آیا جس سے علاؤالدین کے شبہات میں اور اضافہ ہو گیا۔

واقعہ یہ تھا کہ خضر خاں کو خبر ملی کہ علاؤالدین کی حالت اب بہتر ہے۔ اس کی علالت کے سلسلے میں دعا کرنے کے لیے وہ مختلف زیارت گاہوں کا دورہ کر رہا تھا۔ اگرچہ بظاہر اس دورے میں بھی اس نے اپنے معمولی طریقے ترک نہ کیے تھے، چنانچہ خسرو کہتے ہیں:

چو بر رسم زیارت گاہ میرفت
ہزاراں رہزنش ہمراہ میرفت
بدستش طرہ سیمین غداراں
جو سبحہ درکف پرہیز گاراں [3]

بہر حال اسی چکر میں وہ ستنا پور بھی پہنچا، لیکن تعجب یہ ہے کہ اس نے اپنے پیر حضرت نظام الدین کی طرف رجوع نہیں کیا، اور چونکہ دہلی قریب تھا اس نے سوچا کہ باپ سے بھی ملتا جاؤں اب ملک کافور کو بادشاہ کے کان بھرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا اور اس نے خضر خاں کے لیے علاؤالدین سے گوالیار بھیج دیئے جانے کا حکم حاصل کر کے اسے دہلی سے چلتا کیا۔ علاؤالدین، خضر خاں کو بہت چاہتا تھا مگر اس وقت کچھ تو اس کی فطری سخت گیری اور کچھ بدگمانی دونوں مل کر جذبۂ محبت پر غالب آ گئیں۔ علاؤالدین کے اس فعل پر تعجب کرتے ہوئے خسرو کہتے ہیں:

> ''معاذ اللہ، نہ جانے علاؤالدین کا کیسا دل تھا کہ ایسا موتی اس کے نزدیک تھا، ایک ایسے قطرے کو، جو سمندر کی طرح تھا اور اسی سے ٹپکا تھا، اس نے یوں دور پھینک دیا جیسے ماتھے سے کوئی پسینے کی بوند پھینک دے، اس کا ضبط اور تحمل ایسا تھا کہ اگرچہ اس کی جان رخصت ہو رہی تھی، اس کا دل نرم نہ ہوا۔ اس کا عزیز بیٹا اس کی نظروں سے غائب ہو رہا تھا لیکن اس نے اپنی آنکھوں سے آنسوؤں کو نہ بہنے دیا۔''[4]

خضر خاں کے گوالیار جاتے ہی علاؤالدین کا انتقال ہو گیا۔ خسرو کے بیانات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاؤالدین سے جلدی پیچھا چھڑانے کے لیے غالباً ملک کافور نے اسے زہر دے دیا، کیونکہ وہ اکثر علاؤالدین کو شاہ شہید لکھتے ہیں اور ایک جگہ ملک کافور کو مہدی کش کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بہر حال اب ملک کافور کا راستہ صاف ہو گیا۔ اس نے خضر خاں کی ولی عہدی سے برطرفی کا حکم تو علاؤالدین سے لے ہی لیا تھا، اس کے ایک خورد سال بھائی شہاب الدین کو تخت پر بٹھا کر خود پوری سلطنت کا مالک بن بیٹھا اور اپنے ہم قوموں اور ہم مشربوں کو بڑے بڑے عہدے دینے شروع کر دیئے، بقول خسرو:

بہار فتنہ خلق از دور دیدند
کہ بار سنبل و کافور دیدند[5]

کسی کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ تخت دہلی کو اس کے پنجے سے نجات دلائے، لیکن کافور کی قسمت

میں زیادہ دن حکومت نہ لکھی تھی۔ شوال سنہ 715ھ کو علاؤالدین کا انتقال ہوا اور کافور نے حکومت سنبھال کر پہلا کام یہ کیا کہ خضر خاں کو گوالیار کے قلعے میں اندھا کر کے قید کر دیا۔ اس کے دو اور بھائیوں شادی خاں اور فرید خاں کا بھی یہی حشر ہوا۔ ایک اور بھائی مبارک شاہ ابھی باقی تھا اور یقین تھا کہ اس کا انجام بھی ایسا ہی افسوس ناک ہوتا، لیکن اس سے پہلے کہ کافور اسے کوئی گزند پہنچا سکے، اس کے اپنے بعض خاص مقربین نے سازش کر کے اسے ہزار ستون محل میں قتل کر دیا اور اس طرح مبارک شاہ جس کی عمر اس وقت کوئی بیس سال کی تھی کافور کی ایک مہینے کی مختصر حکومت کے بعد تخت سلطنت کا وارث بن گیا۔

آٹھواں باب

مبارک شاہ سے خسرو کے تعلقات، مثنوی نہ سپہر کی تصنیف، مبارک شاہ کا خسرو خاں کے ہاتھوں قتل، تغلق شاہ کا انتقام اور تخت نشینی، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا وصال اور خسرو کا انتقال

مبارک شاہ 24 محرم سنہ 716ھ کو قطب الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا اور ملک بھر میں عام طور پر اطمینان اور خوشی کا اظہار کیا گیا۔ اس لیے کہ ایک تو علاؤالدین کی بیس سال کی سخت گیر حکومت سے بعض لوگ تنگ آ گئے تھے اور دوسرے ملک کافور نے اپنی چند روزہ حکومت میں بے انتہا تشدد اور ظلم سے کام لیا۔ نیا بادشاہ نوجوان، خوش مزاج اور شوقین طبیعت کا تھا۔ برائے نام تو سلطنت میں شراب خواری ممنوع رہی لیکن لوگوں نے بادشاہ کی مثال کو پیش نظر رکھ کر چوری چھپے خوب رنگ رلیاں منانا شروع کیں، اور بقول برنی کوئی ایسا گھر نہ تھا جس میں میخانے کا گمان نہ ہوتا ہو، خوب صورت غلاموں اور لونڈیوں کی اتنی مانگ بڑھ گئی کہ ایک ایک کی قیمت بیس ہزار تنکے تک پہنچ گئی اور لوگوں نے عیش و عشرت کے لوازمات میں دل کھول کر پیسہ لٹانا شروع کر دیا۔ مگر آخر وہ کس باپ کا بیٹا تھا، جہانگیری کا شوق اس کے دل میں بھی سمایا، کبھی سوچتا تھا کہ مغلوں کی سرکوبی کے لیے ایک بڑی مہم لے کر روانہ ہو، کبھی ہندوستان کے بعض دور دراز حصوں کی تسخیر کے منصوبے باندھتا تھا، آخر رائے یہی ٹھہری کہ جنوبی ہند کا رخ کیا جائے۔ چنانچہ بادشاہ مع ایک بڑے لشکر کے دہلی سے روانہ ہوا اور دیوگیر پہنچا۔ یہاں راجہ رام دیو کے نائب راگھو نے مقابلہ کیا مگر شکست کھا کر پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا اور بادشاہ دیوگیر میں داخل ہوئے، خسرو بادشاہ کے ہمرکاب

تھے اور اس موقع پر انہوں نے ایک قصیدہ بھی لکھا تھا جس میں اس شہر کی بہت تعریف اور توصیف کی ہے۔ اس قصیدے سے، علاوہ اور دلچسپ باتوں کے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قطب الدین نے دیوگیر کا نام اپنے نام پر قطب آباد رکھا تھا، چنانچہ اس زمانے کے ایک سکے سے بھی خسرو کے اس بیان کی تصدیق ہو جاتی ہے۔[1]

دیوگیر سے بادشاہ نے اپنے خاص مقرب خسرو خاں کو جو گجرات کی قوم پروار یا براؤ سے تھا اور مسلمان ہو گیا تھا چتر اور فوج دے کر تلنگ کی جانب روانہ کیا اور خسرو خاں نے لدر دیو (رددادیوا) کی فوج کو شکست دے کر وارنگل یا ارنگل کا محاصرہ کر لیا، راجہ نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی اور علاوہ کئی بیش قیمت تحائف کے بیس لاکھ اچھو سالانہ خراج دینا منظور کیا، اپنے ملک کے پانچ موضعوں کو بھی بادشاہ کے سپرد کرنے کا وعدہ کیا لیکن بعد میں صرف بدرکوت یا بدرکوب کے حوالے کر دینے پر مصالحت ہو گئی اور خسرو خاں سب مال غنیمت لے کر دیوگیر پہنچا۔ وہاں سے بادشاہی لشکر بڑے تزک واحتشام کے ساتھ دہلی کی طرف روانہ ہوا، دہلی میں بادشاہ کے استقبال کی خوب تیاریاں کی گئی تھیں شہر کو قبوں اور بیش قیمت کپڑوں سے مزین کیا گیا تھا اور کئی دن تک فتح کی خوشی میں جلسے ہوتے رہے۔

مبارک شاہ نے ابتدائے عہد ہی سے خسرو پر خاص مہربانی شروع کر دی تھی، اس مہم سے واپسی پر ایک دن کئی شعرا موجود تھے اور یہ ذکر چلا کہ پہلے شاعروں کی بادشاہ کیسے قدر کرتے تھے اور ان کو کیا کیا انعام واکرام عطا کرتے تھے۔ مبارک شاہ نے کہا کہ ہم پچھلے بادشاہوں سے کم نہیں ہیں اور روپے کی بھی ہمارے پاس کمی نہیں ہے۔ اگر کوئی شاعر ہمارے عہد کی داستان کو نظم کرے تو ہم اسے ہاتھی کے برابر تول کر سونا دیں گے۔ آخر یہ کام خسرو کے سپرد ہوا اور انہوں نے مشہور مثنوی ''نہ سپہر'' مرتب کی، جو بعض لحاظ سے فارسی مثنویوں میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ اس مثنوی کے صلے میں خسرو کو ہاتھی کے وزن کے برابر سونا ملا، یا نہیں، یہ بہت مشتبہ بات ہے۔ اگرچہ ہم سعید مارہروی مصنف حیات خسرو، اور شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ انہیں واقعی یہ گراں قدر صلہ ملا تھا۔ خسرو محض یہ کہتے ہیں:

چنیں بخششی کز تو جم یافتم
ز شاہاں پشینہ کم یافتم

جس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انہیں خاطر خواہ انعام ضرور ملا ہوگا۔ ان کی عمر اس وقت ساٹھ سے متجاوز ہو چکی تھی خیال ہو سکتا ہے کہ ان کا جوش شاعری اب تک سرد ہو گیا ہوگا۔ لیکن مثنوی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑھاپے نے خسرو کی طبیعت میں کوئی افسردگی پیدا نہیں کی، وہی کلام کی بے ساختگی اور روانی، اسلوب کی دل کشی اور جدت، الفاظ کی مناسبت اور ترنم اس مثنوی میں بھی پایا جاتا ہے جو خسرو کے کلام کا خاصہ ہے، بلکہ ان کا یہ دعویٰ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ ان کے صندوق استخوانی میں بہت سے تحفہ ہائے آسمانی ایسے تھے جو انہوں نے اس دن کے لیے بچا رکھے تھے۔[2]

دکن کی مہم کے بعد مبارک شاہ کو سوائے عیش و طرب میں وقت گزارنے کے اور کوئی کام نہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو وہ بہت ہی بری عادتوں کا شکار بن گیا اور دوسری طرف مزاج میں رعونت اور تیزی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ اپنے آپ کو نہ صرف دنیاوی حاکم بلکہ مذہبی پیشوا بھی سمجھنے لگا اور ''خلیفہ رب العالمین'' ہونے کا دعویٰ کرنے لگا۔ ایک سازش کی وجہ سے، جو علاؤ الدین کے چچازاد بھائی اسد الدین نے کی تھی، اپنے بھائیوں خضر خاں وغیرہ سے، جو گوالیار کے قلعے میں بند تھے، بدگمان ہو گیا اور ان سب کو قتل کروا دیا اور پھر حضرت نظام الدین سے عناد اور مخالفت پر کمر باندھی۔ جس کا سبب غالباً یہ تھا کہ بدقسمت خضر خاں ان کا مرید رہا تھا۔ ان کی اہمیت اور رسوخ کم کرنے کے لیے شیخ جام اور ملتان کے شیخ رکن الدین کو دہلی بلوا کر شراب کے نشے میں کئی مرتبہ کہا کرتا تھا کہ اگر کوئی حضرت نظام الدین کا سر کاٹ کر لا دے تو اسے ایک ہزار سونے کے تنکے انعام دوں۔ اس کے ساتھ ہی مذہب سے بالکل لاپرواہی برتنے لگا اور دربار میں بھانڈوں اور بازاری عورتوں کا راج ہو گیا۔ خود زنانے کپڑے پہن کر دربار میں چلا آتا تھا اور ہزار ستون کی چھت پر سے رنڈیاں اور ڈومنیاں بڑے بڑے ملکوں اور امیروں کو، جن میں عین الملک ملتانی بھی شامل تھا، فحش گالیاں سنایا کرتی تھیں۔ تو یہ نامی بھانڈ بعض مرتبہ دربار میں مادر زاد ننگا ہو کر آیا کرتا تھا اور درباریوں کے سامنے بہت ناشائستہ حرکتیں کیا کرتا تھا۔[3]

خلیفہ ہونے کے دعوے کے ساتھ یہ نازیبا حرکتیں ظاہر ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو پسند نہ آتی ہوں گی اور چونکہ وہ ان پر معترض ہوتے ہیں اس لیے بادشاہ کا بغض اور بڑھتا چلا گیا۔ بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ اور مشائخ کی طرح وہ بھی اس کے دربار میں حاضری دیا کریں، لیکن جب دربار کی یہ حالت تھی تو حضرت نظام الدینؒ وہاں جانا کیسے پسند کرسکتے تھے۔ بادشاہ نے بلایا تو انہوں نے انکار کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جمادی الاول کے مہینے میں بادشاہ نے یہ دھمکی دی کہ اگر وہ اس مہینے کے آخری دن تک نہ آئے تو غیاث پور کی خانقاہ کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ اس دھمکی سے حضرت کے مریدوں میں بہت تشویش ہوئی اور انہوں نے انہیں سمجھا بجھا کر بادشاہ کے حکم کو مان لینے کی ترغیب دی، لیکن حضرت نظام الدین اولیاءؒ برابر انکار کرتے رہے۔ آخر وہ آخری دن بھی آ پہنچا لیکن اس کے ختم ہونے سے پہلے ہی مبارک شاہ کی زندگی کا ایک دم خاتمہ ہوگیا اور خاتمہ بھی اس کے چہیتے غلام خسرو خاں کے ہاتھوں۔

خسرو خاں نے آہستہ آہستہ اپنے ہم قوم لوگوں کو اپنے گرد و پیش جمع کرلیا تھا اور موقع کا منتظر رہتا تھا۔ جس دن یہ واقعہ ہوا اس روز رات کے وقت بادشاہ ہزار ستون کے ایک حصے میں خسرو خاں کے ساتھ تخلیے میں تھا۔ اس کے ساتھیوں کو پہلے سے اشارہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک دم درانہ محل میں گھس آئے۔ دربانوں کو قابو کر کے وہ اس حصے میں پہنچے جہاں بادشاہ اور خسرو خاں تھے۔ بادشاہ نے بھاگ کر حرم میں پناہ لے لینا چاہی، مگر خسرو خاں نے اسے اس کے بالوں سے، جو لمبے لمبے تھے، مضبوط پکڑ لیا اور بھاگنے نہ دیا۔ یہاں تک کہ اس کے ساتھیوں نے آکر مبارک شاہ کا سر کاٹ لیا اور چھت پر سے نیچے پھینک دیا، یہ خون آلود سر محل کے پاسبانوں کے درمیان جا کر گرا، جو ابھی تک بے خبر تھے کہ محل میں کیا ہو رہا ہے۔ ان میں بھگڑ مچ گئی اور خسرو خاں کا بہت آسانی سے محل پر قبضہ ہوگیا۔ اب اس نے دہلی میں جتنے بڑے بڑے امرا تھے سب کو پکڑوا بلایا اور مجبوراً انہیں خسرو خاں کو بادشاہ تسلیم کرنا پڑا۔ یہ زمانہ بہت پُر آشوب تھا۔ حرم شاہی کی بے حرمتی، مذہب کی توہین، امرا کی پکڑ دھکڑ، قتل و غارت غرض کوئی مصیبت ایسی نہ تھی جو ان دو تین مہینے کے اندر دہلی کی سلطنت پر نازل نہ ہوئی ہو، مگر ظاہر ہے کہ خسرو خاں کی یہ کامیابی دیرپا نہ ہوسکتی تھی۔ ملک تغلق جو اس وقت تجربہ کار شاہی سپہ سالاروں میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، مغلوں کی روک تھام کے لیے دیپال پور (قصور) کی حکومت پر متعین تھا۔ اس کا بیٹا جونا خاں جو بعد میں محمد تغلق کے نام سے

بادشاہ ہوا، دہلی میں تھا اور دیگر امراء کی طرح حراست میں لے لیا گیا تھا، لیکن وہ موقع پا کر بھاگ نکلا اور دیپال پور پہنچ کر اس نے سب کیفیت اپنے باپ کو سنائی۔ اپنے آقاؤں کے قتل اور تذلیل کی داستان سن کر ملک تغلق کا خون کھولنے لگا اور اس نے دہلی پر فوراً چڑھائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے سب بڑے بڑے صوبہ داروں کو خط بھیج کر انہیں اس کام میں اس کی مدد کرنے کی دعوت دی، جن میں سے بعض نے اس کی درخواست پر لبیک کہا۔ لیکن بعض ایسے بھی تھے کہ جو اپنے فرائض منصبی کو بھول گئے اور اپنے ذاتی مفاد کے خیال سے خاموش رہے۔ عین الملک ملتانی دہلی میں تھا اس لیے اس کے لیے کھلم کھلا بغاوت ناممکن تھی لیکن اس نے ملک تغلق کو اطمینان دلایا کہ اگر وہ دہلی پہنچا تو وہ خسرو خاں سے علیحدہ ہو کر اس کے ساتھ مل جائے گا۔ ادھر خسرو خاں نے جب ملک تغلق کے ارادوں کی خبر پائی تو اس نے بے دھڑک خزانہ لٹانا شروع کیا تا کہ امرا کو اپنا ہمدرد بنا لے اور یہی نہیں بلکہ دہلی کے مشائخ کو جن میں حضرت نظام الدین بھی شامل تھے بڑی بڑی رقمیں دیں کہ وہ اس کی کامیابی اور فتح کی دعا کریں۔

ملک تغلق اپنی تیاری مکمل کر کے دہلی کی طرف بڑھا اور جلد ہی شہر کے قریب آ پہنچا۔ اس سے پہلے خسرو خاں نے اپنے بھائی کو، جسے اس نے خانِ خاناں کا لقب دیا تھا، ایک بڑی فوج کے ساتھ جس میں مسلمان اور ہندو دونوں تھے، آگے روانہ کیا تھا اور یہ فوج سرسوتی تک پہنچ گئی تھی، لیکن ملک تغلق نے دریائے بہت (بیاس) کے کنارے پر اس لشکر کو شکستِ فاش دے کر پراگندہ کر دیا تھا۔ اب جب کہ تغلق کی فوج دہلی سے کچھ فاصلے پر رہ گئی تو وہ خود مقابلہ کے لیے نکلا، تغلق اس وقت حوض سلطانی کے پاس لہراوت میں خیمہ زن تھا۔ 30 رجب 721ھ کو دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی بہت سخت معرکہ ہوا اور قریب تھا کہ تغلق کی فوج کو شکست ہو جائے لیکن ملک تغلق کی بہادری نے لڑائی کا رنگ بدل دیا اور خسرو خاں اس کے بھائی اور ایک دو مسلمان سرداروں کے زبردست مقابلے کے باوجود دہلی کی فوج میں بھاگڑ مچ گئی۔ بہت کشت و خون ہوا اور خسرو خاں اور اس کا بھائی بھی جان بچا کر بھاگ نکلے، لیکن دوسرے دن دونوں گرفتار ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچے، اُسی ہزار ستون کی چھت پر سے، جہاں سے دو مہینے پیشتر بدنصیب مبارک شاہ کا خون آلود سر نیچے گرا تھا، اب اس کے بے رحم قاتل کا سر نیچے لڑھک رہا تھا۔

یکم شعبان سنہ 721ھ کو تغلق دہلی میں داخل ہوا اور چونکہ علاؤ الدین کی اولاد میں سے اب

کوئی وارث تخت وتاج کا نہ رہا تھا اس لیے سب ملوک اور امرا نے متفقہ طور پر اس سے درخواست کی کہ وہ حکومت کی بھاگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے، اور بہت کچھ تامل کے بعد اس نے یہ منظور کر لیا۔ اس طرح ہندوستان کا تخت وتاج اب خلجیوں کے ہاتھ سے نکل کر تغلق خاندان کے پاس آ گیا اور تغلق شاہ غیاث الدین کے لقب کے ساتھ اس خاندان کا پہلا بادشاہ ہوا۔ تغلق منکسر مزاج اور خوش خلق آدمی تھا، مذہب کا پکا تھا اور شعائر اسلامی کا بہت پاس کرتا تھا۔ اس کے بادشاہ ہونے سے ملک میں عام طور پر اطمینان کا اظہار کیا گیا اور چونکہ اس نے علائی خاندان کا انتقام لیا تھا اس لیے لوگوں کے دلوں میں اس کی قدر ومنزلت اور بھی بڑھ گئی تھی، چنانچہ خسرو نے بھی نئے بادشاہ کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا، اور مرثیے میں جو انہوں نے مبارک شاہ کے قتل اور تغلق کی تخت نشینی کے بعد کہا تھا تغلق شاہ کی یوں تعریف کرتے ہیں:

> ''بادشاہ غیاث الدین ابو مسلم ثانی ہے جس نے اپنی تلوار کے وار سے ثانیٔ حیدر کے خون کا انتقام لیا ہے۔ یہ وہ حامیٔ اسلام تغلق شاہ ہے کہ ستاروں نے سالہا سال کی گردش کے بعد ایسا دین پرور بادشاہ پیدا کیا ہے۔''[4]

تغلق شاہ بھی بظاہر ان کی بہت قدر ومنزلت کرتا تھا اور وہ اس کے عہد میں بھی اپنے منصب پر فائز رہے، لیکن برخلاف اس کے بادشاہ، حضرت نظام الدین کی طرف سے بدگمان رہا۔ جس کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ خسرو خاں نے جو بڑی بڑی رقمیں امرا اور مشائخ کو دی تھیں، تغلق شاہ نے بادشاہ ہونے پر وہ واپس طلب کیں، کیونکہ خزانہ تقریباً خالی ہو چکا تھا اور بغیر روپے کے حکومت کا انتظام محال تھا۔ ان میں سے بعض رقمیں اسے واپس بھی مل گئیں لیکن حضرت نظام الدین کو جو کچھ ملا تھا وہ اپنے لنگر خانے اور مستحق لوگوں کی امداد میں صرف کر چکے تھے اس لیے ظاہر ہے کہ وہ تغلق شاہ کے حکم کی تعمیل سے قاصر تھے، اور اس سے بادشاہ کو ان کی طرف سے سُوءِ ظن پیدا ہوا۔ دوسرا سبب یہ ہوا کہ دہلی کے بعض اور مشائخ نے جو یقیناً ان سے رقابت اور رشک رکھتے تھے، بادشاہ کا میلان مذہب کی طرف دیکھ کر حضرت نظام الدین کی شکایتیں شروع کر دیں کہ وہ سماع کو جائز سمجھتے ہیں اور ان کی خانقاہ میں گانا بجانا ہوتا رہتا ہے۔ بادشاہ نے حضرت نظام الدین کو دربار میں بلا بھیجا اور دوسرے مشائخ کے سامنے ان سے ان کے عقائد کے متعلق بہت سے سوال کیے جن کے انہوں نے بہت معقول جواب دیئے اور اس کے بعد بادشاہ کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ ان سے

مزید تعرض کرتا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پوری تشفی نہیں ہوئی اور وہ آخر تک حضرت نظام الدین سے منحرف ہی رہا۔

سنہ 723ھ میں تغلق شاہ نے اپنے بڑے بیٹے جونا خاںؔ ، جس کو اس نے چتر اور اولوغ خاں کا خطاب دے کر اپنا جانشین مقرر کیا تھا، دکن کی مہم پر روانہ کیا، اور وہ پہلے دیو گیر اور پھر وہاں سے وارنگل کی طرف روانہ ہوا، لدر دیو کی سرزنش مقصود تھی اس لیے کہ اس نے خراج کی رقم ادا کرنے میں لیت ولعل سے کام لینا شروع کر دیا تھا، لیکن جونا خاں کو ناکام واپس آنا پڑا اس لیے کہ بعض مفاد پرستوں نے، جن میں ایک شاعر عبید بھی شامل تھا، شاہی لشکر میں یہ افواہ مشہور کر دی کہ تغلق شاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر کے سننے سے سپاہیوں میں بددلی پھیل گئی اور مجبوراً اسے دہلی کا رخ کرنا پڑا۔ دہلی پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ افواہ بالکل بے بنیاد تھی۔ اس کے پھیلانے والوں کو سخت سزا دی گئی۔ ان ہی میں عبید کو بھی قتل کا حکم ہوا۔ یہ شاعر ایرانی النسل تھا اور ایران سے ہندوستان آیا تھا، خسرو سے اسے خاص پرخاش تھی اور اسی وجہ سے حضرت نظام الدین سے بھی معاندت رکھتا تھا۔ تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق اسے زندہ درگور کر دیا گیا، لیکن برنی نے لکھا ہے کہ اسے سولی پر چڑھا دیا گیا اور یہ روایت اس حکایت سے بھی مطابقت رکھتی ہے جسے مصنف تاریخ مبارک شاہی نے بیان کیا ہے، بدایونی نے بیان کیا ہے کہ اسے ہاتھی کے پاؤں تلے روندا گیا، بہرحال اسے اس بغض للّہی کی، جو اسے خسرو اور حضرت نظام الدینؒ سے تھا، عبرتناک سزا ملی۔[5]

کچھ عرصے بعد جونا خاں پھر دکن کی طرف روانہ ہوا اور اس مرتبہ وارنگل کے راجہ کی سرکوبی کے بعد بہت کچھ مال و دولت ساتھ لے کر واپس آیا۔ اب تغلق شاہ نے تعمیر کی طرف جس کا اسے خاص شوق تھا، توجہ کی اور تغلق آباد کا قلعہ تعمیر کیا جو دہلی کی عمارتوں میں بعض لحاظ سے نمایاں خصوصیات رکھتا ہے۔ ابن بطوطہ کے بیان سے جو محمد تغلق کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا اور خسرو کے ایک قصیدے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلعے کے اندر جو رہائشی محل تھا اس کی دیواریں سنہری تھیں اور بیچ میں ایک حوض تھا، جب دیواروں پر سورج کی کرنیں پڑتی تھیں تو آنکھوں میں چوکا چوند پیدا ہو جاتی تھی اور اس محل کی زینت و آرائش کا باقی سب سامان بھی اسی مناسبت سے تھا۔ آج جب ہم تغلق آباد کے شکستہ دمدموں اور منہدم دیواروں کو دیکھتے ہیں تو یہ بات ذہن میں بھی نہیں آسکتی کہ کسی زمانے میں یہ قلعہ اور محل ایسا شاندار اور بارونق ہوگا۔ زمانے کی گردش نے جہاں بڑی بڑی

سلطنتوں کے تخت الٹ دیئے وہاں ان سنگین عمارتوں کے سنگ وخشت کو بھی جنہیں چنتے وقت ان کے معماروں کو یہ خیال ہوگا کہ وہ ابدالآباد تک قائم رہیں گی، اکھاڑ پھینکا، اور جہاں کسی زمانے میں خسرو اور حسن جیسے شیریں مقال شاعروں کی آواز سے جگمگاتی ہوئی محفلیں گونج اٹھتی تھیں وہاں اب رات کے اندھیرے اور سناٹے میں بوم وشغال کی آوازوں کے سوا کچھ نہیں سنائی دیتا!

سنہ 723ھ میں غیاث الدین تغلق ترہت اور سنارگاؤں کی مہم پر روانہ ہوا، اپنے بیٹے جونا خان کو دہلی میں اپنا نائب بنادیا گیا اور امیر خسرو کو ساتھ لیا۔ بادشاہ کا یہ آخری سفر تھا، اس کے بعد اسے دہلی آنا نصیب نہ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت نظام الدین سے جو مخالفت اسے تھی وہ اب کچھ اور بڑھ گئی تھی اور اس نے سفر پر جانے سے پہلے انہیں یہ فہمائش کردی تھی کہ وہ اس کی دہلی واپسی سے پہلے دارالسلطنت سے کہیں دور چلے جائیں ورنہ ان کے لیے اچھا نہ ہوگا۔

چنانچہ جب تغلق مہم پر سے واپس ہوا اور دہلی کے قریب پہنچا تو حضرت نظام الدین کے معتقدین نے ان سے کہا کہ اب آپ دہلی سے چلے چلیں کیونکہ بادشاہ اب شہر سے قریب آتا جاتا ہے۔ حضرت نظام الدین نے اس کا صرف یہ جواب دیا کہ ''ہنوز دہلی دور ست'' اور اپنی خانقاہ میں اطمینان سے حسبِ دستور اپنے مشاغل میں مصروف رہے۔ اب دیکھئے کہ پردۂ قدرت سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ جب جونا خاں نے بادشاہ کی واپسی کی خبر سنی اور اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ جریدہ یلغار کرتا ہوا ایسی تیزی سے آرہا ہے کہ دہلی پہنچنے تک شہر میں اس کے استقبال کے لیے موزوں و مناسب انتظامات نہ ہوسکیں گے، تو اس نے یہ کیا کہ بادشاہ کے استقبال کے لیے دہلی سے کچھ دور نکل گیا اور افغان پور میں ایک عمارت عارضی قیام کے لیے مارا مار تیار کرادی، تا کہ بادشاہ دو ایک روز وہاں توقف کرے اور اتنے عرصے میں دہلی کے انتظامات مکمل ہو جائیں۔ بادشاہ نے وہاں پہنچ کر اس عمارت میں قیام کیا اور کھانا چنا گیا۔ کھانا ختم ہوا تو شہزادہ جونا خاں مع چند امرا اور ملوک کے جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا تا کہ ان ہاتھیوں کو جو وہ تلنگ سے لایا تھا بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار کرے، عمارت کے اندر تغلق شاہ اور اس کے خاص خاص آدمی رہ گئے تھے۔ اتنے میں ایک دم عمارت کی چھت نیچے آن پڑی اور قبل اس کے کہ بادشاہ کو ملبے کے نیچے سے نکالا جاسکے وہ راہیٔ ملکِ عدم ہو چکا تھا۔ یہ حالت اور واقعات ایسے ہیں کہ جن کی وجہ سے جونا خاں پر شبہ کیا جاسکتا ہے، اس لیے ابنِ بطوطہ اور بعض مورخین نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جونا خاں نے قصداً ایسی

عمارت تعمیر کی تھی اور اس کا باپ کے پاس سے بہانہ کر کے اٹھ جانا اس کی بدنیتی کا مزید ثبوت ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ محض سوء ظن ہے جس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جا سکتا، برنی نے اس قسم کا گمان اشارتاً بھی ظاہر نہیں کیا اور یوں بھی یہ بات مشکل سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ عمارت کو ایسی ترکیب سے بنایا گیا کہ ایک وقت معینہ پر اس کی چھت گر جائے، یعنی اس وقت جب جونا خاں باہر چلا جائے اور بادشاہ اندر موجود ہو، اس واقعے کو محض اتفاق سے تعبیر کرنا زیادہ قرین عقل ہے، یا پھر اگر حضرت نظام الدین والی روایت کو صحیح مانا جائے تو خوش عقیدہ لوگ اسے ان کی کرامات سمجھ سکتے ہیں۔[6]

بہر حال بادشاہ کو یوں جان سے جانا تھا سو گیا اور اب اس کا بیٹا جونا خاں ناصر الدین محمد تغلق کے لقب سے تخت دہلی کا مالک ہوا، یہ حادثہ ماہ ربیع الاول میں ہوا۔

اس واقعے سے پہلے ہی حضرت نظام الدین اولیا جن کی عمر اب پچانوے سال کی ہو چکی تھی علالت کی وجہ سے صاحبِ فراش ہو گئے تھے اور آخر وہ دن بھی آپہنچا جب آپ کا طائر روح بھی جسد خاکی سے پرواز کر کے اس عالم بالا میں پہنچ گیا جس کا پرتو یقیناً ان کی دنیاوی زندگی میں ان کے لیے مشعل ہدایت رہا تھا، وصال سے پہلے آپ نے اپنے خادمِ خاص اقبال کو بلایا اور اس سے کہا کہ خانقاہ میں جو بھی اناج یا روپیہ ہے سب غربا اور فقرا میں تقسیم کر دیا جائے اور ایک دانہ اناج کا یا ایک پیسہ بھی باقی نہ رکھا جائے۔ اس کے بعد اپنے خاص خاص مریدوں کو جمع کر کے انہیں وصیت کی اور انہیں مختلف جگہوں کے لیے اپنا نائب اور وارث نامزد کیا۔ اپنی چادر، عصا، سجادہ اور کشکول وغیرہ حضرت نصیر الدین روشن چراغ دہلی کو عطا کر کے انہیں دہلی میں اپنا جانشین مقرر کیا اور 18 ربیع الاول کو شام کے وقت آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ آپ کی تمام عمر زہد و عبادت میں اور برائی اور گناہ کے خلاف جنگ میں گزری اور آپ نے زمانے کے بہت سے انقلاب دیکھے۔ ایک بادشاہ کے بعد دوسرا تخت نشین ہوا ایک خاندان کا دور ختم ہوا اور دوسرے خاندان کا چراغ روشن ہوا، جنگیں اور لڑائیاں، فتنے فساد سب کچھ ہی ہوئے اور آپ کا قدم کبھی راہ راست سے نہ ڈگمگایا۔ بعض کوتاہ اندیش مورخین نے آپ کو اس زمانے کے بعد ناگوار واقعات سے تعلق ثابت کرنے کی سعی غیر مشکور ضرور کی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ کوئی قابل اعتماد تاریخی روایت ایسی نہیں ہے جس کی رُو سے آپ کے نیک نام پر کوئی دھبا آسکے یا آپ کے کردار اور اطوار پر حرف

گیری کا موقع مل سکے اور اگر شہرت جاوید اور عقیدت عام سے کسی فرد کی بزرگی اور تقدس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے تھے کہ حضرت نظام الدین دنیا کے اولیا میں ایک بہت ہی ممتاز رتبہ رکھتے تھے۔ حشیشین کے کسی داعی، ٹھگوں کے کسی سرغنہ یا ایک ریا کار سیاسی سازشی کے لیے یہ تو ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ عرصے کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اپنی اصل شخصیت کو ظاہری زہد اور تقوی کے پردے میں چھپا سکے لیکن زیادہ عرصے تک کوئی اس ڈھونگ کو نہیں نباہ سکتا، زمانے کی آواز سب سے بڑی آواز ہے اور وقت کا فیصلہ سب سے اہم فیصلہ، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اس قسم کے لغو اور رکیک الزاموں سے برارت کی اس سے بڑھ کر اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ ان کے انتقال کے سات سو سال سے زائد عرصے کے بعد آج بھی ان کی قبر زیارت گاہ خلق ہے اور ہر ملت و مذہب کے آدمی پروانہ واران کی درگاہ کی طرف چلے آتے ہیں۔ ان کے ہم عصر بادشاہوں کی شان و شوکت خواب و خیال ہو گئی، ان کی سر بفلک عمارتیں کھنڈر بن گئیں، ان میں سے بعض کے مزار بھی معلوم نہیں کہاں بنے اور کہاں غائب ہو گئے لیکن حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور ان کے منظور نظر شاگرد امیر خسرو کے مزار پر اب بھی وہی رونق وہی چہل پہل اور عقیدت مندوں کا وہی ہجوم اور وہی کثرت ہے جواب سے کئی سو سال پہلے تھی اور سبز چادروں پر پھولوں کی رنگین پتیاں اور اگربتیوں کے دھوئیں کی بھینی خوشبو اب بھی اس طرح جنت نگاہ اور فردوس مشام ہے جیسے ان کے انتقال کے چند روز بعد ہو گی۔

خسرو، جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، شاہی لشکر کے ساتھ ترہت کی مہم پر گئے ہوئے تھے، اس لیے وہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے انتقال کے وقت دہلی میں موجود نہ تھے، جب دہلی میں آئے تو یہ اندوہناک خبر سن کر رنج اور غم سے وارفتہ ہو گئے، کپڑے پھاڑ ڈالے اور منہ پر کالک مل کر ان کی قبر کی زیارت کو پہنچے وہاں آپ نے یہ دوہا پڑھا اور بے ہوش ہو کر گر گئے:

گوری سووے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے رین بھی سب دیس

اپنے مہربان پیر و مرشد کے انتقال کے بعد خسرو زیادہ عرصے زندہ نہ رہے، طبیعت افسردہ اور ملول ہو چکی تھی اور اگرچہ محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد ایک آدھ قصیدہ اس کی تعریف میں

کہا، شاعری سے بھی اب ان کا دل سرد ہو چکا تھا۔ انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اب میں زیادہ دیر زندہ نہ رہوں گا، چنانچہ وہی ہوا کہ 18 شوال کو وہ بھی اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

حضرت نظام الدین نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میرے پہلو میں دفن کرنا کیونکہ وہ میرا محرمِ اسرار ہے، چنانچہ خسرو کے انتقال پر لوگوں نے اس وصیت کے مطابق ان کی قبر حضرت نظام الدین کی قبر کے برابر بنانا چاہی، لیکن ایک خواجہ سرا نے، جو غالباً سلطان محمد تغلق کی طرف سے درگاہ کا متولی تھا، اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس طرح ان کی اور خسرو کی قبر میں لوگوں کو مغالطہ ہوگا۔ اس لیے خسرو کو حضرت نظام الدین کی قبر کی پائینتی دفن کیا گیا اور وہیں وہ اب محوِ خواب ہیں اور رہیں گے، جب تک کہ صورِ قیامت کی آواز پر زمین اپنے دفینوں کو ظاہر نہ کردے، اس دن وہ اور ان کے محترم استاد واقعی ایک دوسرے کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوں گے اور جنت میں داخل ہوں گے، یہ تو خدا ہی کو معلوم ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان دونوں کے نام ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ جو قرب اور خصوصیت خسرو کو اپنی زندگی میں حضرت نظام الدین سے تھی وہی مرنے کے بعد بھی باقی ہے اور اب بھی عقیدت مند زائر اپنے دل کی مراد خسرو ہی کے توسط سے نظام الدین اولیا کے حضور میں پیش کرتا ہے اور ان کے مزار پر جانے سے پہلے عقیدت مندی اور ارادت کے پھول خسرو کے مزار پر ضرور چڑھاتا ہے۔

بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بابر کے زمانے سے پہلے خسرو کے مزار پر کوئی پختہ عمارت نہیں بنی، یا اگر بنی تھی تو اسی زمانے تک مسمار ہو چکی تھی۔ اس لیے کہ باہر کی چار دیواری اور لوح، بابر ہی کے عہد میں ایک امیر مہدی خواجہ کی زیرِ نگرانی تیار ہوئی تھی اور لوح پر جو کتبہ ہے اسی عہد کے ایک شاعر شہاب معمائی کا کہا ہوا قطعۂ تاریخ ہے۔ اس کتبے کی رُو سے خسرو کا انتقال سنہ 725ھ میں ہوا اور اس کی تصدیق اور بیانات سے بھی ہوتی ہے، لیکن تاریخ اور مہینے میں اختلاف ہے۔ یعنی فرشتہ نے تاریخ وفات سے 29 ذوالقعدہ سنہ 725 ہجری لکھی ہے، لیکن سفینۃ الاولیا میں تاریخ 18 شوال دی گئی ہے اور غالباً یہ روایت زیادہ صحیح ہے کیونکہ خسرو کا عرس اسی تاریخ کو منایا جاتا ہے۔

مولوی ظفر حسن صاحب نے اپنی کتاب ''A Guide to Nizamuddin'' میں خسرو کے مزار کی جو کیفیت بیان کی ہے، وہ حسب ذیل ہے۔

امیر خسرو کا مزار ایک چھوٹے سے رقبے میں، جس کا طول اور عرض 28 فٹ 6/انچ اور 20 فٹ 7/انچ ہے واقع ہے۔اس کے چاروں طرف ایک سرخ پتھر کی جالی دار دیوار کھنچی ہوئی ہے،اس احاطے کا فرش سنگ مرمر کا ہےاور اندر داخل ہونے کے لیے جنوب کی سمت ایک دروازہ ہے اوراس طرف کچھ حصے پر پتھر کی سلوں سے چھت بھی بنادی گئی ہے،روضہ شکل میں مستطیل ہے اوراس کا طول اور عرض 16 فٹ 2/انچ اور 12 فٹ اور 6/انچ ہے،یہ سنگ مرمر کا بنا ہوا ہےاوراس پرایک گنبد دار چھت ہے جو بارہ ستونوں پر قائم ہےاور شمال اور جنوب کے رخ اس پر گلدستے بنے ہوئے ہیں،ستونوں کے بیچ بیچ میں جالی کے پردے لگے ہوئے ہیں،صرف جنوب کی سمت بیچ کا دَر کھلا ہوا ہے۔جس میں سے مزار تک جاسکتے ہیں،روضے کے باہر شمال کی طرف ایک سنگ مرمر کی لوح رکھی ہے۔جس پر کتبہ ہے۔یہ لوح 7/رفٹ 11/انچ سے 1/رفٹ ساڑھے چھ انچ ہے اور بابر کے زمانے میں نصب کی گئی تھی۔جنوب کی طرف ایک قبر بغیر کسی کتبے کے ہے۔جس کے متعلق روایت ہے کہ خسرو کے ایک بھانجے ماہرو نامی کی ہے۔خسرو کی قبر سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہےاوراس کے گرد سنگ مرمر ہی کا کٹہرا ہے،قبر ہمیشہ چادر سے ڈھکی رہتی ہےاوراس کے اوپر ایک سوتی شامیانہ یا چھت گیری لگی رہتی ہے کے کونے روضے کے چاروں کونوں سے بندھے ہوئے ہیں۔"

تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ 938ھ یعنی سنہ 1531 عیسوی میں ہمایوں کے عہد میں باہر کی چار دیواری کے اندر ایک اور چار دیواری بنائی گئی اوراس کا فرش سنگ مرمر کا بنایا گیا،قبر پر سنگ مرمر کا تعویذ بھی اسی زمانے میں رکھا گیا ہے،اس کے بعد سنہ 969ھ یا سنہ 1561ء میں اکبر کے زمانے کے ایک امیر شہاب الدین احمد خاں نے سرخ پتھر کی جالی دار دیواروں کے اوپر ایک قبہ بنوایا،اس کے بعد جہانگیر کے عہد میں خواجہ عماد الدین حسن کی سعی سے نیا قبہ اور ستون تعمیر ہوئے اوراس امیر اور بادشاہ جہانگیر کے کتبے دیواروں کے اوپر کے سروں پر موجود ہیں۔ان میں سے دو کتبے خسرو کے اپنے کلام میں سے ہیں،ایک میں تین شعر خواجہ نظام الدین کی تعریف میں حسب ذیل ہیں:

اے شربت عاشقی بجامت
وزیار زماں زماں پیامت

شد سلک فرید از تو منظوم
زانست کہ شد نقب نظامت
جاوید بقاست بندہ خسرو
چوں شد بہزار جان غلامت

دوسرے کتبے میں دو شعر ہیں جن میں خسرو کا نام معمے کے طریقے پر بیان کیا گیا ہے یعنی:

مرا نام نیکوست و خواجہ عظیم
دو شین و دو لام و دو قاف و دو جیم
اگر نام یابی تو زین حرفہا
بدانم کہ ہستی تو مرد فہیم

سنہ 1280ھ یا سنہ 1663ء میں ایک شخص میاں جان نامی نے مقبرے کے لیے ایک جوڑی تانبے کے کواڑوں کی نذر کی اور پھر سنہ 1886ء میں حیدر آباد کے محی الدین خان نے قبر کے گرداگرد ایک جالی دار کٹہرا سنگ مرمر کا لگوایا، گویا مزار کے مختلف حصے مختلف زمانوں کی یادگار ہیں، مولوی ظفر الحسن صاحب کے بیان کو ان تاریخی معلومات سے ملانے کے بعد یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ لوح مزار تو بابر کے زمانے کی ہے، قبر کا تعویذ اور اس کے گرد سنگ مرمر کا فرش ہمایوں کے عہد کا ہے، باہر کی سرخ پتھر کی جالی دار دیواریں اسی بادشاہ یا اکبر کے عہد کی یادگار ہیں۔ قبر کے اوپر کا قبہ اور ستون وغیرہ جہانگیر کے دور میں بنائے گئے، اور قبر کے گرد کا کٹہرا بہت حال کے زمانے میں یعنی 1880ء میں بنا۔

خسرو نے مرتے وقت دنیا میں کتنے وارث اور لواحقین چھوڑے، اس کی صحیح تفصیل ہمیں معلوم نہیں البتہ ان کی اولاد ضرور تھی۔ دو لڑکے تو ان کے سامنے ہی انتقال کر گئے تھے[7] اور ان کا مرثیہ انہوں نے لکھا ہے۔ ان کے ایک بیٹے ان کے بعد زندہ رہے اور کچھ شعر و شاعری کا شوق بھی رکھتے تھے، لیکن اس فن میں انہوں نے کوئی خاص شہرت حاصل نہیں کی[8] ان کی ایک بیٹی بھی تھی جسے انہوں نے اپنی مثنوی ''ہشت بہشت'' میں بہت سی نصیحتیں کی ہیں اور جو ممکن ہے ان کے بعد

زندہ رہی ہو، والدہ اور چھوٹے بھائی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ بڑے بھائی عزیز الدین علی شاہ غالباً ان کے بعد فوت ہوئے۔ خسرو کی رفیقۂ حیات کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں آتا۔ پرانے زمانے کے دستور اور قاعدے کی رُو سے بیویوں کا ذکر معیوب سمجھا جاتا تھا اس لیے خسرو سے تو یہ توقع ہی نہ تھی کہ وہ اس کے متعلق کچھ لکھتے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ برنی یا کسی اور مورخ اور تذکرہ نویس نے بھی یہ نہیں لکھا کہ ان کی شادی کہاں ہوئی تھی اور ان کی بیوی ان کے انتقال کے وقت حیات تھیں یا نہیں۔ لیکن اگر ہمیں خسرو کی اولاد ظاہری اور لواحقین کے متعلق کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں تو ان کی اولاد معنوی یعنی ان کے کلام اور تصانیف کے متعلق خوش قسمتی سے ہم بہت کچھ جانتے ہیں اور انہی کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔

حصہ دوم

تصنیفات

نواں باب

خسرو کی تصانیف کی تعداد اور بعض اُن تصنیفوں کا ذکر جو غلطی سے ان کی طرف منسوب کی گئی ہیں

خسرو کی تصانیف کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے، اس لیے کہ اس کے متعلق مختلف تذکرہ نویسوں نے مختلف بیان دیئے ہیں۔ ان کا ہم عصر مورخ برنی تو صرف یہ کہتا ہے کہ ان کی تصانیف اتنی تھیں کہ ان سے ایک کتاب خانہ بن سکتا تھا[1] یہی مصنف سیر الاولیا نے بھی لکھا ہے،[2] جامی کا بیان ہے کہ ان کی تصانیف کی تعداد ننانوے (99) تھی اور اسی بیان کو بعض تذکرہ نویسوں نے بھی نقل کیا ہے،[3] امین رازی نے اس تعداد میں اور اضافہ کر کے مجموعی تعداد ایک سو ننانوے (199) لکھی ہے چنانچہ انہی بیانات کو پیش نظر رکھ کر نواب اسحٰق خاں صاحب مرحوم نے مولوی سید حسن بلگرامی عماد الملک کے مشورے سے سنہ 1915ء میں خسرو کی تصانیف کی تلاش شروع کی۔ خیال یہ تھا کہ خسرو کی جس قدر بھی تصانیف دستیاب ہو سکیں انہیں جمع کر کے مناسب تصحیح اور ترتیب کے ساتھ شائع کیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نواب مرحوم نے یورپ، ترکی، مصر اور ہندوستان کے کتب خانوں کی فہرست کا مطالعہ کیا اور ہندوستان بھر میں اشتہارات کے ذریعے سے خسرو کی تصانیف کا کھوج نکالنے کی کوشش شروع کی، لیکن بہت جدوجہد اور کاوش و تلاش کے بعد انہیں صرف مندرجہ ذیل کتابوں کے نام معلوم ہو سکے:

(1) تحفۃ الصغر (2) وسط الحیواۃ (3) دیباچہ غرۃ الکمال (4) دیوان غرۃ الکمال (5) بقیہ نقیہ (6) مطلع الانوار (7) شیریں و خسرو (8) مجنوں ولیلیٰ (9) ہشت بہشت (10) آئینہ اسکندری (11) قرآن السعدین (12) خضر خانی یا عشقیہ (عشقیہ) (13) نہ سپہر (14) مفتاح الفتوح (15) مجموعہ مثنویات (16) مجموعہ رباعیات (17) کلیات (18) قصیدۂ امیر خسرو مشتمل پر داستان شاہ

نامہ (19) اعجاز خسروی (2) انشائے خسرو (21) احوال امیر خسرو (22) نہایۃ الکمال (23) خزائن الفتوح (24) نصاب بدیع العجائب ونصاب مثلث (25) افضل الفوائد (26) خالق باری (27) قصہ چہار درویش فارسی (28) باز نامہ (29) فرس نامہ یا اسپ نامہ (30) بحرالعمر (31) مرات الصفا (32) شہرآشوب یا مجموعہ رباعیات (33) تغلق نامہ (34) تاج الفتوح (35) تاریخ دہلی (36) مناقبِ ہند (37) حالات کنہیاوکرشن (38) مکتوبات امیر خسرو (39) جواہرالبحر (40) مقالہ (تاریخ الخلفاء) (41) راحۃ المحبین (42) رسالہ ابیات بحث :خسرو جامی (43) شگرف بیان (44) ترانۂ ہندی (45) مناجات خسرو۔

ان کتابوں کی فہرست دینے کے بعد نواب مرحوم لکھتے ہیں کہ ''باز نامہ اسپ نامہ بحرالعمر ،مرآت الصفا جن کے نام اس فہرست میں درج ہیں (مستقل تصانیف نہیں ہیں) بلکہ خسرو کی بعض تصانیف کے جزو ہیں، شہر آشوب کا ایک قلمی نسخہ لکھنو میں مل گیا، تغلق نامے کے متعلق اس سے زیادہ اب تک کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ میر مہدی مجروح کے پاس اس کا ایک نسخہ تھا، باقی تصانیف (یعنی نمبر 28 سے لے کر نمبر 45 تک میں سے باقی) کی بابت ہمیں ابھی تک یہ بھی پتہ نہیں لگ سکا کہ وہ کبھی ہندوستان میں موجود تھیں۔''

اس طرح گویا 45 میں سے 16 تصانیف تو بالکل نکل جاتی ہیں، باقی 29، ان میں سے بھی نمبر 3 اور 4 دراصل ایک ہی چیز ہیں، نمبر 16،15 اور 17 یقیناً امیر خسرو کے کلام سے انتخابات ہیں اور علیحدہ سے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ نمبر 20،18 اور 27 خسرو کی تصانیف ہرگز نہیں ہیں اور نمبر 26 کا بھی ان کی تصانیف ہونا بہت مشتبہ ہے۔ اس طرح صرف اکیس تصانیف ایسی رہ جاتی ہیں جو یقین کے ساتھ خسرو کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں اور یہ سب کی سب اس وقت موجود ہیں۔ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں ان 21 میں سے صرف تین یعنی نصاب بدیع العجائب و نصاب مثلث، شہر آشوب اور تغلق نامہ نہیں ہیں، باقی سب موجود ہیں اور اسی طرح انڈیا آفس کے کتب خانے میں بھی زیادہ تر موجود ہیں، اس فہرست کو مرتب کرنے کے بعد نواب اسحٰق خاں صاحب نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ خسرو کی زیادہ تر تصانیف تلف ہوچکی ہیں [4] کیونکہ اگر 99 کی تعداد کو صحیح مانا جائے تو گویا آدھے سے بھی کم عدد رہ جاتے ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ نتیجہ قرینِ قیاس نہیں، اس لیے کہ:

1۔ یہ صحیح ہے کہ خسرو بہت لکھنے والے تھے۔ ان کے منہ سے اشعار اتنی جلدی نکلتے تھے کہ قلم ان کا ساتھ نہ دے سکتی تھی۔ یہ بھی مسلم ہے کہ انہوں نے بہت چھوٹی عمر سے مشقِ سخن شروع کردی تھی اور کم از کم سولہ سال کے سن سے ان کا کلام اس پائے کا ہوگیا تھا کہ وہ اسے جمع کرنے کے قابل سمجھیں، لیکن خسرو کی جو تصانیف اس وقت موجود ہیں وہ بھی اتنی ہیں کہ یہ خیال مشکل سے ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کے علاوہ بہت لکھا ہوگا، اور اس لیے اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنی آخری عمر تک برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے تو بھی یہ سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ ان کا آدھے سے زیادہ کلام تلف ہوگیا اور ہمارے پاس اس کا بہت تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ خسرو نے اپنے مجموعی کلام کا کہیں کوئی اندازہ نہیں لکھا۔ اگرچہ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ خسرو اپنے اشعار کی مجموعی تعداد چار لاکھ بیت سے زائد اور پانچ لاکھ سے کچھ کم بتاتے ہیں[5] لیکن میری نظر سے ان کی کسی تصنیف میں یہ بیان نہیں گزرا اور اگر بالفرض خسرو نے ایسا کہا بھی ہے تو بقول شبلی بیت سے مراد مصراع بھی ہوسکتی ہے اور اس طرح خسرو کے کلام کی وسعت و کثرت کچھ زیادہ نہیں رہ جاتی۔ علاوہ ازیں اس بیان میں ان کی نثر کی تصانیف کا کوئی ذکر نہیں ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ خسرو نے اگر یہ لکھا تو کس زمانے میں لکھا، سوائے اس کے کہ یہ فرض کرلیا جائے کہ یہ ان کے مرتے دم کے الفاظ تھے۔ اس بیان سے ان کی تصانیف کے متعلق کوئی نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا، کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ اپنے انتقال تک برابر شعر کہتے رہے اس لیے ان کے کلام کی ضخامت کا صحیح اندازہ ان کے انتقال کے بعد ہی ہوسکتا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان کے انتقال کے کچھ عرصے بعد ان کے کلام کو جمع کرنے کی کوئی منظم کوشش کی گئی یا نہیں؟ جہاں تک ہمیں تاریخ سے پتہ چلتا ہے خسرو کے انتقال کے بعد دو سو برس بعد مرزا بایسنغر کو سب سے پہلے یہ خیال پیدا ہوا کہ خسرو کے کلام کو جمع کیا جائے، چنانچہ انہوں نے بہت کوشش اور جستجو کے کے بعد ایک لاکھ بیس ہزار بیت جمع کیے۔ لیکن اس کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ امیر خسرو کے کوئی دو ہزار بیت اور ایسے ہیں جو کسی دیوان میں درج نہیں ہیں، اس پر مرزا بایسنغر کو یہ محسوس ہوا کہ یہ کام یعنی خسرو کے تمام کلام کو جمع کرنا آسان نہیں ہے اور انہوں نے یہ جستجو ترک کردی،[6] بالکل ممکن ہے کہ اس کام میں مرزا بایسنغر کو ایک شاعر سیفی نامی نے مدد دی ہو کیونکہ یہ انہی کے زمانے میں تھا اور کہا جاتا ہے کہ اس نے امیر خسرو کا کلام جمع کر کے

اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا تھا اور اس کے اس مجموعے کا ایک نسخہ سینٹ پیٹرز برگ (پٹروگراڈ) کے کتب خانے میں موجود بھی ہے۔ بہر حال یہ بات ظاہر ہے کہ خسرو کے بعد کسی کو ان کی سب تصانیف کو جمع کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی اور اسی لیے یہ بیان کہ ان کی تصانیف ننانوے (99) تھیں زیادہ تر فرضی اور قیاسی معلوم ہوتا ہے خصوصاً اس لیے بھی کہ ان ننانوے تصانیف کے نام کسی نے بھی نہیں بتائے۔

2۔ یہ ایک افسوسناک واقعہ ہے کہ مغلوں کے دور حکومت سے پہلے ہندوستان میں مسلمان بادشاہوں کے زمانے میں جو کچھ بھی ادبی اور علمی کام ہوا وہ ہم تک بہت کم پہنچا ہے، جس کی وجہ یا تو پٹھان بادشاہوں کی بے توجہی ہو سکتی ہے اور یا مغل بادشاہوں کا تعصب، یہاں تک کہ صرف شاعری ہی کی صنف میں بیسیوں نام ہمیں اس زمانے کی تاریخ میں ملتے ہیں لیکن اب وہ ہمارے لیے محض نام ہی رہ گئے ہیں کیونکہ ان میں سے زیادہ تر شعراء کے حالات زندگی یا ان کے اشعار کے نمونے اب کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں مل سکتے۔ حالانکہ ان میں سے کئی صاحبِ دیوان تھے۔ بقول خسرو ان کے زمانے میں دہلی کا جو پتھر سرکاؤ اس کے نیچے سے ایک شاعر نکل آتا تھا۔ چمنِ دہلی کی فضا شیریں نغموں سے معمور تھی اور ہر شاخ پر ایک بلبل خوش نوا غزل سرا تھا[7] لیکن ان سب کا کلام اب ایسا محو ہو گیا ہے کہ اس کے ملنے کی آئندہ کوئی توقع نہیں ہو سکتی، اسی لیے یہ خیال ہو سکتا ہے کہ خسرو کی بھی بعض تصانیف گردشِ زمانہ سے نیست و نابود ہو گئی ہوں گی۔ یہ خیال ایک حد تک ضرور صحیح ہو سکتا ہے یعنی بالکل ممکن ہے کہ خسرو کی بعض غیر اہم چھوٹی موٹی تصانیف جنہیں خود انہوں نے کوئی خاص اہمیت نہ دی ہو غائب ہو گئی ہوں۔ مگر اس کے مقابلے میں ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اپنے زمانے کے شعرا میں خسرو کی ایک خاص حیثیت اور مرتبہ تھا، جسے اس تعلق کی وجہ سے جو ایک طرف انہیں دربار شاہی سے رہا اور دوسری طرف حضرت نظام الدین اولیاءؒ سے، اور بھی تقویت ہو گئی تھی۔ امارت اور ولایت کا یہ غیر معمولی طرۂ امتیاز اور اس کے ساتھ خسرو کے کلام کی مسلمہ خوبی، یہ سب باتیں ایسی تھیں کہ جنہوں نے مل کر ان کے کلام کے بیشتر اور زیادہ قابل قدر حصے کو زمانے کے غارت گر ہاتھوں کی پہنچ سے ضرور بچا لیا ہوگا، یہی باتیں ذرا کم حد تک خسرو کے ہم عصر خواجہ حسن کے کلام کی حفاظت کی بھی ضامن بن گئیں اور اسی لیے آج ہمارے پاس ان کا دیوان بھی کم و بیش مکمل حالت میں موجود ہے، لیکن خسرو میں ایک اور خاص بات یہ تھی

کہ انہوں نے اپنے کلام کے بہت بڑے حصے کو اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا اور اپنی تصانیف کے متعلق جو ہم تک پہنچی ہیں، ہم یہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان میں کوئی قابلِ اعتنا کمی بیشی نہیں ہوئی۔ نظم میں اس وقت ہمارے پاس خسرو کے پانچ دیوان، نو مثنویاں جن میں خمسہ بھی شامل ہے اور غزلیات کے متفرق مجموعے، جن میں سے غالباً ایک خسرو نے خود مرتب کیا تھا، ان تصانیف کی ضخامت اور حجم کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے نظم میں کوئی اور بڑی تصنیف بھی کی ہوگی۔ اس لیے ہم صرف خسرو کے ہندی کلام یا ان کی بعض غزلیات کے متعلق یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ تلف ہوگئیں کیونکہ ان دونوں کے متعلق خسرو خود یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ان کو کبھی جمع کرنے کا خیال نہیں کیا، اس لیے کہ وہ ان کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ممکن ہے کہ بعض غزلیں اور ہندی کی بعض چیزیں بھی ان کی طرف منسوب کر دی گئیں حالانکہ وہ ان کی نہ تھیں اس طرح اگر ایک طرف کمی تو دوسری طرف زیادتی ہوگئی۔ بہرحال غزلوں کے متعلق بھی یہ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی زیادہ تر تعداد محفوظ رہی۔

3۔ خسرو کی نثر کی تصانیف کا آغاز خود ان کے بیان کے مطابق اعجاز خسرو یا رسائل الاعجاز سے ہوا، جو سنہ 719ھ میں پورے طور پر مرتب ہوئی۔ اس کے بعد[8] وہ صرف پندرہ سولہ سال زندہ رہے، اس عرصے میں انہوں نے دو اور کتابیں یعنی خزائن الفتوح یا تاریخ علائی اور افضل الفوائد لکھیں، پندرہ سال کے قلیل عرصے میں خسرو سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ انہوں نے ان تین کتابوں کے علاوہ کئی اور تصانیف کی ہوں، یہ بالکل ممکن ہے کہ کچھ چھوٹے موٹے رسائل، خاص مضامین پر جن میں ان کو دلچسپی تھی، لکھے ہوں، لیکن ان کی تعداد یا اہمیت زیادہ نہیں ہوسکتی، اسی لیے اس قسم کی روایتیں ناقابلِ قبول معلوم ہونی چاہئیں کہ انہوں نے شیخ سعدی کی گلستان کا عربی میں ترجمہ کیا تھا،[9] تاریخ الخلفا جس کا نام خسرو کی تصانیف میں لیا جاتا ہے، واقعی ان کی تصنیف ہے یا نہیں، یہ کہنا مشکل ہے۔ اس کا ایک نسخہ میسور کی ٹیپو سلطان لائبریری میں ہے لیکن بغیر دیکھے اس کے متعلق رائے قائم کرنا مشکل ہے۔ بہرحال اگر وہ خسرو کی تصنیف ہے تو موجود ہے اور ضائع نہیں ہوئی۔ ایک مضمون جس کے متعلق خسرو خاص طور پر لکھ سکتے تھے، موسیقی ہے، لیکن اس کے بارے میں ان کے اپنے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے کوئی کتاب یا کم از کم قابلِ ذکر کتاب تصنیف نہیں کی، چنانچہ ایک موقع پر ایک موسیقی داں سے اپنے مناظرے

کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

نظم را کردم سہ دفتر ور بہ تحریری آمدی
علم موسیقی سہ دیگر بود ارباور بود[10]

جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیوان غرۃ الکمال کی تکمیل کے بعد انہوں نے موسیقی پر کوئی کتاب نہیں لکھی تھی۔

ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ خسرو کے کلام کا خواہ وہ منظوم ہو یا منثور، بیشتر حصہ اس وقت ہمارے پاس محفوظ ہے اور بہت کمتر حصہ ایسا ہو سکتا ہے جس کے تلف ہونے کا گمان کیا جائے۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر تذکرہ نویسوں نے ننانوے تصانیف کیوں لکھی ہیں؟ اس کا ایک جواب یہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مبالغے سے کام لیا ہے۔ دوسرے بالکل ممکن ہے کہ اس ننانوے کے عدد میں بعض تصانیف کے حصوں کو بھی علیحدہ اور مستقل تصنیف سمجھ لیا گیا ہو، اور تیسرے یہ کہ غلطی یا غلط فہمی سے بعض ایسی تصانیف خسرو کی طرف منسوب کر دی گئی ہوں، جو ان کی نہیں ہیں۔ چنانچہ مثال کے طور پر میں تین کتابوں کو لیتا ہوں جن کے نام بعض کتب خانوں کی فہرستوں میں خسرو کی تصانیف میں درج ہیں اور جن کے متعلق اب تک عام خیال بھی یہی تھا کہ وہ خسرو کے زور قلم کا نتیجہ ہیں، لیکن وہ موجودہ تحقیق کی رو سے یقیناً ان کی نہیں تھیں۔ یہ تین کتابیں قصہ چہار درویش فارسی، انشائے خسرو اور قصیدہ خسرو مشتمل بر داستان شاہ نامہ ہیں۔

قصہ چہار درویش کی اصل فارسی کتاب سے عام طور پر لوگ واقف نہیں ہیں، جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ کبھی چھپی نہیں۔ اگرچہ اس کے قلمی نسخے کئی جگہ موجود ہیں لیکن اس کے اردو ترجمے نے، جو اردو نثر کی پہلی اہم تصنیف ہے، کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کی اور اس میں شبہ نہیں کہ بعض لحاظ سے یہ ترجمہ بہت قابل قدر ہے۔ میر امن دہلوی نے ترجمے کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یہ قصہ امیر خسرو نے فارسی میں لکھا تھا اور جب ایک مرتبہ حضرت نظام الدین اولیا بیمار تھے تو امیر خسرو انہیں یہ قصہ سنا کر ان کا جی بہلایا کرتے تھے۔ یہ کہنا دشوار ہے کہ میر امن کے زمانے سے پہلے بھی اس قصے کی تصنیف کو امیر خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا تھا یا نہیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کا

ترجمہ چھپنے کے بعد سے اس روایت کو بلاچون وچرا تسلیم کرلیا گیااور ابھی حال کے زمانے تک کسی کواس کے غیر معتبر ہونے کا شبہ پیدا نہیں ہوا۔ترجے کو اصل سے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرامن نے قصے کی ترتیب میں کچھ نہ کچھ تصرف ضرور برتا ہے اور ترجمے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔فارسی اصل کو پڑھنے کے بعد ہر سمجھ دار آسانی سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ میرامن کا بیان قابل قبول نہیں یعنی یہ تصنیف خسرو کی نہیں ہو سکتی بلکہ ان کے بہت بعد کے زمانے،غالباً صفوی عہد میں ایران میں تصنیف ہوئی ہے،اوراس کے ثبوت میں مختصراً یہ باتیں کہی جاسکتی ہیں۔

1- کتاب کی طرز تحریر خسرو کی طرز سے بہت مختلف ہے۔

2- خسرو چونکہ شاعر تھے،نثر نویسی میں بھی ان کی یہ حیثیت باقی رہتی تھی یعنی ان کی تحریر میں اشعار کثرت سے ہوتے تھے،قصہ چہار درویش میں اشعار بہت کم ہیں اور جو ہیں ان میں سے ایک بھی خسرو کا نہیں ہے حالانکہ خسرو ہمیشہ اپنے ہی اشعار سے اپنی نثر کو بھی مزین کیا کرتے تھے۔

3- بہت سے ایسے الفاظ اور محاورات ہیں جو خسرو اور ان کے ہم عصر ادیبوں کی تحریر میں نہیں ملتے مثلاً خوشامدگو، حرامیاں (بمعنی چور)، چارسوق (بمعنی بازار)، قورچیاں، تالار (بمعنی تالاب) انگشت قبول برچشم نہادن، اوطاق (بمعنی کمرہ)،وغیرہ۔

4- بعض اصطلاحیں ایسی ہیں کہ جو یقیناً خسرو کے زمانے میں رائج نہ تھیں مثلاً تومان (ایک سکہ ایران کا)،دستر خوان،اشرفی، جیغہ، شیر مال، ترچکن (ایک کپڑا) قلیان، قہوہ، چارقب۔

5- مصنف کو فرنگیوں کے رسم ورواج سے واقفیت معلوم ہوتی ہے (ظاہر ہے کہ خسرو کو کبھی اہلِ یورپ سے سابقہ نہ پڑا ہوگا) چنانچہ ایک شعر ہے:

برہنہ سربرت آیم برسم و راہ فرنگ
کہ من گدائی فرنگم تو پادشاہ فرنگ

6- مصنف یقیناً شیعہ اثناعشریہ عقیدہ رکھتا تھا، قصے کے مطالعے سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوجاتی ہے۔

دوسری کتاب جسے خسرو کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور ان کی نہیں ہے۔ ''انشائے خسرو'' ہے۔ یہ چند خطوط کا مجموعہ ہے جو بہت مرصع عبارت میں لکھے گئے ہیں، تعجب ہے کہ اس کتاب کو کس طرح خسرو کی تصنیف سمجھ لیا گیا۔ اس لیے کہ اس میں مصنف کا نام تک ملتا ہے۔ یہ ایک شخص عبدالباقی نامی منشی امین آباد (دکن) تھا جس نے اپنے آقا مرزا ابراہیم بیگ ولد حسن علی خاں ترکمان کی طرف سے یہ خطوط لکھے تھے اور جو غالباً سترھویں صدی عیسوی یا اس کے کچھ بعد تک زندہ تھا، چنانچہ کتاب میں جو اشعار ہیں وہ مختلف شاعروں مثلاً خسرو، حافظ، نازنین، اوحدی، شاہی، عرفی، عارف اور جام وغیرہ کے کلام سے لیے گئے ہیں، مغالطے کی بنا، غالباً اس کتاب کے ابتدائی چند الفاظ میں یعنی ''عنوان نامۂ خیالات از مسنوی (مثنوی) خسرو صوری و معنوی بیار است الخ اور اس کے بعد دو شعر جو خسرو کی مثنوی عشقیہ سے لیے گئے ہیں، یہی تصنیف رام پور کی لائبریری میں ''خیالات خسرو'' کے عنوان سے موجود ہے۔

''قصیدۂ امیر خسرو مشتمل بر داستان شاہنامہ'' کا خسرو کی طرف منسوب ہونا بھی حیرت انگیز ہے۔ اس لیے کہ اس نظم میں چند اشعار ایسے ہیں کہ جن میں مصنف نے سن تصنیف خود ہی بیان کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

منت خدا ای را سخن سی ہزار بیت
گفتم بسہ صدو بدو سی بیت اندرا
بودہ است بر دو پنج صد از سال شصت و شش
کیں صفحہ رازدم بسر انگشت مسطرا

مصنف کا پورا نام معلوم نہیں، نظم میں صرف تخلص ''دہلوی'' موجود ہے:

یارب بحق آل پیمبر کہ دہلوی
زیں گفتہ ہا گرفتہ نگر دو بہ محشرا

اسی طرح کیا عجب ہے کہ اور بہت سی تصانیف کو وقتاً فوقتاً خسرو کی طرف منسوب کر دیا گیا ہو اور یوں ان کی تصانیف کی تعداد ننانوے بلکہ ایک سو ننانوے تک پہنچ گئی ہو!

بہرحال اب میں خسرو کی فرضی تصنیفوں کا ذکر چھوڑ کر ان کی اعلیٰ تصانیف کی طرف رجوع کرتا ہوں ان تصانیف کی تقسیم یوں کی جاسکتی ہے۔

اول نظم یعنی پانچوں دیوان جن کے نام علی الترتیب، تحفۃ الصغر، وسط الحیات، غرۃ الکمال، بقیہ نقیہ اور نہایۃ الکمال میں، خمسہ، تاریخی مثنویاں، غزلیات، ہندی کلام وغیرہ۔

دوسرے نثر یعنی اعجاز خسروی، خزائن الفتوح اور افضل الفوائد۔

دسواں باب

خسرو کے پانچ دیوان

پہلا دیوان۔تحفۃ الصغر:

یہ دیوان خسرو نے تقریباً 1671ء میں مترب کیا تھااوران کے بیان کے مطابق اس میں ان کے وہ قصائدوغیرہ درج ہیں جو انہوں نے 16 سے 19 برس کی عمر تک کہے تھے۔خسروکواپنے اس کلام کے متعلق قدرتی طور پر اطمینان نہ تھا،اس لیے کہ انہوں نے آغاز جوانی میں پرانے ایرانی اساتذہ مثلاً خاقانی،انوری اور سنائی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔لیکن ظاہر ہے کہ ایک نومشق شاعر کے لیے خواہ وہ کتنی ہی ذہانت طبع کیوں نہ رکھتا ہوان استادوں کا کامیابی سے مقابلہ مشکل تھا۔لیکن ان کے دوست تاج الدین زاہد نے ان کی ہمت افزائی کی اوراصرار کیا کہ انہیں اس کام کوضائع نہ کرنا چاہیے۔اس لیے کہ ان کے نقاد دوقسم کے لوگ ہوسکتے ہیں۔ایک تو وہ جو دانا ہیں اورایک وہ جو نادان ہیں،دانا تو نکتہ چینی کے وقت ان کی نوعمری اورابتدائی مشق کا ضرور لحاظ کریں گے اور جو نادان ہیں ان کا خیال کرنا خود نادانی ہوگی۔چنانچہ تاج الدین زاہد نے انہیں ''اس پراگندہ کلام کو مشاطۂ سخن بن کر ہو بہو ترتیب دینے میں بہت مدد دی۔''[1] اورآخرکار پہلا دیوان مکمل ہوکر لوگوں کے سامنے آگیا۔اس دیوان کے شروع میں خسرو نے ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں ان کی ابتدائی زندگی کے بعض دلچسپ حالات مندرج ہیں،اور ہر ایک قصیدہ یا ترکیب بند کے شروع میں ایک شعر ہے جو اس قصیدہ یا ترکیب بند کے مضمون کو مختصر طور پر واضح کرتا ہے۔یہ غالباً خسرو کی ایجاد ہے اوراس سے پہلے کسی شاعر کو اس کا خیال نہ آیا تھا۔اگر ان سب شعروں کو، جنہیں ابیات سلسلہ کہا جاتا ہے،ایک جگہ جمع کرلیا جائے تو ایک قصیدہ تیار ہو جاتا ہے،یعنی سب شعرایک ہی وزن میں ہیں اورایک ہی ردیف اور قافیہ رکھتے ہیں۔

دیوان تحفۃ الصغر میں کل پینتیس (35) قصیدے، پانچ ترجیع اور ترکیب بند، متعدد چھوٹے بڑے قطعات اور ایک مختصر سی مثنوی ہے۔ جس میں خسرو نے سرحدی علاقے کے ایک قلعے میں اپنی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ قصائد زیادہ تر غیاث الدین بلبن اور اس کے بڑے بیٹے سلطان نصیر الدین محمد قاآن کی مدح میں ہیں۔ بعض چند امرا مثلاً امیر علی، سرجاندار عرف حاتم خاں، اختیار الدین کشلو خاں، شمس الدین، قوام الدین اور عزیز الدین وغیرہ کی تعریف میں ہیں۔ ایک ترکیب بند میں عماد الملک کا مرثیہ ہے اور ایک میں دو پرندوں کا۔

خاقانی کے کلام کی عظمت، شکوہ الفاظ اور عالمانہ طرزِ بیان کو خسرو کے ان قصائد میں تلاش کرنا سعیٔ لا حاصل ہے۔ لیکن وہ شوخیٔ تحریر، سلاست اور روانی اور خوبیٔ اسلوب، جو اس دیوان کے قصیدوں میں پائی جاتی ہے، بڑے بڑے کہنہ مشق شاعروں کے کلام میں بھی مفقود ہے۔ مثلاً خسرو کے ان تین قصیدوں کا جن کے مطالعے ہیں:

1- صبح از کمین چورخ بہ تماشا برآورد
چرخ آتشیں حجاب براعضا برآورد
2- قلب خزاں را شکست تاختن نوبہار
3- اے بستہ ماہ روی تو مہر اندر آئینہ

اگر خاقانی کے ان قصائد سے مقابلہ کیا جائے جن کے جواب میں وہ لکھے گئے ہیں اور جن کے پہلے مصرعے حسب ذیل ہیں:

1- ہر صبح رخ ز گلشن سودا برآورم
2- کرد خزاں تاختن برسرِ خیال بہار
3- مافتنہ بر توایم و تو فتنہ برآئینہ

تو یہ صاف ظاہر ہو جائے گا کہ اگر چہ شاگرد بعض لحاظ سے استاد کی گرد کو نہ پا سکا، تو بھی بعض اور لحاظ سے اس سے بازی لے گیا۔ اسی طرح انوری کی طرز میں جو قصیدہ لکھا ہے اور جس کا پہلا مصرع یوں ہے کہ:

بازبلبل درغزل خوانی شدہ است

وہ بھی اس استاد کی ایک بہت اچھی نقل ہے۔

معمولی سی بات کو زورِ قلم سے خسرو ایک شاعرانہ رنگ دے کر ایسا مؤثر اور پُر کیف بنا دیتے ہیں کہ وہ ایک بڑا واقعہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ دو پالتو پرندوں کا مر جانا کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی، لیکن خسرو کا مرثیہ پڑھ کر یہ خیال ہرگز پیدا نہیں ہوتا کہ انہوں نے ایک غیر اہم چیز کو بے جا رنگ آمیزی سے اہمیت دینے کی کوشش کی ہے، بلکہ واقعی ایک درد انگیز اور رقت خیز مرثیہ معلوم ہوتا ہے اور شاعر کے اصلی جذبات اور احساسات کا عکس اس میں جھلکتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

چون شد گہ غروب ہمائی فلک نگوں
رفتم سوی قفس کہ کنم دانہ فزوں
دیدم فتادہ ہر دو نواز گرمیٔ ہوا
درآبدان و سرد شدہ ہر دو در دروں
بستہ نول ز آبخور دانہ چین دریغ
بگرفتہ روی سرخیٔ شان دارنہ چین دریغ
آن تر کہا شگافتہ سر غنچہ شان فسوس
و آن سینہ ما شگفتہ تر از یاسمین دریغ
آن پایہائی لعل چو گنج گیر نژاد
وآں چشم ہائی سرخ چو چشم نگین دریغ
پرہائے نرم و تر چو حریر خطا فسوس
پرہائے گرم و تازہ چو دیبائی چین دریغ

از آہ گرم تاج بسوزند ہدہداں
و مہائی سرد تاج صفت برسر آورند
از چشم چو ستارۂ خود بلبلان مست
بس خون خار تازہ کہ پیکر آورند!

کنجشک ہائے شانہ شدہ داغ دل چو شمع
مقراض ہائے نول بسوئی برآورند!
گرداند جمع طیر ابابیل در عزا
وز نوحہ رستخیز زبستان برآورند
مرغان سر بسر ہمہ درسوگ ماندہ اند
درصبح و شام غیر دعا شان نخواندہ اند
یا رب کہ آں دو نو بہ ارم جاودانہ باد
درکشت زار رحمت شان جا ودانہ باد
آمد چو زندگانی ایشان بہ منتہا
ہریک ازاں دو در صف مرغاں یگانہ باد
بر ہر درخت خلد کہ مرغان شوند جمع
یارب کہ شاخ سدرہ شان آشیانہ باد
وآں مرغ را کہ خدمت ایشاں کند بخلد
ازعون حق ناجیہ نور خانہ باد!
ہرناز و یارئی کہ نمودند ان دویار
اندر زبان جملۂ مردم فسانہ باد!
موئی زوصف شان نکنم نافروگذاشت
یا رب زبان تیز درازم چوشانہ باد!
وانکس کہ خواندہ ایں سخت بازبان تو
سلطانیا چو شعر توت جاودانہ باد

اس دیوان کی نظموں میں اپنا تخلص اکثر سلطانی کرتے ہیں، چنانچہ اوپر جس ترکیب بند کے اشعار نقل ہوئے ہیں، اس میں بھی یہی تخلص ہے۔ یہ دیوان اب تک نہیں چھپا، لیکن اس کے قلمی نسخے اکثر کتب خانوں میں موجود ہیں۔

دوسرا دیوان ۔ وسط الحیوٰۃ:

یہ دیوان بھی خسرو نے اپنے دوستوں اور قدر دانوں کے اصرار پر مرتب کیا تھا اور اگرچہ ان کے ایک بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں وہ نظمیں درج ہیں جو انہوں نے انیس سے لے کر چوبیس برس کی عمر تک کہی تھیں ۔ دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بعض ایسے قصائد وغیرہ بھی شامل ہیں جو خسرو نے بتیس بلکہ تینتیس سال کی عمر میں کہے تھے ۔ اس طرح دیوان کی تالیف غالباً 684ھ میں ہوئی ہوگی ۔ دیوان کے نام کا ذکر پہلے ایک عربی عبارت میں یوں کرتے ہیں:

بفضل الله قد سطرت هذه الصفحات و جعلتهاواسطة لبقاء الذات بعد الممات و ترجمتهابوسط الحيوٰة الخ اوراس کے بعد فارسی میں، ان الفاظ میں: چوں ایں لطائف زبدۂ لطف حیات بود بر مثال سواد جوانی و بر وسط زندگانی بر نہج کامرانی نام ایں فرخ نامہ فرح صفات وسط الحیوٰۃ کردہ شد۔''

یہ عبارتیں دیوان کے دیباچہ میں ہیں جو تحفۃ الصغر کے دیباچے ہی کی طرز پر لکھا گیا ہے اور جس سے شاعر کی زندگی کے بعض واقعات پر روشنی پڑتی ہے ۔ خسرو کو اس وقت غالباً یہ خیال نہ تھا کہ وہ اس کے بعد تین دیوان اور مرتب کریں گے اور نہ بظاہر ان کو یہ گمان تھا کہ ان کا زورِ سخن اور روانی طبع عمر کے ساتھ بڑھتی جائے گی ۔ اس لیے کہ دیباچے میں کہتے ہیں کہ آدمی کی عمر کا وہ حصہ جس میں وہ بہترین کام کر سکتا ہے جوانی اور درمیانی عمر ہے اور اگر اس زمانے اس نے کوئی قابلِ قدر چیز نہیں کہی تو آئندہ بھی اس سے کوئی توقع نہیں ہو سکتی ۔ بتیس سال کی عمر میں بقول (ان کے) ان کا کلام پورے شباب کو پہنچ گیا تھا ۔ آغاز جوانی کے کلام میں جوش اور ولولہ ضرور ہوتا ہے لیکن پختگی اور متانت نہیں ہوتی ۔ اسی طرح بڑھاپے کے کلام میں سنجیدگی اور پختگی ہوتی ہے لیکن وہ گرمی اور خروش مفقود ہوتا ہے جو جوانی کے کلام میں پایا جاتا ہے ۔ لیکن درمیانی عمر کے کلام میں یہ دونوں صفتیں موجود ہوتی ہیں ۔

اس دیوان میں کل اٹھاون قصیدے، آٹھ ترجیع بند اور متعدد قطعات اور رباعیات ہیں ۔ دیوان کے کل اشعار کی تعداد آٹھ ہزار چار سو اکتالیس ہے جسے آخری قطعے میں یوں بطور معما بیان کیا ہے:

واسطہ است از پئی حیات ابد!
ایں کتاب از چنین جستہ خطاب!
در شمردن زبیہائی نوش
ہشت ابر آمدہ است بربک آب
غیم یعنی کہ ہشت بار بخواں!
ما بہ یکبار دیدہ ایم صواب!
چار صد چہل یکست وہشت ہزار
ہمہ بیت از جمل کشادہ نقاب
ایں شماریست وضع بندہ کہ نیست
ہیچ کس را درو محل جواب

قصائد میں خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں:

حکم الحکم، (جس میں ملتان کے حادثہ فاجعہ کا ذکر ہے)، مروحۃ الروح (جس میں گرمی کے موسم میں ایک سفر کی مشقتیں بیان کی ہیں)، علم العلم اور راز ہار الانوار اور ترجیعات میں عین المعانی، روحیۃ الہلال اور حدیقۃ الحداقۃ شامل ہیں۔ قصائد زیادہ تر شہزادہ سلطان محمد شہید کی مدح میں ہیں۔ باقی قصائد میں حمد و نعت کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا، بلبن، کیقباد، بغرا خاں، اختیار الدین کشلو خاں، شمس الدین دبیر، تاج الدین الپابن اژدر، جلال الدین فیروز خلجی وغیرہ کی مدح میں ہیں۔ ترجیعات میں تین ایسی ہیں کہ جن میں سلطان محمد شہید کا مرثیہ کہا ہے، تین اس شہزادے کو خطاب کر کے لکھی گئی ہیں، ایک میں کیقباد کی تخت نشینی کا ذکر ہے اور ایک کشلو خاں کو مخاطب کر کے لکھی ہے، قطعات کی تعداد بیالیس ہے اور ان میں سے بعض میں ہم عصر ملوک اور امرا کو خطاب کیا گیا ہے۔ اس دیوان میں بھی تحفۃ الصغر کی طرح ابیات سلسلہ موجود ہیں۔ دیوان کے قلمی نسخے کم یاب ہیں اور نئی کلیات میں دیوان موجود نہیں ہے۔

وسط الحیوٰۃ میں تاریخی نقطۂ نظر سے اور ایک حد تک فنی نقطۂ نظر سے بھی، سب سے زیادہ دلچسپ وہی قصائد ہیں جن میں ملتان کے واقعے کا ذکر ہے۔ اگرچہ کیقباد کی تخت نشینی پر جو قصیدہ

لکھا ہے اور جس کا مطلع ہے:

سلطان معز دنیا و دین کیقباد شاہ
یک دیدہ و دو مردمک چار بادشاہ

بھی فنی حیثیت سے نمایاں خصوصیت رکھتا ہے تحفۃ الصغر کی طرح سے اس دیوان میں بھی بہت سے قصائد وغیرہ ایسے ہیں جن میں خاقانی کی پیروی کی گئی ہے۔ اسی طرح کمال اصفہانی کے مخصوص انداز میں بھی خسرو نے طبع آزمائی کی ہے۔ صنائع اور بدائع میں ایجاد کا خسرو کو ہمیشہ سے شوق تھا، اس دیوان میں بعض نئی صنعتوں کے نمونے ملتے ہیں، جن میں شائد ایک صنعت جسے وہ "حال موقوف" کہتے ہیں، قابل ذکر ہے۔ یہ تخلص یا گریز کا ایک نیا اسلوب ہے جو بعد کے زمانے میں خاصا مقبول ہو گیا تھا۔ مثلاً ایک قصیدے میں خسرو یوں گریز کرتے ہیں:

اکنوں کہ آب چشم بلاگشت مرمرا
چشم مرا کہ باز خرد از بلائی آب
سلطان مکرمت شرف الدین فتح ملک
ای آنکہ ریزی از سخن جانفزائی آب

یا ایک اور قصیدے میں کہتے ہیں:

ہنوز تا چہ کند کینہ ہائے غمزہ ورت
اگر بہ لطف برین بندہ مہرباں نہ بود

شہزادہ محمد شہید کے بعض مرثیوں کا ترجمہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ ایک اور مرثیے کے کچھ اشعار یہاں نقل کرتا ہوں:

بگہ دفن ہمی گفت بدارید مرا
درگل تیرہ بخواری نسپارید مرا

امیر خسرو

کامم از نکوسه مرگ لبالب خشک است
شربتی آب زہر دیدہ بیارید مرا!
پدر و مادر من خون شمایم آخر
قطرہ سازید وپس از چشم بیارید مرا
خاک دانید کہ اندر جگرم خواہد داشت
این چنیں در جگر خاک مدارید مرا!
باشماداشتم آخر حق صحبت یک چند
برجگر دید و حق آں بگوارید مرا!
اگر نیست زمانی بہ کشید بہ من
این چنیں بیکس و تنہا مگوارید مرا!
نقش گورم درون سوہمہ از خون منست
بیرونش از گریۂ خونیں بنگارید مرا!
پشت میخاردم از شورہ مگر خواہد ریخت
پشت از ناخن اشفاق بخارید مرا!
از شما باری زسرتا بقدم درخون ست
کہ من احوال شما ہیچ ندانم چوں ست
تنگ می ایم ازیں خانہ درم باز کنید
راہ شد بستہ زہر رہگورم باز کنید
آرزو ہاست کہ یک دم بشمادرنگرم
پردۂ خاک ز پیش نظرم باز کنید
روزنی نیست کہ نظارۂ عالم بکنم!
یک دو خشت از سر بالای سرم باز کنید
رخنۂ بار کنیدم کہ جہاں تاریک ست
درتواں بیشتری بیشترم باز کنید!

امیر خسرو

مردم دیدۂ من عزم تماشا دارد
پلک باہم شدہ از یکدگرم باز کنید
بند دیگر نہ نہید از گل و خشتم باری
چوں نیارید کہ بند خطرم باز کنید
مہر مادر پدر اندر جگرم درماندہ است
چوں برون می نرود از جگرم باز کنید
بشنوید از من افسانۂ دوری پدر
چوں شنید بہ پیش پدرم باز کنید

تیسرا دیوان۔غرۃ الکمال:

خسرو کا یہ تیسرا دیوان 693ھ میں مرتب ہوا۔اس میں زیادہ تر ان کی وہ نظمیں شامل ہیں جو انہوں نے چونتیس سال کی عمر سے لے کر تینتالیس سال کی عمر تک کہی تھیں۔اگر چہ بعد میں اس میں اور اضافہ ہوتا گیا، اس لیے کہ خسرو دیوان کے دیباچے میں خود کہتے ہیں کہ:

685ھ سے لے کر جب میرا سن چونتیس سال کا تھا، سنہ 693ھ تک جب میں تینتالیس سال کا ہوں، جو نظمیں بھی کاتبوں نے جمع کیں وہ سب اس مجلد میں درج ہیں اور اس کے بعد بھی جو کچھ ہوگا اسی میں شامل کیا جائے گا (بعد ازیں ہر چہ جمع اوفتد ہم دریں کارخانہ خرج شود)

اس دیوان میں بھی ابیات سلسلہ موجود ہیں، اور دیباچہ بھی ہے جو بہت مفصل ہے۔جس سے شاعر کے سوانح حیات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔اس کے علاوہ دیباچے میں کئی اور مضامین پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، مثلاً فنِ شاعری کی خوبیاں کیا ہیں، فارسی شاعری کو کس بنا پر عربی شاعری پر ترجیح دی جا سکتی ہے، شعر کی اقسام کیا کیا ہیں، ہندوستان کی فارسی شاعری کو کیوں امتیاز حاصل ہے، شاعری میں مہارت کن کن طریقوں سے پیدا کی جاسکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔اس میں شبہ نہیں کہ اگر چہ دیوان غرۃ الکمال کی نظمیں بہت قابلِ قدر ہیں لیکن اس کا دیباچہ زیادہ بیش قیمت چیز ہے۔ یہ دیوان خسرو کے پانچوں دیوانوں میں سب سے زیادہ بڑا ہے اور ان کے کلام کے

بعض بہترین نمونے اس میں موجود ہیں۔ چنانچہ خسرو کے مندرجہ ذیل مشہور اور معروف قصیدے اسی دیوان میں ہیں۔

1- جنات النجات۔ جس میں توحید خدا اور عقائد کا ذکر ہے اور جو سنائی کے قصیدے کے جواب میں لکھا گیا ہے۔

2- مرات اصفا۔ نعت اور پند و نصائح پر مشتمل ایک بہت طولانی قصیدہ ہے جو خاقانی کے مشہور قصیدہ شینیہ کے جواب میں لکھا گیا ہے، لیکن خاقانی کا قصیدہ تو چوبیس بیت کا ہے، جبکہ خسرو نے ڈیڑھ سو اشعار لکھے ہیں اور انہی کی تقلید میں جامی نے اپنا قصیدہ جلاً لروح (130 بیت) لکھا اور اسی طرح قصولی بغدادی نے ایک سو چونتیس بیت کا قصیدہ ''انیس القلب'' کے نام سے کہا اور عرفی نے چورانوے اشعار کا قصیدہ موسوم بہ عمان الجواہر تصنیف کیا۔

3- دریائے ابرار۔ یہ قصیدہ حضرت نظام الدین اولیا کی مدح میں ہے اور اس کی نقل بھی کئی بڑے شاعروں نے کی ہے۔ چنانچہ جامی نے لجۃ الافکار، اور نوائی نے بحرالافکار کے نام سے جواب لکھے ہیں۔ نوائی نے مجالس النفائس میں لکھا ہے کہ خسرو کہا کرتے تھے کہ اگر حوادث زمانہ سے میرا تمام کلام مفقود اور معدوم بھی ہو جائے اور صرف یہ قصیدہ باقی رہ جائے تو مجھے کچھ فکر نہ ہوگی۔ اس لیے کہ جو کوئی اس قصیدہ کو پڑھے گا وہ اقلیم سخن میں میرے مرتبے اور قابلیت کا معترف ہوگا[2] خسرو، جامی اور نوائی کے ان معرکۃ الآرا قصیدوں کے پہلے مصرے علی الترتیب یوں ہیں۔

1- کوس شہ خالی و بانگ غلغلش اندر سراست

2- کنگر ایوان شہ کز کاخ کیوان برتر است

3- آتشیں لعلی کہ تاج خسروان راز بور است

4- نظام الدرر۔ یہ قصیدہ بھی زیادہ تر مضامین تصوف اور پند و نصائح پر مشتمل ہے۔

باقی قصائد زیادہ تر مدحیہ ہیں۔ جن میں جلال الدین فیروز خلجی، اس کے دو بیٹوں ارکلک خاں اور ابراہیم قدر خاں، علاؤالدین خلجی اور اس کے بھائی الماس بیگ اولوغ خاں، اختیار الدین علی بن ایبک اور بعض اور امرا کی تعریف ہے۔ کل تعداد قصائد نوے 90 سے زائد ہے یعنی اگر ترجیعات کو بھی شامل کر لیا جائے۔ ترجیعات میں ایک بہت عمدہ، نظام خاقانی کی تقلید میں لکھی گئی ہے جس کا مضمون نعت رسولؐ ہے۔ ایک اور ترجیع جس کا نام نورالنور ہے، جلال الدین فیروز خلجی

کے نام سے ہے، ایک میں علاؤالدین خلجی کی مدح، اس کے ایک لڑکے کی پیدائش اور اس موقع پر دہلی کی آرائش اور آئینہ بندی کا ذکر ہے۔ ایک شہزادہ محمود خان خاناں کا مرثیہ ہے جو فیروز خلجی کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور ایک میں خود خسرو کے ایک بیٹے کا مرثیہ ہے۔

قصائد اور ترجیعات کے علاوہ اس دیوان میں کوئی نو مثنویاں ہیں جن میں مثنوی مفتاح الفتوح بھی شامل ہے۔ اس مثنوی کو بعض تذکرہ نویسوں نے ایک مستقل تصانیف خیال کیا ہے۔ لیکن سلسلہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بھی دیوان غرۃ الکمال کا ایک جزو ہے۔ اگر چہ اس مثنوی کا حجم اور اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ اس پر علیحدہ تبصرہ کیا جائے، اور اسی لیے تاریخی مثنویوں کا ذکر کرتے ہوئے میں اس مثنوی پر بھی روشنی ڈالوں گا، ایک مثنوی 1263 اشعار کی ہے جسے اودھ سے تاج الدین زاہد کو شاعر نے ایک خط کی شکل میں لکھ کر بھیجا ہے۔ اس خط کا ذکر پہلے آچکا ہے یہ مثنوی 686ھ میں لکھی گئی تھی۔ ایک اور مثنوی میں خسرو نے امیر علی سرجاندار عرف حاتم خاں کو مخاطب کر کے ایک گھوڑے کی مصیبت کی داستان لکھی ہے۔ جو اس امیر نے خسرو کو دیا تھا، یہ مثنوی خسرو کی مخصوص ظرافتِ طبع کا اچھا نمونہ ہے اور بہت دلچسپ پیرایے میں لکھی گئی ہے۔

دیوان میں بہت سے قطعات، رعبایات اور غزلیں بھی ہیں۔

خسرو نے غرۃ الکمال کے قصائد میں بھی حسب معمول پرانے اساتذہ کی پیروی کی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دیوان کے سب قصائد دوسرے شعرا کے کلام کے جواب میں لکھے گئے ہیں، بلکہ بہت سے قصیدے ایسے بھی ہیں جو طرز اور اسلوب میں بالکل اچھوتے ہیں اور جہاں کہیں خسرو نے کسی شاعر کی نقل کی ہے، وہاں بھی اپنے خاص انداز کو ترک نہیں کیا مثلاً ایک قصیدے تشبیب جو ظہیر فاریابی کے مشہور قصیدے کے جواب میں لکھا گیا ہے، یوں ہے:

شیرین دہان یار کہ راحت بجان دہد
آبِ حیات زان لب شکر فشاں دہد!
ایمک ز کشتگان جفایش یکی منم!
کس رامباد کا ن لب شیرین زبان دہد
عمری رود کہ باد نیارد ز دوستاں

آں شوخ را خدائی دل مہرباں دہد
شیریں سوار من چہ خبردارد از جہان
مسکین کسی کہ بدیش از دوردجان دہد
گم شد دلم کنون من و شبہائی کوئی دوست
باشد کسی ز گم شدۂ من نشان دہد!
اے باغبان ز سوز دل بلبلاں بترس
گل را رہا مکن کہ صبا راعنان دہد!
پرخون شد از پیالہ درونم کہ ماجرا
ہر لحظہ بوسۂ بلب آن جوان دہد!
ساقی مگرچہ دشمن جان شد مرا کہ من
مست و خواب واوہمہ رطل گران دہد!
کارمن از شراب بدین جایگہ رسید
و آن ناخدائی ترس مرا خود ہمان دہد!
آخر رسید دور من آن مست ماز کو
ما یک مئی بدست خودم در دہان دہد
کارم شدہ است ہم نزیم گر پیالہ را
خود چاشنی کند بہ من ناتواں دہد
ز آبِ حیات شست دہن راہزار بار
تا بوسہ برکاب شہ کامران دہد
سلطان جلال دین کہ گہ تخت برشدن
چرخش زہفت کرسی خود نردبان دہد
فیروز شاہ کہ صیت بلندش زمان زماں
از شرق تا بغرب ندائی اماں دہد

اگر خسرو کے اس قصیدے کا، ظہیر کے قصیدے سے، جس کا مطلع ہے:

امیر خسرو

شرح غم تو لذت شادی بجان دہد
لعل لب تو طعم شکر در دہان دہد

مقابلہ کیا جائے تو خسرو کی فن کاری اور ذوق شعر کی خوبی کا اندازہ اچھی طرح ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ایک اور قصیدے کی تشبیب میں عید کی آمد کا ذکر یوں کرتے ہیں:

عیداست و خوباں نیم شب درکوی خمار آمدہ
سرمست گشتہ صبحدم غلطان بیازار آمدہ
عید آمد از چرخ بریں برشاد مانی شد زمین
مہ را چو زریں طاس بیں از بہر خمار آمد
باظلمت شب شکل مہ چون ناخن شیر سیہ
مشرق در بند افتان و خون بار آمدہ
گوئی کہ ابر اندر فلک پیلی است آن بی ہیچ شک
وآں پیل را زریں کشرک برسرنگیں سار آمد
ہرکس بکف بودہ ملی ہر دل شگفتہ چون گلی
وزکرس ہر سو غلغلی بر چرخ دوار آمدہ
شب کس بخستہ خواب را جو یان گلاب ناب را
برگ مے و جلاب را ہر سُو خریدار آمدہ
آنکہ سپیدہ کرد اثر در صبح عیدی کن نظر!
وزمی رخ مستان نگر چوں برگ گلنار آمدہ
درخانہ ہر خورشید وش گلگونہ نہ کردہ خوش
مژگان جو تیر نیم کش لبہا چوسوفار آمدہ
کردہ نگاریں دست و پا بربانگ دف نغمہ سرا
وزنغمہ ہائی دلربا بر جان ستم کار آمدہ
باز از لطافت ہر پسر کردہ لباس نغز وتو!

هر یک بر آئین دگر خوں ریز و عیار آمده
درعید گہ گشتہ روان ہر سوی چوں سروی رواں
ہم عقل بردہ ہم رواں؟دزد وطرار آمدہ
بربافتہ جعد سیہ و زناز کژ کردہ گلہ!
از روی ایشان عید گہ بغما و فرخار آمدہ
راندہ براق صف شکن درعید گہ شاہ زمن
بستہ بگردش انجمن شیران پیکار آمدہ
ترکان عنان کردہ بلہ کوس آمدہ در غلغلہ
در دشت و صحرا زلزلہ از قلب جرار آمدہ

ایک اور قصیدے کے بعض اشعار حسب ذیل ہیں۔ یہ قصیدہ بظاہر رمضان کے مہینے میں لکھا گیا تھا۔

مدار جان من از بہر جان من روزہ
ارزان کہ جانی و جان راعنا دہد روزہ
بست پر ازمی وگوئی کہ روزہ می دارم
تو خود بگوئی کہ باشد چنیں روا روزہ
اگر تو روزہ برائی خدائی می داری
مدار بیش برائی خدائی را روزہ
ز دیدہ ساختہ ام شربتی و می نخوری
اگر ز روزہ ترا خوش بود خوشا روزہ
شدی ز روزہ ہلالی ز ابر دیدۂ من
نہان مباش وکن عید من مہا روزہ
ز تاب روی تو شبہائی روزہ جملہ برفت
بماند متصل از نور روزہ با روزہ

امیر خسرو

بخانۂ کہ تو باشی چوشب نخواہد شد
روی چو خورشید و برکشا روزہ
یک ابروت نگرم روزہ گیرم از پی وصل
بدیدن دگر ابرو رہا کنم روزہ!
کمر مبند و میار آفتاب در جوزا
مکن دراز برین جان جتلا روزہ
ببرد تشنگی خلق را کہ از لب تو
بآب چشمہ حیوان شد آشنا روزہ
ندانم از چہ عنیں دیر می رود ماناک
شد از لب تو شکریا شکر لبا روزہ
دری کشاودہانت دکان حلوا را
کہ کرد حلقۂ آن باز لیبیا روزہ

غرۃ الکمال کے دیباچے میں خسرو نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ غزل کی کوئی خاص وقعت نہیں ہے۔ اس لیے کہ جو کوئی دو چار شعر موزوں کرسکتا ہے وہ غزل گو مشہور ہو جاتا ہے، اور اسی لیے دیوان میں انہوں نے غزلوں کو جگہ نہیں دی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں انہوں نے اپنی رائے میں تبدیلی کر کے کچھ غزلیات بھی اس دیوان میں شامل کردیں، جو اب دیوان کے نسخوں میں موجود ہیں۔ کیونکہ ابیات سلسلہ کے دو شعر ایسے ہیں جو یقیناً غزلوں کے مجموعے ہی کے لیے لکھے گئے تھے وہ شعر یہ ہیں:

دردولیست ہر غزلم زان سبب کہ ہست
خلق بتان بلائی دل و فتنہ این خیال
ابیات عاشقانہ نگہ کن کہ ہر یکی
دارد سواد کونہ و خوش چوں شب وصال

بلکہ غالباً نہ صرف دیوان غرۃ الکمال کے ساتھ بلکہ اپنے ہر ایک دیوان کے ساتھ خسرو نے غزلیں ضرور شامل کیں۔ اگر چہ یہ ممکن ہے کہ ان غزلوں کی تعداد میں مختلف نسخوں میں کمی بیشی ہو گئی ہو، اس طرح اس دیوان کے ساتھ بہت سی رعبایات بھی ہیں جو ممکن ہے اس ''شہر آشوب'' کا ایک جزو ہیں جس کا ذکر خسرو کی تصانیف میں کیا جاتا ہے۔

غرۃ الکمال کے دیباچہ میں ایک بات خاص طور پر دلچسپ ہے، اور وہ یہ کہ خسرو ایک تو ہندوستانی شعراً کی ذہانت اور موزونی طبع کو سراہتے ہیں اور دوسرے ہندوستان کی فارسی زبان کو اور ملکوں کی فارسی سے خالص تر بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''ہندوستان کے عالم خصوصاً جو دہلی میں مقیم ہیں، ان تمام اہلِ ذوق سے، جو دنیا میں کہیں بھی پائے جاتے ہیں، فنِ شعر میں برتر ہیں۔ عرب، خراسانی، ترک وغیرہ جو ہندوستان کے ان شہروں میں آتے ہیں جو اسلامی حکومت میں ہیں مثلاً دہلی، ملتان، یا لکھنوتی، اگر ساری عمر بھی یہاں گزار دیں تو اپنی زبان نہیں بدل سکتے اور جب شعر کہیں گے تو اپنے ملک کے محاورے ہی میں کہیں گے۔ لیکن جو ادیب ہندوستان کے شہروں میں پلا بڑھا ہے، خصوصاً دہلی میں، بغیر کسی ملک کو دیکھے یا وہاں کے لوگوں سے ملے اس ملک کے لوگوں کی طرز میں لکھ سکتا ہے بلکہ ان کی نظم ونثر میں تصرف کر سکتا ہے اور جہاں بھی چلا جائے وہاں کی روش کے مطابق بخوبی لکھ سکتا ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہمارے بعض علما نے عرب جائے بغیر عربی میں ایسی دسترس حاصل کر لی ہے کہ عرب کے بڑے بڑے اساتذہ کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ میں نے بہت سے ایسے ترک اور تاجیک دیکھے ہیں کہ جنھوں نے ہندوستان میں رہ کر ترکی زبان کو ایسی اچھی طرح سیکھ لیا اور ایسی روانی سے بولنے لگے کہ خالص ترک جو خراسان سے آتے تھے، حیران رہ جاتے تھے۔ اسی طرح اگر چہ فارسی زبان کا اصل وطن ایران تھا، اب اس زبان کی پاکیزگی سب جگہ، سوائے ماوراالنہر کے معدوم ہو چکی ہے اور ماوراالنہر کی زبان وہی ہے جو ہندوستان کی ہے۔ مثلاً خراسانی چہ کو چی کہتا ہے اور بعض کجا کو کجو کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ لکھے ٹھیک جاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان کی فارسی دریائے سندھ سے لے کر سمندر کے ساحل تک ایک اور یکساں ہے۔ چونکہ ہمیں محاورے کی یہ یکسانیت حاصل ہے اس لیے ہماری شاعری کا عظیم المرتبہ ہونا باعث تعجب نہیں۔ علاوہ ازیں ہماری فارسی وہی قدیم پارسی دری ہے۔ ہندوی زبان تو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ہو سکتی ہے، لیکن فارسی زبان

ایک سرے سے دوسرے سرے تک بالکل ایک ہے اور جس طرح لکھی جاتی ہے ویسے ہی بولی بھی جاتی ہے۔ یہ فارسی آذربیجان کی زبان کی طرح نہیں ہے جس میں کردہ کے بدلے "کردہ کن" کہا جاتا ہے یا سیستانیوں کی بولی نہیں ہے جن کے افعال لفظ "سین" پر ختم ہوتے ہیں، مثلاً "کردہ سن، گفتہ سن" باوجود اس کے جب کچھ بالائی یہاں آ کر مقیم ہوئے تو دہلی کے ادیبوں نے ازراہِ طنز و تمسخر ان کی زبان سیکھ لی اور اس زبان میں ایسا لکھنے لگے کہ وہ لوگ ان کی تحریر پر کہیں حرف گیری یا نکتہ چینی نہیں کر سکتے تھے۔"

خسرو کا یہ بیان ماہران علم لسان کی توجہ کا مستحق ہے اور ان لوگوں کے لیے خاص طور پر قابلِ غور ہے جو ہندوستان کی فارسی کے متعلق حقارت آمیز خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

چوتھا دیوان۔ بقیہ نقیہ:

یہ دیوان خسرو نے چونسٹھ برس کی عمر میں یعنی 716ھ میں علاؤالدین کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد مرتب کیا۔ اس دیوان میں بھی ایک دیباچہ اور ابیات سلسلہ موجود ہیں، اور اگرچہ ضخامت میں یہ دیوان غرۃ الکمال سے بہت چھوٹا ہے تاہم اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ خسرو کے پختہ کلام کے بعض نادر نمونے اس میں موجود ہیں۔ غرۃ الکمال کی تالیف کے بعد خسرو کو یہ خیال بھی نہ ہوگا کہ وہ ایک اور دیوان مرتب کریں گے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عمر کے ساتھ ساتھ خسرو کا ملکہ گوئی بڑھتا جاتا تھا جو یقیناً غیر معمولی ذہانت اور خداداد قابلیت کی دلیل ہے، چنانچہ اس دیوان کے دیباچے میں کہتے ہیں:

"میرے نفس میں شعر و شاعری کی ہوس بڑھتی ہی جاتی ہے، بتیس سال کی عمر میں ایک رباعی کہنے کے بعد مجھے غور اور تامل کی ضرورت ہوتی تھی اور پھر دوسری رباعی کہہ سکتا تھا۔ لیکن اب جب کہ میرا سن چونسٹھ کا ہو چکا ہے اور میرے دندان گرنے کے قریب ہیں، میرا نفس مجھ سے کہتا ہے کہ یہی وہ خاص وقت ہے جب میرے منہ سے شعر کے موتی جھڑنے چاہئیں۔ میں اپنے منہ کو جتنا بند کرتا ہوں اتنی ہی کثرت سے یہ موتی نکلے چلے آتے ہیں۔ میں اکثر ایسے سمندروں میں غوطہ زن ہو جاتا ہوں کہ جن کی تہہ کو پرانے بڑے اساتذہ بھی نہ پا سکے تھے اور چند لمحوں میں بلا کسی خاص زحمت کے اتنے درخشاں موتی نکال لاتا ہوں کہ انہیں جمع کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن چونکہ

اب اشعار کی تزئین اور آرائش کا زمانہ نہیں رہا میں صرف ایک یا دو موتی چن لیتا ہوں، جو چن لینے کے قابل ہوں اور انہیں منظوم کر دیتا ہوں اور باقی میرے ذہن کی مٹی پر گرد آلودہ اور کس مپرسی کی حالت میں پڑے رہتے ہیں، کیونکہ اگر میں ان سب موتیوں کو اکٹھا کرنے لگتا تو چار دیوان نہیں چار سمندر جمع ہو جاتے۔ میں اتنی تیزی سے فی البدیہہ کلام کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ میں نے کئی ایک رباعیاں اتنی جلدی کہی ہیں کہ مجھے خیال یا غور کا وقت ہی نہیں ملا۔ اپنے قلم کے حق کی قسم بہت دفعہ کاتبِ تقدیر کی تیز اور رواں قلم بھی میری قلم کی سرعت کو نہیں پا سکی اور بادشاہوں کی مجلس میں زیادہ تر میں فی البدیہہ کہنے ہی پر قناعت کرتا ہوں اور قلم کو یک قلم ترک کر دیتا ہوں۔"

شعر میں ایسی مہارت، کلام پر اتنی قدرت اگر خسرو کے دل میں جذبات غرور اور فخر پیدا کر دیتی تو تعجب کی بات نہیں، چنانچہ اسی دیباچے میں اپنے متعلق فخریہ انداز میں یوں گویا ہوتے ہیں۔

"یہ بندہ خسرو خدائی اقلیم بخش کی برکت سے اقلیم سخن میں یکہ و تنہا ہے، اس کی ہر رباعی نہ افلاک پر نوبت پنجگانہ بجاتی ہے اور اس کی قلم کا خطی نیزہ جس پر اشعار رنگین کا آسمان سائی پرچم لگا ہوا ہے، گنبد فیروزہ آسمان تک جا پہنچا ہے۔ اس کے شاہی سکے جن میں سے ہر ایک پورے چاند کی طرح کامل اور درخشاں ہے، شہر بہ شہر رائج ہیں، نہیں بلکہ سورج کے قرص سیمین کی طرح انہوں نے مشرق اور مغرب کو تسخیر کر لیا ہے۔ دور اندیشن دانا جانتے ہیں کہ اس کے کلام میں ایسے بلند پایہ کی نظم اور نثر ہے جو سوائے قرآن، حدیث نبویؐ یا کلام علمائے دین کے اور کسی کلام کی برتری کو تسلیم نہیں کر سکتی۔"

لیکن ان فخریہ جذبات کے انفعال سے بھی خسرو کے لحات فرصت خالی نہ تھے۔ ہر روشن دماغ آدمی کی طرح انہیں کبھی کبھی اپنی یہ سعی بیکار محض اور یہ کامیابی ایک ایسا رنگین کھلونا معلوم ہونے لگتی ہوگی جسے دیکھ کر بچے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی انفعالی جذبے کے ماتحت دیباچے کے خاتمے میں یوں لکھتے ہیں۔

"سیاہ و سفید کی اس گنہ گار جستجو میں میری داڑھی، جو کبھی سیاہ تھی سفید ہو گئی ہے، اور میرا سفید چہرہ سیاہ ہو چکا ہے، لیکن نادان بچوں کی طرح میں اس خیال سے اطمینان کی نیند سوتا ہوں کہ میری غزلیں بچوں اور بوڑھوں کو بیدار رکھتی ہیں۔ میری مثال اس بچے کی سی ہے جسے عقل سیکھنے کی غرض

سے مکتب بھیجا جائے، لیکن جو اس کی بجائے طفلانہ سواری کی طرف مائل ہو، اور اس طرح عمر بھر تک پیادہ ہی رہے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ قلم کا صحیح استعمال یہ ہے کہ مذہبی علوم کی طرف اس کا رخ پھیرا جائے اور اس کی کسی اور فضا میں پرواز محض بازی طفلانہ ہے۔ میں، بوڑھا بچہ وہ ہوں کہ میں اس کو، جسے میں قلم کہتا ہوں، گمراہی کے صحرا کی طرف دوڑا تا رہا ہوں اور نہیں جانتا کہ وہ مجھے دوزخ کے کس ویرانے میں لے جائے گی۔ میرے دل میں جب کبھی یہ تکلیف دہ خیال آتا ہے تو میرے تمام بدن میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ میرے اس سیاہ نامہ اعمال کے محو ہو جانے کی صرف یوں امید ہے کہ میرے عقیدے کے مطابق عفو (خدا) سحابِ رحمت ہے اور رحمتِ ایزدی سرچشمۂ چشم پوشی اور اس بادل کے ایک چھینٹے یا اس چشمے کی ایک رو سے میرا نامہ اعمال اور میں سیہ کار خود دونوں دھل کر پاک اور صاف ہو جائیں گے۔ ورنہ میں تو اس کا مستحق ہوں کہ وہ نامہ میرے گلے میں لٹکا دو اور میرا منہ کالا کر کے مجھے دوروزدیک پھرایا جائے اور پھر مجھے سپرد جہنم کر دیا جائے تا کہ میرا نامہ اعمال اور میں دونوں جل کر راکھ ہو جائیں۔"

دیوان بقیہ نقیہ میں خسرو کے اپنے بیان کے مطابق ترسٹھ قصیدے، چھ ترجیعات، ایک سو پینسٹھ بیت مثنوی کے، دو سو قطعات، اور پانچ سو ستر غزلیں اور تین سو ساٹھ رباعیات ہیں۔ قصائد زیادہ تر سلطان علاؤالدین خلجی کی مدح میں ہیں، لیکن چند میں قطب الدین مبارک شاہ کو بھی خطاب کیا گیا ہے۔ بادشاہوں کے علاوہ بعض قصیدے اس زمانے کے امرا مثلاً الماس بیگ اولوغ خان، تاج الدین دبیر، حمید الدین، نصیر الدین عارض وغیرہ کی تعریف میں ہیں۔ اس دیوان کے بعض قصائد بھی پرانے اساتذہ کے جواب میں لکھے گئے ہیں مثلاً عبدالواسع الجبلی کے ایک قصیدے کا پہلا مصرع ہے:

که دارد جوں تو معشوقی نگارو چابک و دلبر

خسرو کا ایک قصیدہ یوں شروع ہوتا ہے:

کجا خیز دچو تو سروی جوان و نازک و نوبر

اسی طرح ظہیر فاریابی کا قصیدہ جو یوں شروع ہوتا ہے کہ:

سپید دم کہ زند ابر خیمہ در گلزار

خسرو اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

سپیدہ دم کہ گہر بار و ابر در گلزار

لیکن زیادہ تر قصیدے ایسے ہیں کہ جن میں خسرو نے اپنے کسی پیشرو کا تتبع نہیں کیا اور واقعہ یہ ہے کہ اس دیوان کی بعض نظمیں پختگیٔ کلام، حُسنِ ادا اور زورِ تخیل میں غرۃ الکمال کے قصیدوں سے بھی بازی لے گئی ہیں۔ چنانچہ ان میں دو قصیدے، ایک جو رمضان کے موقع پر لکھا گیا تھا اور جس کا مطلع ہے:

نو بہار امسال مارا روزہ فرماید ہمی
گل چناں تردامن از می لب نیا لاید ہمی

اور دوسرا قصیدہ، جس کا مطلع ہے:

عیداست و ساقی درقدح صہبا ز مینا ریختہ
در ساغر الماس گون لعل مصفا ریختہ

صنعت شعر کے لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں:

ترجیعات میں ایک علاؤالدین خلجی کے انتقال پر کہی گئی تھی اور تین میں، اس بادشاہ کو مخاطب کیا ہے۔ ایک الماس بیگ کی مدح میں ہے اور ایک میں ناصر الدین محمود کا مرثیہ ہے۔ مثنویوں میں سے ایک خضر خاں کی شادی کے موقع پر لکھی گئی تھی اور ایک علاؤالدین کے نام ایک عرض حال کی شکل میں ہے[3] غزلیات، حمد سے شروع ہوتی ہیں۔ اس حمد کا انداز کچھ ایسا موثر اور دل پذیر ہے کہ اس کا جواب کہیں مشکل سے ملے گا۔ اس لیے اسے نقل کرتا ہوں۔

اے زخیال ما برون در تو خیال کے رسد
با صفت تو عقل را لاف کمال کے رسد
گر ہمہ مردم و ملک خاک شوند بردرت
دامن عزت ترا گرد ملال کے رسد
کنگر کبریائی تو ہست فراز لامکاں
طائر ما در آن ہوائی پروبال کے رسد

بردر نیازیت بی صد چو حسینؓ کربلا !
تشنہ بماند برگذر تابزلال کے رسد
ہست بہ تخت گاہ دل جلوۂ قرب روز و شب
لیک بجلوۂ چناں چشم خیال کے رسد
در چمن کہ بلبلش رو قدس نمی سُزد
گل غنیان خاک رابوئی وصال کے رسد
تو سَن چابکان سبک عرصۂ کوئی نیکواں
آنکہ فتاد مرکبش برسرِ حال کے رسد
حربۂ رد عاشقاں برسرچون منی سزد
راہروان پاک را لوث وبال کے رسد
آیت رحمت از حرم ہست برائی حاجیان
خسرو بت پرست راجز خط و خال کے رسد

خدا کی بے نیازی اورانسان کی بے بسی اور سعئ لاحاصل کی تصویر الفاظ میں اس سے بہتر طریقے پرنہیں کھینچی جاسکتی۔

علاؤالدین خلجی کے مرثیے کے یہ چند بند بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

کو آن بہ کشیدن و کشور گرفتنش
گیتی تخت خود بہ لشکر گرفتنش [4]
کو آن گرفتنش بہ سر کافران زمین!
کو آں سران لشکر کافر گرفتنش
کو آن نہادنش سرسرکشیان بخاک
وز صد ہزار سرہمہ یکسو گرفتنش
کو آن بہ گوجرات فرستادنش سپاہ
دریا بموج قطرۂ خنجر گرفتنش

کو آن ہزار پیل و ہزاران ہزار اسپ
زینک ز بندگان مظفر گرفتش!
کو آن ز جود خود کہ اسا کہالی ابر
قحط از تمام روی زمین بر گرفتش
کوآن زخود رود کہ جہان گیرد آن کجاست
بشستہ شرق و غرب سراسر گرفتش
کوان کے اوج گیر شد آں شاہ تازہ ملک
از رو(؟)فرشتہ پہ شہپر گرفتش
از بس بزرگی کہ نہ گنجید درجہان
شدزمن جہان تنک بسوی آن جہان روان
اے شب برآفتاب چہ بندی نقاب را
یک سو فگن زنیز اعظم سحاب را
چون روشن است برہمہ عالم کہ کیست این
اے آسمان مپوش ز خاک آفتاب را
شاہا بگو چگونہ آخر کہ بندگان
حاضر نشستہ اندز بہر جواب را
در آرزوئی روی تو دریاست چشم خلق
برخیز و روبسوی فرومال خواب را
ہر خدمت کہ باید آنجا سزائے خویش
فرمالی روح بہمن و افراسیاب را
اے سخت گردنان کہ ز تقدیر سرکشید
گو بنگرید ایں شہ مالک رقاب را
بو القاسم است برسرخاکش شفیع تا!
وز مکہ و ز بولہب ایں بوتراب را

انجم کہ داشتند علالی ز آسمان
هم ز آسمان سپرده بما انقلاب را
سلطان شہاب دنیا و دین یادگاراوست!
ایزد چو او بلند کند ایں شہاب را
اینک ز صدق دل حق اخلاص او کنم
بہر دو شاہ ختم سخن بردعا کنم
آں مرغ عرش را بسر سدرہ جائی باد
سدرہ ہمیشہ سایہ طلب زیں ہمالی باد
او را بگوش نغمۂ مرغان جنت است
این را بہ نزد زہرہ ترنم سرالی باد
چوں ظل آں محمد از افاق شہد نہان
ایں سایہ خدا بجہان دیر پالی باد
چو او ز جالی بار بہ صف ملک رسید
این را ملوک صف زدہ دربارجالی باد
او ایں سرائی را چو بفرزند خود سپرد
وقف مداد مرقد او آن سرالی باد
چوں بر عمر رسید خلافت ز ملک او
ملک از خلافت عمرش عدل زالی باد
تابخت ایں سریرنشین پرورد بچرخ
سرہا بزیر پایۂ او چرخ پالی باد
هم از کمند نصرت و هم از کلید فتح
ہموارہ بند خصم و ولایت کشالی باد
دربالش سیاہ شہ ایں نور دیدہ را
از چشم بد ہمیشہ نگہبان خدالی باد

جس خوبی سے خسرو نے اس آخری بند میں مرثیہ اور مدح کو ساتھ ساتھ نباہا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔

خسرو کا یہ دیوان بھی اب تک شائع نہیں ہوا۔ قلمی نسخے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں۔

پانچواں دیوان۔ نہایۃ الکمال:

یہ دیوان خسرو نے سلطان غیاث الدین تغلق کے انتقال اور محمد تغلق کی تخت نشینی کے بعد یعنی اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ہی مرتب کیا تھا۔ دیوان کے ساتھ ایک بہت مختصر سا دیباچہ مرصع و مقفّٰی عبارت میں موجود ہے، جس میں حمد اور نعت کے بعد حضرت نظام الدین اولیاؒ کے مناقب بیان کیے گئے ہیں۔ خود دیوان کے متعلق دیباچے میں کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اس کا نام یعنی ''نہایۃ الکمال'' بھی کہیں مذکور نہیں ہے، اور نہ اس کا نام دیوان میں اور دیوانوں کی طرح ابیات سلسلہ ہیں۔ یہ دیوان نادر ہے اور اب تک اس کے بہت کم نسخوں کا پتہ چل سکا ہے۔ برٹش میوزیم کے نسخے میں جو میری نظر سے گزرا، بائیس قصیدے، پانچ ترجیعات، چار چھوٹی چھوٹی مثنویاں، متعدد قطعات، غزلیں اور رباعیاں ہیں۔

قصائد میں مدح ونعت، حضرت نظام الدین اولیاؒ کی توصیف، غیاث الدین تغلق شاہ اور اس کے بیٹوں، جونا خان، بہرام اور ابراہیم کی مدح ہے۔ لیکن چار قصیدے ایسے بھی ہیں کہ جن میں خسرو نے محض اخلاق اور تصوف کے مسائل بیان کیے ہیں اور جن کے نام، خاص اشعار، راہ رہائی، عرف العرفان اور عین العمر ہیں۔ نظام الدین اولیاءؒ کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس کا نام شاعر نے ''نابت النعت'' رکھا ہے اور وہ ان کے جذبات عقیدت اور احساسات ارادت کا آئینہ دار ہے۔ ایک اور قصیدہ جو صحیفۃ الاوصاف کے نام سے موسوم ہے، قابلِ ذکر ہے، کیونکہ اس میں خسرو نے دیوگیر کے شہر کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ اسی طرح ایک اور قصیدہ جو سید تاج الدین کے نام ہے، دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس میں خسرو نے اس الزام کا پُر جوش جواب دیا ہے جو ان پر بعض لوگوں نے اہلِ بیت رسول اللہ ﷺ کے خلاف بے ادبی کا عائد کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خسرو کی کسی منظوم یا منثور تحریر سے اس کا شبہ پیدا ہوا تھا۔ چنانچہ وہ خود کہتے ہیں کہ:

''شبہ تو یقینی طور پر ہو سکتا ہے، لیکن محض شبہ پر کسی مومن کو ملزم گردانا خلاف انصاف ہے۔''

ترجیعات میں سے ایک میں قطب الدین مبارک شاہ کا مرثیہ ہے، دو میں جونا خاں کی مدح ہے اور ایک میں اس کے بادشاہ ہونے کی تہنیت ہے۔ ایک ترجیع میں خسرو نے اپنے بیٹے حاجی کا مرثیہ کہا ہے۔ مثنویوں میں ایک تاج الدین کے نام بطور تعزیت کے خط کے ہے۔ ایک قطب الدین مبارک شاہ کی مدح میں ہے۔ ایک میں تغلق شاہ کو تغلق آباد کی تعمیر پر مبارک باد دی ہے اور ایک تاج الدین سپاہ دار بن شمس الدین کے نام ہے۔

قطعات میں خاص بات یہ ہے کہ بعض میں پہیلیاں کہی گئی ہیں، مثلاً اوسترے کی پہیلی یوں کہی ہے: دو چیزوں سے قائم جن میں سے ایک حیوانی ہے اور ایک نباتاتی۔ وہ کونسا جسم ہے جسے دو حصوں میں شق کیا گیا ہے اور پھر جوڑا گیا ہے، جس کا پیٹ چاک ہے اور پیٹ میں زبان ہے اور جو بوڑھے کو ایک دم میں جوان بنانے کا سحر آفریں عمل کر سکتا ہے اور کبھی مشک کو تاراج کرتا ہے، کبھی کافور کو اور کبھی مشک اور کافور دونوں کو ایک ساتھ؟

غزلیں وہی ہیں جو پہلے دیوانوں کے ساتھ بھی شامل ہیں، لیکن بعض نئی بھی ہیں۔ کچھ غزلوں میں یہ التزام کیا ہے کہ ایک مصرع عربی کا ہے اور ایک فارسی کا۔ رباعیات میں آخری رباعی جس کا مفہوم یہ ہے، بہت ہی پُر اثر اور رقت انگیز ہے:

''میرے گناہوں نے مجھے تباہ کر دیا۔ اے خدا میں کیا کروں؟ دوست کی سیاہ زلفوں نے میرے چہرے کو سیاہ کر دیا اب میں کیا کروں؟ مجھے امید ہے کہ تُو میرے گناہ بخش دے گا لیکن اس شرم کا کہ تُو نے میرے گناہوں کو دیکھا ہے، میں کیا کروں؟''

اس دیوان کے بعض قصائد میں بھی خسرو نے پرانے اساتذہ کے کلام پر طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں اس سے مقصد نقل یا نقلیں نہیں بلکہ محض تفننِ طبع اور دوستوں کی خواہش کو پورا کرنا تھا، مثلاً انوری کے ایک مشہور قصیدے کا جواب لکھا ہے، خسرو کا مطلع ہے۔

سزد کہ سجدہ برندت کواکب از تعظیم
کہ آسمان بلندی ز احسن تقویم

انوری کا مطلع یوں تھا:

بحکم دعوی زیج و گواہی تقویم
شبِ چہار دہم ذی الحجہ سنہ تامیم (54)

انوری کی طرح خسرو نے بھی اس قصیدے میں نجوم سے واقفیت کا خوب ثبوت دیا ہے اور حق یہ ہے کہ انوری کا مقابلہ بہت کامیابی سے کیا ہے۔

یہ دیوان بھی اب تک طبع نہیں ہوا۔

گیارہواں باب

تاریخی مثنویاں اور خمسہ

قرآن السعدین:

اس مثنوی کا ذکر خسرو کے حالات زندگی کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔ اسے سنہ 688ھ کے رمضان میں خسرو نے تین مہینے کی کاوش اور دماغ سوزی کے بعد مکمل کیا اور مثنوی میں یہ ان کی پہلی تصنیف تھی۔ اس کے لکھنے میں انہیں کئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اول تو مثنوی کے میدان میں یہ ان کا پہلا قدم تھا دوسرا اتفاق سے مثنوی کا مضمون، یعنی باپ بیٹے کا جھگڑا، ایسا مہمل اور ناخوش آئند تھا کہ خسرو کو اسے دلچسپ اور دل کش بنانے کی سخت کوشش کرنا پڑی، اور پھر بھی انہیں اپنی ناکامی کا احساس رہا۔ اگرچہ مضمون کے پھیکے پن کو انہوں نے وصف نگاری کے دل کش نمونوں کی رنگ آمیزی سے چھپانے کی بہت سعی کی ہے تو بھی انہیں معذرتاً یہ کہنا پڑا کہ:

چوں سخن از لطف و نشانی نداشت
کالبدش صورت جانی نداشت
وصف بر آن گونہ فرور راندہ ام
کز غرض قصہ فرو ماندہ ام
خال تکلف ز دمش بر جمال
نقد نماید مگر اندر خیال

لیکن خسرو کے اس اعتذار سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ وہ مثنوی میں اپنی شکست کو تسلیم کرتے ہیں یا یہ کہ ان کی محنت کا یہ پہلا پھل شاعرانہ لطف و خوبی سے بالکل معرّا ہے۔ یہ ضروری

ہے کہ پوری نظم بحیثیت مجموعی بے جوڑ ہے لیکن اگر مثنوی کے قصے کو نظر انداز کر کے اس کے مختلف ٹکڑوں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خسرو نے شاعرانہ پابندیوں اور پرانی روایتوں کی قید کے باوجود وصف نگاری میں ایسا کمال دکھایا ہے جو ان سے پہلے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوا تھا۔ ان ٹکڑوں کو آپس میں جوڑ کر ان سے ایک مجموعی حسن اور لطافت شاید وہ پیدا نہ کر سکے، لیکن ہر ٹکڑا اپنی جگہ پر ایک بے مثل اور نادر تصویر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مثنوی کو لکھنے سے پہلے خسرو کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ وہ خاص خاص چیزوں کے موقعے، شاعرنہ انداز میں پیش کریں اور اس مثنوی کو لکھتے وقت انہیں اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

بود در اندیشۂ من چند گاہ
کز دل و اندۂ حکمت پناہ
چند صف گویم و آبش دہم
مجمع اوصاف خطابش دہم
باز نمایم صفت ہر چہ ہست
شرح دہم معرفت ہر چہ ہست
بفنگم از جیب گہرہا بہ پیش!
تا جش خود سازم و دامان خویش
طرز سخن را روش نو دہم
سکۂ ایں ملک بخسرو دہم
نو کنم اندازۂ رسمِ کُہن!
بس روی پیشروانِ سخن

وصف نگاری کی اس خصوصیت کے ساتھ قرآن السعدین میں خسرو کی جدت پسند طبیعت نے بعض اور نئی باتیں بھی مثنوی میں پہلی دفعہ داخل کیں۔ مثلاً ہر باب کا عنوان شعر میں ہے گویا ابیات سلسلہ کی شکل یہاں قائم رکھی ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی کی یکسانیت کو دور کرنے کے لیے جگہ جگہ ایسی غزلوں کا اضافہ کیا ہے جو سیاق وسباق سے مناسبت رکھتی ہیں۔ خسرو نے مثنوی کو مکمل

کرنے کے بعد اس میں کچھ اشعار بعد میں یعنی کوئی چار سال بعد اور بڑھائے۔ اس اضافے کے دو مقصد تھے، ایک تو مثنوی کے مضمون کی توضیح اور سبب نظم کی تشریح، دوسرے مثنوی کے ابیات کی تعین اور ضبط ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلے نسخہ میں چونکہ اشعار کی تعداد کا کوئی ذکر نہ تھا اس لیے ان کی مختلف نظموں میں کچھ کمی بیشی ہوگئی تھی، خسرو کہتے ہیں:

من چو نکردم عددش از نخست
کم شد و سرمایہ نماندش درست
گشتہ ضرورت کہ کنونش بعقد
بستم و دادم بہ امینان نقد

اس اضافے کے بعد مثنوی کے اشعار کی کل تعداد تین ہزار نو سو چوالیس ہوگئی۔ مثنوی کی بحر وہی ہے جو نظامی کی مثنوی مخزن الاسرار کی ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن السعدین لکھتے وقت بھی نظامی کا خمسہ خسرو کے پیشِ نظر تھا۔

تاریخی حیثیت سے مثنوی زیادہ اہم نہیں ہے لیکن اس سے اُس زمانے کی معاشرتی حالت خصوصاً بادشاہوں اور امرائے کے تکلفاتِ زندگی کے متعلق بہت سی دلچسپ اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ دہلی کی بعض عمارتوں مثلاً جامع مسجد، قطب مینار، حوض شمسی وغیرہ کا ذکر، شہر کی قبوں سے آرائش اور رقص و سرود کی محفلوں کے منظر، آلات موسیقی اور مختلف قسم کی کشتیوں کا بیان جن میں کیقباد اور بغرا خاں سرجو دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک آتے جاتے تھے۔ کھانوں اور فواکہ وغیرہ کا وصف یہ سب باتیں خسرو نے بہت خوبصورتی سے پیش کی ہیں۔ نمونے کے طور پر یہاں اشعار پیش کرتا ہوں جن سے خسرو کا خاص اسلوب بیان، جس میں حقیقت اور تخیل کی مناسب اور موزوں آمیزش سے ایک عجب طرح کی دل فریبی پیدا ہوگئی ہے۔

دف:

صفت دف کہ در دست کسان کو بد پائی!
صحن کژ داشتہ و کوبش مابین بچہ سان

دائرہ دف کہ حصاری زچوب
صحن وی از بخ عروسک بکوب
زہرہ ز دورش بسرود آمدہ
چنبرش از چرخ فرود آمدہ
بستہ جلاجل بکمر جا بجائی
چوں کمر چرخ جلاجل نمائی
بر زبردست گرفتہ نشست!
گہ زبردست کبھی زیردست
چار زبان و دو زبان در دہان
نغز سخن لیک دوئی در زبان
ہر سخی نغز کہ بادوست گفت
آں ہمہ در پردۂ در پوست گفت
گشتہ دو رولیک چوبرروی خورد
دستہ خود ہمہ یک روبہ کرد!
روبش ازیں سری وازاں سوی ہم
گفتش ازین روی و ازان روی ہم

کھانوں کا بیان:

نان تنک صاف برآن گو نہ بود
کز تنکی رد بدگر سو نمود
نان تکوئیم کہ قرص خورست
عیسی اگر خوان بکشد در خورست
نان تنوری ز طرب قبہ بست
ز آنکہ بخوان شہ عالم نشست
کاک در آن مرتبہ رو ترش کرد

لاجرمش روی چناں مانده زرد

باقتہ:

بره بریان شرف از قرص خور
خواند زبان برهٔ بھلوئی بز
برسرِ پولاوَ که ارز
چوب دم دنبه دومن یک سره
چرب تر از دبک اهو بره
پخته بی مرغ بهر گو نه طرز
از دلج و میهو و دراج و چوز
صحنک حلوا همه شکر سرشت
چاشنوش از طبقات بهشت
تختهٔ صابونی شکر نوید
راست چو جامه بسفیدی سفید
داده بی طیب معنبر بزاں
خوردهٔ کافور تر و زعفران

پان:

صفت بیرهٔ تنبول که نزد همه خلق!
به ازان نیست نباتی بهمه هندوستاں
بیرهٔ تنبول که صد برگ بست
چوں گل صد برگ بیامد بدست
نادره برگی چو گل بوستان!
خوب ترین نعمت هندوستان
نیز چو گوش فرس نیز خیز
صورت و معنی به صفت هر دو تیز

تیزی ازو یافتہ گوش دگر
داو بہر گوش ز تیزی خبر
تیزی او آلت قطع جزام
قول نبی رفتہ علیہ السلام!
بر رگ و در رگ نہ نشانی زخون
لیک ہم از رگ دودش خون برو ں
طرفہ نباتی کہ چوشد در دہن
خوش چو حیواں بدر آید ز تن
خوردن آن بوئی دہن کم کند
سستی دندان ہمہ محکم کند
سیر خورد گرسنہ دردم شود
گرسنہ را گرسنگی کم شود
سرخی رویش ز سہ خدمت گرش
چونہ و فوفل شدہ رنگ آورش
گرچہ کہ آبش بنوی ہست بیش
کہنہ شود بیش کند آب خویش
گرچہ کہ از آب شود زرد رو
لیک ز زردش بود آبرو
برگ کہ باشد بدرختان فراخ
مزدد شود ز زردش چوافتد ز شاخ
برگ عجیب بیں کہ گستہ زبر
رز بس شش ماہ بود تازہ تر
حرمتش از بیش گہ و پابگاہ
ہم بگدا محترم و ہم بشاہ

رقاصہ عورتیں:

شد زن مطرب بہ نوا پروری
انجمنی بر زمہ و مشتری
پردہ بر انداختہ چوں آفتاب
کردہ بہ یک غمزہ جہانی خراب
روی چو خورشید بر افروختہ
جان کسان ز آتش خود سوختہ
از رخ شان کا مدہ مقنع فرود
رفتہ بچۂ ماہ مقنع فرود
ز ابروی خم پشت کمان ساختہ
تیر مژہ نیم کش انداختہ
بستہ بلادر[1] ہمہ درش بلا
دادہ بہ بیہوشی عالم صلا
رشتہ در بستہ برو از دو سوی
چوں قطرات عرق از گرد روی
جعد کہ پیچیدہ بپا در خرام
ماہی ساق آمدہ درپائی دام
بر زمین افگندہ چو گیسوی خویش
رفتہ رہ خویش ہم از موی خویش
قامت شان بود بہ پاکو فتن!
گیسوی مشکین بزمین روفتن
رقص کناں چون بزمین پازدند
در حق ناہید لگدھا زدند!
از روش جنبش دستان شان

مجلسیان ہر ہمہ حیران شان
ہر کہ درآن شعبدہ ہشیار بود!
مست نہ ازمی کہ از دیدار بود

مغل قیدی:

کافر تاتار برون از ہزار
کردہ دگر گو نہ باشتو سوار
سخت سوانی بوغا سخت کوش
ہر ہمہ پولاد تن و پنبہ پوش
روی چو آتش کلہ از پشم موش
آتش سوزان شدہ باپشم خویش
رخنہ شدہ طشت مس از چشم تنگ
دیدہ در انداختہ در رخنہ سنگ
زشت تر از زنگ شدی بوی شان
پست تر از پشت شدہ روی شان
چہرۂ شان دبۂ نم یافتہ!
جای بجا کلنجک و خم یافتہ
از رخ تا رخ شدہ بینی پہن
وز کلہ تا کلہ لبالب دہن
بینی بر رخنہ چو گوری خواب
با چو تنوری کہ ز طوفان آب
موی زبینی شدہ برلب فراز
سبلت شان گشتہ بغایت دراز
ریش نہ پیراہن چاہِ زنخ
سبزہ کجا بردمد از روی

گشت یائی گو ہمہ بر بانگ نی
ہچو زنان نوحہ کنان پی بہ پی
کوہ نتالی بشتر کردہ جالی
کوہ شدہ برسر کوہان بپائی
شہ زان ہمہ روہائی زشت
کایزد شان ز آتش دوزخ سرشت
دیو سپید آمدہ ہر یک بروی
خلق بلا حول زہر چار سوی

مثنوی قرآن السعدین نولکشور پریس لکھنو میں اور اس کے بعد علی گڑھ میں کلیات خسرو کے سلسلے میں شائع ہو چکی ہے۔

مفقاح الفتوح:

یہ مثنوی خسرو نے جلال الدین فروز خلجی کے عہد میں لکھی تھی اور اسی بادشاہ کی فتوحات کے ذکر پر مبنی ہے۔ دو جمادی الثانی 690ھ میں تکمیل کو پہنچی۔ خسرو کی اور تاریخی مثنویوں کے مقابلے میں یہ مثنوی بہت مختصر ہے اور غالباً اسی لیے خسرو نے اسے دیوان غرۃ الکمال کے ساتھ شامل کر دیا تھا، لیکن تاریخی حیثیت سے مثنوی کی اہمیت میں کوئی شبہ نہیں بلکہ دو خصوصیتیں اس میں ایسی ہیں جو ایک مورخ کے نقطہ نظر سے بہت قابل قدر ہیں۔ یعنی ایک تو اس مثنوی کی سادگی' زبان اور صنائع اور بدائع کی زیادتی سے اس کا معرا ہونا اور دوسرے واقعات کو بلا مبالغہ اور بغیر حشو زواید کے پیش کرنا، چنانچہ خسرو اس کے متعلق خود کہتے ہیں:

''جب میں نے اس مثنوی کو شروع کیا اور اپنی قلم کو لکھنے کے لیے تیار کیا تو میں نے (کسی حد تک) اسے مرصع ضرور کیا، کیونکہ شاعرانہ کلام کے لیے یہ چیز ضروری ہے۔ لیکن جب میں نے کسی ایسی چیز کو اس میں شامل کرنے کا قصد کیا جو واقعے سے بعید تھی تو سچائی نے آ کر میرا ہاتھ روک دیا۔ خود میرے نفس نے بھی یہ پسند نہیں کیا کہ سچ کے ساتھ جھوٹ کو شامل کیا جائے، کیونکہ جھوٹے

مبالغے سے اگر چہ دلفریبی پیدا کی جاسکتی ہے تاہم سچ بھی خاص دلکشی رکھتا ہے۔''

مثنوی میں، جیسا کہ اختصار سے پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے، فیروز خلجی کی چار فتوحات کا ذکر ہے۔ایک تو ملک چھجو کی بغاوت اوراس کی سرکوبی، دوسرے اودھ میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں، تیسرے مغلوں کی سرزنش اور شکست اور چوتھے چھاین کی فتح۔ان سب مہموں کے واقعات خسرو نے بلاکم وکاست بیان کر دیئے ہیں اور صحت بیان اور تمام حالات سے پوری واقفیت کو، جو خسرو کو بادشاہ کے قرب کی وجہ سے حاصل تھی، اگر پیش نظر رکھا جائے تو اس مثنوی سے بڑھ کر فیروز خلجی کے عہد کی اور کوئی تاریخ مستند نہیں سمجھی جاسکتی۔

دیوان غرۃ الکمال کے زیادہ تر نسخوں میں یہ مثنوی موجود ہے لیکن اب تک شائع نہیں ہوئی۔قرآن السعدین کی طرح اس مثنوی میں بھی ابیات سلسلہ موجود ہیں

عشقیہ یا خضر خاں و دیول رانی:

اس مثنوی کو بعض دفعہ عشقیہ بھی کہا جاتا ہے۔اگر چہ زیادہ صحیح نام عشقیہ ہی ہے اور ایک اور نام ''منشور شاہی'' بھی ہے جو شاعر کے اس بیت سے ماخوذ ہے۔

بحمداللہ کہ از عون الٰہی
بپایان آمد ایں منشور شاہی

یہ مثنوی، جسے خسرو نے ذوالقعد 715ھ میں پایہ تکمیل کو پہنچایا، خضر خاں اور دیول دیوی کے قصۂ عشق ومحبت پر مشتمل ہے۔ یہ قصہ ہندوستان کی تقریباً ہر تاریخ میں مذکور ہے۔اس لیے اسے مفصل لکھنے کی یہاں کوئی ضرورت نہیں ہے۔خسرو نے جس صحت بیان اور سچائی کو مفتاح میں مدِنظر رکھا ہے، اس مثنوی میں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔اگر چہ اسلوب تحریر اس مثنوی سے بہت مختلف اور مثنوی قرآن السعدین سے بہت مشابہ ہے۔ایک شہزادے اور ایک حسین راج کماری کی محبت کی داستان بجائے خود ایسا مضمون تھا کہ اسے روکھے پھیکے الفاظ میں ادا کرنا مناسب نہ تھا، کیونکہ یہ قصہ اگر نثر میں بھی لکھا جائے تو بہت کچھ شعریت یا شاعری اس میں پیدا ہو جائے گی۔اسی لیے خسرو نے اس میں شاعرانہ بلند پروازی، صنائع اور بدائع، قوتِ تخیل اور محاکات، ان سب ہی

ذرائع کو استعمال کیا ہے جس سے قصے کی دلچسپی اور (موجودہ زمانے کی اصلاح کے مطابق) ''رومانیت'' میں اضافہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اس داستان کو ایک خاص امتیاز یہ حاصل ہے کہ اول تو یہ کسی قدیم اور روایتی قصے پر مبنی نہیں بلکہ خسرو کا اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ ہے۔ دوسرے داستان کے واقعات خسرو کو خود خضر خاں کی زبانی اور اس کی اپنی تحریر سے معلوم ہوئے اور اس طرح وہ تمام جزئیات، عاشقانہ نیاز اور معشوقانہ ناز، دو دلوں کی پنہاں تپش اور باہمی کشش، امید اور بیم، مد و جزر، غرض کہ وہ وارداتِ قلبی بھی، جسے صاحبِ معاملہ ہی جان سکتا ہے اور اگر طاقت گویائی رکھتا ہے تو بیان کر سکتا ہے، خوش قسمتی سے شاعر کو مل گئے اور پھر شاعر بھی خسرو کا سا معجز بیان۔ قصے میں جتنی بھی دل کشی اور جاذبیت پیدا ہو جائے تعجب نہیں، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ جو خوبی خسرو کی اس مثنوی میں نکلتی ہے وہ اس قسم کی اور مثنویوں میں موجود نہیں۔ دوسری صفت اس مثنوی میں یہ ہے کہ باوجود ایک عشقیہ قصے پر مبنی ہونے کے خسرو نے اس میں جو بھی تھوڑے بہت تاریخی واقعات بیان کیے ہیں، وہ بہت ہی صحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں، جو ان کا خاصہ ہے اور ان کی تحریر کا طرہ امتیاز۔ اس کے علاوہ مثنوی نہ سپہر کی طرح، جس کا ذکر آگے آئے گا، اس مثنوی میں بھی خسرو کا جذبہ وطن پرستی بہت نمایاں ہے۔ ہندوستان کی ہر ایک چیز یہاں کی آب و ہوا، پھول، پھل، یہاں کی عورتوں کا حسن ملیح جو بقول ان کے خلخ اور یغما کی سرخ و سفید عورتوں کی طرح صرف رنگ ہی نہیں رکھتیں اور نہ ان کی طرح ایک برف کے تودے کی طرح سرد ہیں، بلکہ بُو بھی رکھتی ہیں۔ یعنی ایک آن اور شان بھی ان میں نکلتی ہے۔ غرض یہ کہ یہاں کی سب باتوں کو سراہا ہے اور ان کی فضیلت دوسرے ملکوں کی چیزوں کے مقابلے میں ثابت کی ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس مثنوی میں خسرو نے کئی ہندی الفاظ کو فارسی میں بہت خوبصورتی سے کھپایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ خضر خاں نے جو مسودہ اپنی داستان کا انہیں دیا تھا اس میں بہت زیادہ ہندی الفاظ تھے۔ ان سب کو فارسی نظم میں نبھانا مشکل تھا، اس لیے بہت سے انہوں نے بدل دیئے۔ لیکن اب بھی کئی الفاظ مثلاً سنگھاسن، دیوگیری، بعض سازوں اور پھولوں وغیرہ کے نام ہندی شکل ہی میں موجود ہیں۔ ایک اور پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ مثنوی میں کئی چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں بیان کی ہیں۔ غزل کے ٹکڑے بھی ہیں، لیکن وہ حقیقی غزل کی شکل میں نہیں ہیں بلکہ مثنوی کی بحر ہی میں، جو بحر ہزج مسدس محذوف ہے، لکھے گئے ہیں اور ابیات سلسلہ بھی اس مثنوی میں نہیں ہیں۔

عشقیہ کو خسرو نے خضر خاں کی زندگی ہی میں مکمل کر لیا تھا لیکن جب ملک کافور کے ایما پر اس بدنصیب شہزادے کو گوالیار کے قلعہ میں نظر بند کر دیا گیا اور اس کے بعد قطب الدین مبارک شاہ نے اسے قتل کرا دیا تو خسرو نے مثنوی میں اضافہ کر کے ان سب واقعات کو بھی بڑھا دیا۔ یہ اضافہ غالباً مبارک شاہ کے بھی انتقال کے بعد کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ خسرو اس میں اس بادشاہ کے لیے بے مہر کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو بادشاہ کی زندگی میں ممکن نہ تھا۔ علاوہ ازیں اضافے کے اشعار میں خسرو نے اس عقیدت اور دلی لگاؤ کو جو انہیں خضر خاں سے تھا، صاف صاف ظاہر کیا ہے جو یقیناً مبارک شاہ کو بہت ناگوار گزرتا۔ مثنوی کے اصل حصے میں، جو خضر خاں اور دیول دیوی کی شادی پر ختم ہوتا ہے، کل 4200 بیت تھے یہ حصہ ذوالقعد سنہ 715ھ میں ختم ہوا۔ اضافے میں کل 319 شعر ہیں اور اس طرح مثنوی کے موجود اشعار کی تعداد 4319 ہو جاتی ہے۔

مندرجہ ذیل چند اشعار سے اس مثنوی کے اسلوب کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے:

(خضر خاں اور دیول رانی کے عشق کا آغاز)

چہ خوش باشد در آغاز جوانی
دو بیدل را بہم سودائی جانی
گہ از ابرو بیان راز کردن
گہ از مژگان عتاب آغاز کردن
گہی از گوشہائی چشم خواندن
گہی از دور باش غمزہ راندن
ازیں جان دادن وازری ربودن
وزیں گفتن جفا وز دی شنودن
ازین باخویش خون در گریہ خوردن
ازو درلب بدزدی خندہ کردن
ازین کندن بحسرت سینہ ریش
ازو دیدن ندادن رہ سوی خویش
ازین در پیش محرم غم بکشادن

ازو پائی رقیبان بوسہ دادن
ازین شوخی ازو درغم نشستن
ازیں زاری و زو رو برشکستن
ازو ناوک درون جان گرفتن
بصد جان لذت پیکان گرفتن!
خضر خاں و دول رانی درین کار
دو دل بودند یک دیگر گرفتار
کنوں حرفی کہ من خواندم دریں لوح
چنیں بخشد بدلہا راحت و روح
کہ چوں آمد دول رانی بدرگاہ
بشارت یافت از بخت نکو خواہ
برسم بندگی برپائی می بود!
بفرش خاص جہت سائی می بود
بفرخ روزی اندر خلوت قصر
خضر خان را بخواند اسکندرعصر
اشارت کرد بانوئی جہان را
کہ بیرون افگند راز نہان را
خلف را از خلیفہ گوید ایں راز
کہ گشتت بخت و دولت کار پرواز
دول رانی خجستہ دختر کرن
کہ نارد چرخ چون آن مہ بصد قرن
شد است از بہر تزویجت مہیا
کہ گردد خانہ رانِ ماہت ثریا
چو خان را آمد ایں دیباچہ درگوش

زشرم شاہ بانو ماند خاموش
درآن شرمندگی ز ایوان برون رفت
ولیکن مہرش اندر جان درون رفت
درآندم بود خان دہ سالۂ راست
کہ ایں ہنگمۂ شادیش برخاست
دول رانی بقدر ہشت سالہ
دو ہفتہ ماہ را بستہ کلالہ
ہمہ دندانش مست شیر بدراست
ازیں مستی ہمی افتاد می خاست
برادر داشت در ہر وصف شایان
چراغ افروز گوہرہائی رایان
بصورت اند کی یا خان کشور
مشابہ بود ہم چون روی بازر
نمیدانست چون او نیک و بدرا
گمان بودی برادر جفت خودرا!
و لیکن بود خان اعظم آگاہ
کہ از نہ طلق جفت اوست آن ماہ
ببازی بود شان عشقی کہ یکدم
نبودندی جدا در بازی از ہم
نہ بدچون عشق در بازی مجازی
شد آں بازی بآخر عشق بازی!

(خضر خاں کی شادی پر دیول رانی کا اضطراب اور اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش)

غمی بود آں پریوش آں را سوز
کہ شبہائیش بدشواری شدی روز

امیر خسرو

چو شب رایت بر آوردی بعیوق
چو روز عاشق و گیسوئی معشوق
چراغ دل ہمہ شب داشتہ پیش
نخواندی جز نہانی قصہ خویش
نشستی با ہزاران داغ دوری
بخون دیدہ تعویذِ صبوری
دلش پیش چراغ افسانہ گفتی
گداز شمع با پروانہ گفتی!
دل خود را فریبی داد از ناز
بنوک غمزہ کردی زلف را باز
کہ گر غم پرس من می پرسدم کم
چہ کم دارم زخوبی تا خورم غم
ہنوز از شاخ سبزم برنر ستہ است
ہنوز ایں سبزہ را شبنم نشستہ است
ہنوزم گلہا در مونہفتہ است
ہنوزم لالہ در رو ناشگفتہ است
ہنوزم طرہا شوریدہ کارند
ہنوزم غمزہا خنجر گزارند
ہنوزم ابروان محکم کمانند
ہنوزم چشمہا پیکان نشانند
ہنوزم نرگس خون ریز مستت
ہنوزم زلف کافر بت پرستت
نیاز دست آفت را جہالم
نیائی ہمتن فتنہ است خالم
لیم ہم شیوۂ ننگ نباتست

رخم ہم چشمۂ آب حیات ست!
خریدارم سن ار ما ایں نکوئی
ندارد رغبتی از مہر جوئی
بمہدش باد صد زیبا رخ عہد
ہم از دامان پاک من مرا مہد

ایک تمثیلی حکایت:

شنیدم ہندوی آتش پرستی
مگر کز عشق آتش گشت مستی!
ز خود پرکالہ پرکالہ پیاپے
ہمیں برید و می افگند دودی
یکی گفتش چہ مہر است اینکہ جانی
دہی بہر چنیں نا مہربانی
جوابش داد مرد غم کشیدہ
کہ اے سوزمن دودی ندیدہ
دریغی نیست جاں را پوست دادن
نوالہ در دہان دوست دادن!
کسی کز عاشقی زینساں نسوزد؛
مدہ پروانہ کین آتش فروزد
بدست خود نیم من ورنہ خود را
بسوزم از پی نام ابد را
کہ گردد ایں حکایت درجہاں فاش
وزاں شعلہ رسد راغی بادباش
کہ ناگہ ہندوی آتش برافروخت!
مسلمانی درآن چو ہندوان سوخت

مثنوی خضر خاں و دیول رانی بھی علی گڑھ سے خسرو کی اور مثنویوں کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ مولوی رشید احمد انصاری صاحب نے بہت ہی اہتمام اور جانفشانی سے کئی نسخوں کے مقابلے کے بعد اس کا متن تیار کیا تھا اور تمہید کے طور پر مثنوی کی اہم خصوصیات کا ذکر اور اس کا باقاعدہ تجزیہ بھی متن کے ساتھ شامل کر دیا ہے، جو قابلِ دید ہے۔

نہ سپہر:

مفتاح الفتوح کی طرح خسرو کی یہ تاریخی مثنوی بھی نہیں چھپی، حالانکہ نہ صرف تاریخی حیثیت بلکہ معاشرتی نقطہ نظر سے بھی یہ مثنوی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جب علاؤالدین کے بعد اس کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ تخت نشین ہوا تو اسے جہاں نام آوری اور شہرت کے لیے اور چیزوں کا خیال پیدا ہوا، وہاں یہ بھی شوق ہوا کہ کوئی بڑا شاعر اس کے عہد کے واقعات کو منظوم کرے، اور اس کے صلے میں اس نے ہاتھی کے وزن کے برابر سونا تول کر دینے کا وعدہ کیا۔ ظاہر ہے کہ خسرو کے علاوہ اور کون یہ کام سرانجام دے سکتا تھا۔ چنانچہ بادشاہ کی نظرِ انتخاب ان ہی پر پڑی، اور اس نے ان کو ایک قاصد کے ذریعے سے دربار میں بلا بھیجا، اور خلعت اور انعام واکرام دے کر ان سے مثنوی لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ خسرو نے اس کام کو اپنے ذمہ لے کر جمادی الاوّل 718ھ میں، جب ان کی عمر تقریباً سڑسٹھ سال کی تھی، پورا کیا اور بادشاہ کی نذر کیا۔ اس کے صلے میں واقعی انہیں ہاتھی کے وزن کے برابر سونا ملا یا نہیں، یہ امر مشتبہ ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ اس بادشاہ نے خسرو کی جتنی قدر دانی اور ہمت افزائی کی اتنی پہلے کسی بادشاہ نے نہ کی تھی۔ خسرو کہتے ہیں:

چنیں بخششی کز تو جم یافتم
ز شاہان پیشینہ کم یافتم!

اس مثنوی کو خسرو نے نو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ جن میں سے بعض بڑے ہیں، بعض چھوٹے، اور ہر ایک حصے کو ایک سپہر مانا ہے جو کسی نہ کسی ستارے سے متعلق ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر ایک سپہر ایک مختلف بحر میں ہے۔ مثنوی کے کل اشعار پانچ ہزار چار سو نو ہیں[2] مختلف

بحروں کا ایک ہی مثنوی میں استعمال خسرو کی جدت ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس سے مثنوی کی یکسانیت میں، جس سے اکثر پڑھنے والا گھبرا جاتا ہے، ایک بہت خوش گوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ مثنوی میں ابیات سلسلہ بھی ہیں اور ہر ایک سپہر ایک غزل پر ختم ہوتا ہے۔ خسرو نے جو بحریں اس مثنوی میں استعمال کی ہیں وہ سپہروں کے اعتبار سے علی الترتیب یہ ہیں۔

1. متقارب مثمن محذوف۔
2. متقارب مثمن سالم۔
3. رجز مسدس مطوی۔
4. رمل مسدس محذوف۔
5. خفیف مسدس مجنون ومحذوف۔
6. ہزج مسدس مقصورومحذوف۔
7. رمل مسدس مقصور۔
8. ہزج مسدس اخرب مقبوض ومحذوف۔
9. رمل مسدس مجنون ومحذوف۔

ان بحروں میں سے بعض یقیناً ایسی ہیں کہ جو خسرو سے پہلے کسی نے استعمال نہ کی تھیں مثلاً نمبر 2 اور نمبر 3 میں نہ صرف انہوں نے ایک بہت ہی مشکل بحر کو خوب صورتی سے نباہا ہے بلکہ زیادہ تر قافیوں میں صنعت اعنات یا لزوم مالا یلزم کو بھی مدنظر رکھا ہے جو ان کی قدرت کلام کا بدیہی ثبوت ہے، سپہروں کے حساب سے مثنوی کے مضامین مختصر طور پر یوں ہیں:

پہلا سپہر: حمد، نعت، منقبت حضرت نظام الدین اولیا، مدح بادشاہ، بادشاہ کی تخت نشینی کا بیان اور مثنوی کے نظم کرنے کی وجہ، مبارک شاہ کی سرکردگی میں جنوب کی مہم روانہ کرنا اور خسرو خاں کا راجہ رام دیو کے سرکش نائب راگھو کی سرکوبی اور سرزنش کے بعد واپس دہلی آنا۔

دوسرا سپہر: قطب الدین مبارک شاہ کی بنا کردہ عمارتوں کا بیان، تلنگ اور وارنگل کی مہموں کا ذکر، دہلی کی تعریف اور اس کی فضیلت، بغداد، قاہرہ، خراسان، ترمذ، تبریز، اصفہان، بخارا اور خوارزم پر، یہ سپہر جیسا ابھی بیان ہو چکا ہے، بحر متقارب مثمن سالم میں ہے، جس سے ایک عجیب طرح کا ترنم اور موسیقیت پیدا ہو گئی ہے۔

تیسرا سپہر: یہ سب سے بڑا بھی ہے اور سب سے اہم بھی۔ اس میں تقریباً ہندوستان کی ہر ایک چیز کو سراہا گیا ہے اور ضمناً یہاں کے باشندوں کی ذہانت، استعداد علمی، زبانوں رسم و رواج، مذہبی عقائد وغیرہ کے متعلق بہت دلچسپ معلومات دی گئی ہیں۔ آخر میں وارنگل کی مہم پر ہرپال دیو کی شکست، خسرو خاں کی مظفر و منصور فوج کی دہلی واپسی اور خوشی کے جشن کا بیان ہے۔

چوتھا سپہر: پند و نصائح پر مشتمل ہے۔ بادشاہ سے لے کر رعیت کے ادنیٰ آدمیوں تک سب ہی کو خسرو نے بہت صاف گوئی اور دلیری سے خطاب کیا ہے اور انہیں ان کے فرائض سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

پانچواں سپہر: ہندوستان کے جاڑے کی توصیف، بادشاہ کا شکار اور سیر کے لیے جانا، بادشاہ کی کمان اور تیر میں عشق و محبت کے راز و نیاز۔ اس آخری حصے میں خسرو نے صوفیوں کے نقطہ نظر سے محبت کو تمثیلی پیرائے میں خوب بیان کیا ہے۔ اگرچہ بحیثیت مجموعی یہ سپہر بے مزہ اور پھیکا ہے۔

چھٹا سپہر: شہزادہ محمد کی سنہ 718 میں پیدائش زائچہ اور فالنامہ، شہزادے کی تعظیم اور اس کے مستقبل کے متعلق پیش گوئی اور دعائے خیر۔ اس سپہر میں خسرو نے اپنے علم نجوم کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔

ساتواں سپہر: موسم بہار کا بیان، شہزادہ محمد کی پیدائش پر دہلی کی آرائش اور خوشی کے جشن، شراب اور آلات موسیقی کا بیان۔ یہ سپہر بہت دلچسپ ہے۔

آٹھواں سپہر: پانچویں سپہر کی طرح یہ بھی بے لطف ہے۔ اگرچہ اس میں بھی عشق حقیقی کے مسائل کو چوگان اور گیند (گری) کے مناظرے کی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے اور کہیں کہیں غزلیہ ٹکڑے اچھے ہیں۔

نواں سپہر: مثنوی کا خاتمہ، دہلی کے شعراً کی اور خود اپنی ستائش، مثنوی کی تعریف اور خامیوں کے لیے معذرت وغیرہ۔ یہ سپہر خاصا دلچسپ ہے۔

نمونے کے طور پر مثنوی میں سے چند ٹکڑے یہاں پیش کرتا ہوں۔

ارم کندہ (ہانم یا آنم کندہ) کا بیان: (دوسرا سپہر)

بنزدیک قلعہ است ارم کندہ جائی
بلند و نمایندہ نزہت فزائی

سوی راستش از بلندی برآمد
چناں کش نظر سوئی آں منظر آمد
نگہ کرد و دید آسمان وش حصاری
نہ پیدا میاں زمینش کناری
نہ پیرامنش چشمہ و باغ دبستان
فزایندہ عیش و عشرت پرستان
ہمہ میوہ اش نغزک و موز و کتھائی!
نہ چون سیب بس وخنک چوں سفرجل
ہرآن بو کہ آمد ازاں سو پیاپے
ہمہ بوئی گلہائی ہندو زد از وی
ہمہ چنپہ و کیورہ بوئی در بوئی!
ہمہ بیل گل در گل و روی در روی

دہلی کی بعض عمارتوں کی تعمیر: (دوسرا سپہر)

رسیدند بنیاد کاران دانا
بہ بل بر رخ باد بستن توانا
گزی برکف و رشتۂ ہم نہفتہ
کہ عام بیدار و در سیر خفتہ
بہرسوکہ فرمودہ گز را اشارت
عمود ترازو شدہ در عمارت
بہر جا کہ آن رشتہ را ساز بستہ
رگ جان سنمار نعمان گستہ!
پیاپی مہیا شد اندر دو بدن
کہ تابد در اندیشۂ ہوش مندان
بہر سوی گردون شد اندر دو بدن

بیاری کہ گردوں نیارد کشیدن
ببالائی گردون زحل کردہ خانہ
دو چرخی فیرود از دو نورش روانہ
زحل راندہ دو تور را غیر پالان
ز آثار در نور دو چرخ نالاں
بیاوردن سنگ مزدور سنگیں
سلب کردہ از گرد شبرنگ رنگین
بہرسوئی رازی شدہ کارسازی!
ملک زادۂ کارفرمائی رازی
بہ تعجیل کردند اندک اساسی
کہ باشد اساس عمل را قیاسی
چو محراب دارالخلافہ برآمد
درآمد خلیفہ چو جمعہ درآمد
درو روز آدینہ را کرد گلشن
ز نور تعبد چو خورشید روشن

مالِ غنیمت کے ہاتھی: (تیسرا سپہر)

باز نمودند بختم الخلفاء!
آمدن مروہ و اسباب صفا!
کرد اشارت شہ خورشید ظفر
کامدہا بگوردش پیش نظر
ذیل سراپردہ برآمد بہ ہوا
تعبیۂ پیل درآمد بہ نوا
دبدبہ زد دہل پوشیدہ دہان
گشت کر از طاسک و کرنائی جہاں

شد گزران کوہ گرانما یہ بہ تگ
رشتہ گسل گشتہ زمیں راہمہ رگ
پیل ہمہ زندہ کہ گو کہ سپرد
دامن کہسار چو زندہ بدرد
کوہ گراں سنگ سبک سیر چو کہ!
سایہ او نیزگراں گشت برہ
جل بریشم بتنی ہم چو جہاں
پیل شدہ دربچۂ پیلہ نہان
برچمش از گوش شد ناپز مین!
ہم چو محاسن کہ بنا گوش نشین
مرد کہ برپشت نگہبان بودش
چوں ملکی کابر بفرمان بودش
گشتہ کژک حاکم اوگاہ گہی!
برصفت عاقلۂ پیش تہی
اژدر و ماری زپس و پیش نگوں
پیش عزیمت گرد از پس بفسوں
بنی او بیخ کن و شاخ شکن
بلکہ بکیں تیغ زن و تیر فگن
تیر فگن چشم تبانست بسی
تیر فگن بنی کم دیدہ کسی
برج رود در زمین از تہش او
قلعہ بخندق فتد از جنبش او
تپ تپ پابش کہ برفتن شدہ گم
تپ تپہائی دگردش درتہ دم

امیر خسرو

در صفت پیل چو گشتم نگراں
دل بکم گشت و شد اندیشہ گران

ہندوستانی گانے والیاں:

لعبتاں ہندوی ہم جا بجائی
گشتہ ہم پاکوب و ہم نغمہ سرائی
ہر یکی راگاہ قتل معنوی
خنجر ہندی زبان ہندوی
ایں کشیدہ سرمہ از دود چراغ
دودۂ او کردہ درصد سینہ داغ
او بہ پیشانی ز صندل دادہ رنگ
سوئی سیم آوردہ صندل راز سنگ
ایں سرودی گفت کا ہو گہ بدشت
بشنود نارو بصحرا بازگشت
اوالادن راچناں بنو اختہ
کاب حیراں را بردو انداختہ
ایں گرفتہ تال روئین را بدست
زان دو روی او ہمہ بکرویہ مست
اوکشیدہ نار لو پولادیں بساز
کاہنسین دلہا فتادہ در گداز
ایں بہ نغمہ زہرۂ کیوان نسب
آں بزیبائی مہ زہرہ طرب!
ایں ز لعل آب دار آتش نشان
اوبگفت سوزناک آتش فشان
ایں میان شانہ موبش تامیان

اومیان چون موی و در مویش نہان
ایں چوطا و دسان ہندی جلوہ گر
اومعلق زن چو مرغش از زبر
ایں شدہ گردان بسرعت ہمچو ماہ
اوبگردش ماہ را بردہ ز راہ
ایں ز مو مرغول کردہ در قفا
کردہ زان مرغول بوخلقی جفا
او برآمودہ بہ مروارید فرق!
آشنا صدگان دراں ہر قطرہ غرق
ایں زبنی گوہری آویختہ
گوہری از خنجری آویختہ
او جواہر برجبیں آراستہ
ہم چو پروین برمہ ناکاستہ
ہر پری برتن لباس دیوگیر!
پرنیاں را سایہ برتن زاں حریر
ایں چنین خوباں جمال دور ماہ
بس کہ می بودند ہر کس راز راہ
زاں شغبہا کز کرانہا می زدند
آشکارا جا نہا می زدند

تغلق نامہ:

تاریخی مثنویوں کے سلسلے میں یہ آخری مثنوی خسرو نے اپنے انتقال سے کچھ پہلے تصنیف کی تھی، اوراگرچہ اس کا ذکر تذکروں میں موجود تھا لیکن ابھی حال کے زمانہ تک کوئی نسخہ اس کا دستیاب نہ ہوسکا تھا۔ اس لیے یہ خیال کرلیا گیا تھا کہ خسرو کی یہ تصنیف دستبرد سے ہمیشہ کے لیے

مفقود ہو چکی ہے۔ لیکن اتفاق سے مولوی رشید احمد صاحب کو حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے کتب خانے میں ایک قلمی نسخہ ملا جس کا عنوان ''جہانگیر نامہ'' تھا اور انہوں نے اس نسخہ کو پڑھنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ یہ نسخہ جہانگیر نامہ نہیں ہے اور نہ جہانگیر کے ہم عصر شاعر حیاتی کی تصنیف ہے، بلکہ وہی گم شدہ تغلق نامہ ہے، جس کا ہندوستان یا یورپ کے کتب خانوں میں کہیں کھوج نہیں ملتا تھا۔ مثنوی کے ابتدائی اشعار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جہانگیر کے زمانے میں یہ مثنوی ناکمل حالت میں کہیں ملی تھی یعنی شروع اور آخر کے حصے موجود نہ تھے، جہانگیر نے اپنے دربار کے شاعر حیاتی سے کہا کہ وہ مثنوی کو مکمل کردے۔ اس واقعے کو حیاتی نے یوں لکھا ہے:

ازاں دفتر ولی ز آغاز و انجام
سخن رانی نشان نی قصہ را نام
شد از حضرت اشارت کالی فلانی
سخن را ای سروش آسمانی
چنیں باید کہ گردد ایں سخن تو
شود تا شاد از ما روح خسرو

چنانچہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حیاتی نے مثنوی کی تکمیل کردی۔ اگرچہ مولوی رشید احمد صاحب کو جو نسخہ دستیاب ہوا، اس میں شروع کے 176 شعر حیاتی کے کہے ہوئے موجود ہیں، لیکن آخر میں ایک پورا باب غائب ہے اور صرف اس کا عنوان جوابیات سلسلہ میں سے ہے، باقی ہے۔ بقول حاجی خلیفہ اور امین رازی[3] خسرو کی مثنوی میں تین ہزار بیت تھے۔ موجودہ حالت کی مثنوی میں ابیات کے علاوہ کل دو ہزار آٹھ سو چھیانوے شعر ہیں جن میں سے ایک سو اناسی شعر حیاتی کے نکالنے کے بعد اصل مثنوی کے کل دو ہزار سات سو سترہ شعر رہ جاتے ہیں۔

تغلق نامے کا مطالعہ کرنے کے بعد مولوی رشید احمد صاحب نے اس پر ایک مبسوط اور مدلل دیباچہ لکھنا شروع کیا، جس میں انہوں نے مثنوی کی خصوصیات اور اس کے خسرو کی تصنیف ہونے کے سوال پر بہت قابلیت سے بحث کی۔ ان کا ارادہ تھا کہ مثنوی کا متن اس مقدمے کے ساتھ شائع کریں لیکن عمر نے وفا نہ کی اور وہ کام ادھورہ رہ گیا، مگر خوش قسمتی سے مولوی سید ہاشمی صاحب کی نظر

سے حبیب گنج لائبریری کے نسخے کی ایک نقل گزری اورانہوں نے اس مثنوی کو چھاپنے کا ارادہ کرلیا۔ چنانچہ نقل اوراصل کے مقابلے اورتصحیح کے بعدانہوں نے 1932ء میں اسے حیدرآباد سے شائع کر کے خسرو کی مطبوعہ تصانیف میں ایک گراں قدر اضافہ کردیااور یہ کتاب جوتاریخی حیثیت سے بہت ہی بیش قیمت ہے،اب ہمارے سامنے موجود ہے۔

مثنوی کا آغاز قطب الدین مبارک شاہ کے عہد سے ہوتا ہےاوراس حصے میں بادشاہ کی عیش پرستی اوراس کی خسروخاں پر بے انتہا عنایت،خسروخاں کی بے وفائی،اپنے آقائے نعمت کے قتل کی سازش اورنوجوان بادشاہ کی حسرتناک موت کا ذکر کیا ہے۔اس کے بعد غیاث الدین تغلق کے انتقام کے لیے تیاریاں کرنا،دہلی پراس کی چڑھائی،خسروخاں کے بھائی خان خاناں اورخود خسرو خاں کی فوجوں کی شکست اور تغلق شاہ کے دہلی میں فاتحانہ داخلے کا بیان ہے۔مثنوی تغلق شاہ کی تخت نشینی کے بیان پرختم ہوجاتی ہے۔آخر کا ایک باب جس میں خسرو،بادشاہ کی طرف سے امراء کو اکرام وانعام اورچتر ومراتب وغیرہ کے دیئے جانے کا ذکر کرنا چاہتے ہیں،موجودہ نسخے میں نہیں ہے۔صرف یہ بیت سلسلہ باقی رہ گیا ہے:

حدیث چتر و کشور دادن شہزادگان و آنکہ
بشغل آراستن کار ملوک و بندہ و چاکر

تغلق نامے کا اسلوب بیان سیدھا سادہ ہےاوراگر چہ اکثر جگہ شاعر نے صنائع اور بدائع کا استعمال کیا ہےتو بھی اس مثنوی میں وہ رنگ آمیزی اورشاعرانہ بلند پروازی نہیں ہے جوخسرو کی بعض اورتاریخی مثنویوں میں پائی جاتی ہے۔بحیثیت مجموعی یہ مثنوی مفتاح الفتوح سے زیادہ مشابہ ہےاورہونا بھی چاہیے تھی،اس لیے کہ خسرواپنے مربی کا میلانِ طبیعت دیکھ کرشعر کہتے تھے۔جلال الدین فیروز خلجی اورغیاث الدین تغلق دونوں سیدھے سادھے جفاکش سپاہی تھے جنھیں نیرنگیٔ قسمت نے تختِ سلطان پر لا بٹھایا تھا اور جن میں نہ تو خضر خاں کی سی تہذیب اورشائستگی اور نہ مبارک شاہ کی سی رنگینی اورعیش پسندی تھی۔اسی لیے اس مثنوی میں نہ تو عشقیہ کی سی رقت بیان اورتغزل ہےاورنہ سپہر کا سا شکوہ الفاظ اورمظاہرۂ علم،لیکن پھربھی بعض جگہ خسرو کے خاص انداز کی جھلک نمایاں ہے۔خصوصاً بعض نادر تشبیہوں کی شکل میں جس کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

تغلق شاہ جب حملے کے لیے بڑھا تو اس کا بیٹا فخر الدین جونا خاں آگے آگے ہراول کے دستے کی قیادت کر رہا تھا۔ خسرو اس بات کو یوں بیان کرتے ہیں:

بہ پیش آہنگ آں قلب معظم
ملک فخر الدول گشتہ مقدم
ملک دریاصفت در صف ہیجا
خلف در پیش ہمچوں موج دریا

پریشانی اور پراگندگیٔ خاطر کی تشبیہ کس انداز سے دیتے ہیں:

ہمہ شبہا کسان در بیم و تشویش
چو پیر روستائی را سرو ریش

نیزے اور بھالے سنبھالے ہندو سورما اکڑتے ہوئے کس طرح میدانِ جنگ کو چلے:

رواں باخشت و ژوپین ہندو گستاخ
چو آہوئی سیہ بالا زدہ شاخ

خسرو خاں کے نیم اسلام اور اس کے ہمراہیوں کی مکمل بے دینی کی تشبیہ ملاحظہ ہو۔

سگ مرتد برآں گبران سپہ دار
بسان صبح کاذب در شب تار

خسرو خاں چتر کے نیچے میدانِ جنگ میں شان سے کھڑا ہے، مگر شاعر کو معلوم ہوتا ہے کہ:

سیا قلب مرتد چتر بر سر
نہ چتر سماروغ خوردۂ تر!

خسرو خاں جب میدانِ جنگ سے جان بچا کر بھاگا ہے تو اس کی کیا حالت تھی:

گہی ماند گہی رفت و گہ افتاد
چو برگی در خزان از جنبش باد

اسی طرح ہندی الفاظ کا استعمال اس مثنوی میں بہت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے، مثلاً کہتے ہیں:

دگر ہر مارو بیری مار و پرمار
سخن شان "مارمار" وسر بسر مار
یکی روئین تن اندر پیش شان "نہال"
دگر روئین تن اندر پیش شان مال
چو بکشا دند تیر بے خطا را!
بہ زاری گفت "ہے ہے" تیر مارا
یکی از راوتان "ہار" گہر برد
یکی از گوش گوش آویز زیر برد

لیکن مثنوی تغلق نامہ دراصل ادبی نقطہ نظر سے اتنی اہمیت نہیں رکھتی جتنی تاریخی حیثیت سے، اس لیے کہ اس میں بعض ایسی تفصیلی باتیں ملتی ہیں جو اس زمانے کی کسی تاریخ میں درج نہیں ہیں اور جن کی صحت کے متعلق ہمیں پورا اطمینان ہے۔

خمسۂ خسرو:

اس خمسے کی پانچوں مثنویاں یعنی مطلع الانوار، شیرین وخسرو، مجنوں ولیلیٰ، آئینۂ اسکندری اور ہشت بہشت، نظامی گنجوی کی پانچ مثنویوں یعنی مخزن الاسرار، خسرو وشیرین، لیلیٰ ومجنوں، سکندر نامہ اور ہفت پیکر کے جواب میں لکھی گئی ہیں، اور خسرو نے وہی بحریں استعمال کی ہیں جو نظامی نے کی تھیں اور ہر ایک مثنوی میں انہی مضامین کو باندھا ہے جو اس کے مقابلے کی نظامی کی مثنوی میں موجود ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے خسرو نے یہ خمسہ بادشاہ یا کسی اور مربی کی فرمائش

پر نہیں لکھا۔ اگرچہ انہوں نے اسے علاؤالدین خلجی کے نام سے معنون ضرور کیا ہے[4] بلکہ انہیں از خود یہ خیال پیدا ہوا کہ نظامی کے مشہور اور مقبول عام خمسے کا جواب لکھ کر اقلیم سخن میں مزید شہرت اور سربلندی حاصل کریں۔ علاؤالدین کے زمانے میں خسرو کا ملکہ شاعری اور ذوق سخن اپنے پورے شباب پر تھا اور کچھ عجب نہیں کہ جب انہوں نے اس دشوار کام کو شروع کیا تو ان کے دل میں یہ خیال ہو کہ وہ اپنے نامور پیش رو سے اس میدان میں بازی لے جائیں گے۔ لیکن خسرو میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں وہاں وہ انتہا کے منصف مزاج بھی واقع ہوئے تھے۔ اپنے کلام پر کسی شاعر کا بے لاگ رائے دینا ذرا مشکل ہے لیکن خسرو اپنی اچھائی اور برائی کو خوب سمجھتے تھے اور اپنی رائے کے اظہار میں تامل بھی نہ کرتے تھے، چنانچہ شروع میں جب انہوں نے خمسہ لکھنا شروع کیا تو اس میں انہیں اس قدر کامیابی ہوئی کہ بقول ان کے نظامی اور ان کے کلام میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا تو شاعرانہ تعلّی میں وہ یہ ضرور کہہ گئے ہیں کہ:

کہ کہ خسرویم شد بلند
زلزلہ در گور نظامی فگند

مگر رفتہ رفتہ انہیں اس کام کی دشواری کا احساس ہونے لگا اور انہیں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ اتنی محنت اور مشقت بیکار ہے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ خسرو نے خمسے کی پہلی مثنوی کو صرف چودہ پندرہ دن کے اندر ختم کر دیا اور پورا خمسہ بھی دو سال کے قلیل عرصے میں لکھ ڈالا۔ کام کو شروع کر کے اسے ناتمام چھوڑ دینا ان کے شیوے کے خلاف تھا۔ اپنی ناکامی کا احساس اور اس کا اظہار اور بات ہے، مگر اعتراف شکست، اور وہ بھی ایک شروع کیے ہوئے کام سے دستبرداری کی شکل میں، خسرو کے لیے ممکن نہ تھا۔ تعجب یہ ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود خسرو نے ہزارہا اشعار اتنے کم عرصے میں کہہ ڈالے اور شعر بھی اس اعلیٰ پائے کے کہ متعدد جگہ بعض مضمونوں کو باندھنے میں یقیناً وہ نظامی سے سبقت لے گئے ہیں:

خسرو نے پہلے خمسے کی سب مثنویوں میں نظامی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی ہے اور شاید یہ ان کی پہلی اور آخری تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنی مخصوص روش اور آزاد منشی کو ایک استاد کی کامیاب تقلید پر قربان کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے خمسے میں وہی رنگ جلوہ گر ہو جائے جو

نظامی کے خمسے میں ہے۔ چنانچہ مجنوں ولیلیٰ کے خاتمے میں کہتے ہیں:

پی بر پی او چنانکہ دانم
گفتم قدمی زدن توانم
از شیوۂ خود رمیدہ گشتم
تسلیم ہماں جریدہ گشتم
چیدم بقلم نمونہ پیش
بردم زمیان تکلف خویش
آرائش پیکر معانی
بستم بسلامت روانی
کان مایہ کہ صنعتی بود خام!
از شیوۂ من برون برہ نام

خسرو کو اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی، اس کے متعلق مختلف نقادوں نے مختلف رائے دی ہیں۔ خسرو کے بعض ہم عصر جو اُن سے رقابت اور چشمک رکھتے تھے، خصوصاً عبید، جس کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے، ان کی اس کوشش کو سودائے خام سمجھتے تھے۔ چنانچہ عبید نے تو کہہ ہی دیا کہ:

غلط افتاد خسرو راز خامی
کہ مسکبا پخت در دیگ نظامی[5]

اس کے مقابلے میں بعد کے زمانے کے نقادوں نے خسرو کے خمسے کی تعریف میں یہاں تک غلو سے کام لیا ہے کہ ان کے ایک شعر کو نظامی کے پورے خمسے پر بھاری بتایا اور شعر بھی کیا کہ:

لیکن میرے خیال میں نہ تو خسرو کے حاسدوں کے طنزیہ فقرے قابل اعتنا ہیں اور نہ ان کے مداحوں کی مبالغہ آمیز ستائش لائق اعتماد۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر خمسے کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو وہ نظامی کے خمسے کی ایک بہت اچھی نقل کہا جا سکتا ہے۔ نقل کا اصل سے بڑھ جانا ہمیشہ

مشکل ہوتا ہے۔اس لیے خسرو کے خمسے کی انتہائی تعریف، جو صداقت سے بھی چنداں بعید نہ ہوگی، یہی ہوسکتی ہے کہ وہ خمسہ نظامی کی بہترین ممکن نقل ہے۔ چنانچہ اس رائے سے بعض بہت ہی قابل جوہریان سخن مثلاً جامی اور نوائی وغیرہ کو بھی اتفاق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض جگہ خسرو ایسے مقام باندھ گئے ہیں کہ نظامی ان کی خوبی اور بلندی کو نہ پہنچ سکے تھے۔

خسرو کے خمسے کی سب مثنویاں علی گڑھ سے بہت صحت اور اہتمام کے ساتھ شائع ہو چکی ہیں، اور چونکہ وہ قابل ادیب اور نقاد، جن کی زیر نگرانی ان کی اشاعت ہوئی ہے، ہر ایک مثنوی کے دیباچے میں فرداً فرداً اس پر رائے زنی اور تبصرہ کر چکے ہیں۔ اس لیے کتاب میں مزید تجزیے اور تنقید کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ لیکن ایک بات یہاں ظاہر کر دینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ خسرو نے انہی کہانیوں اور مضامین کو باندھا ہے جو نظامی کی مثنویوں میں تھے۔ لیکن جہاں تک جزئیات کا تعلق ہے انہوں نے نظامی کی تقلید پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی رائے سے بہت کچھ کام لیا ہے اور جگہ جگہ واقعات میں ردوبدل کر دیا ہے۔

یہ پانچوں مثنویاں 698ھ سے 701ھ کے عرصے میں لکھی گئیں اور ہر ایک مثنوی کے اشعار کی تعداد خسرو نے حسب ذیل بتائی ہے۔

1- مطلع الانوار: تین ہزار تین سو دس۔
2- شیریں وخسرو: چار ہزار ایک سو چوبیس۔
3- مجنوں ولیلیٰ: دو ہزار چھ سو ساٹھ۔
4- آئینۂ سکندری: چار ہزار چار سو پچاس۔
5- ہشت بہشت: تین ہزار تین سو پچاس۔

خمسے کی مثنویوں میں شاید سب سے زیادہ شہرت مطلع الانوار کو حاصل ہوئی۔ چنانچہ متعدد شاعروں نے اس کے جواب لکھے۔ جن میں جامی کی تحفۃ الابرار خاص طور پر قابل ذکر ہے، لیکن میرے خیال میں فنی حیثیت سے جو بات مجنوں ولیلیٰ میں نکلتی ہے وہ کسی اور مثنوی میں نہیں ہے۔ عشق کے رموز واسرار، عاشق ومعشوق کے راز ونیاز، تاثرات اور واردات قلبی جس سلاست، رنگینی اور سوز کے ساتھ خسرو نے بیان کیے ہیں اس کی نظیر ان کے پیشرو کے شاہکار میں بھی بہ مشکل ملے گی۔

☆☆

بارھواں باب

غزلیاتِ خسرو

خسرو غزل گوئی کو کوئی خاص اہمیت نہ دیتے تھے۔ اس لیے کہ، جیسا انھوں نے ایک جگہ کہا ہے، ہر وہ شخص جو دو چار شعر موزوں کر سکتا ہے غزل گو ہونے کا دعویدار بن سکتا ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے اپنی غزلوں کو جمع کرنے یا انہیں باقاعدہ ترتیب دینے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ آج خسرو کی شہرت کا زیادہ تر دارومدار ان کی غزلوں ہی پر ہے۔ ان کے طولانی مرصع اور مزین قصائد کے دیوان، ان کی لمبی چوڑی مثنویوں اور ان کی انشاء کے نمونے جو اعجاز خسروی کی پانچ جلدوں میں موجود ہیں زیادہ تر محض کتب خانوں کی زینت بن کر رہ گئے ہیں لیکن ان کی غزلوں پر آج بھی اہلِ دل اس طرح سر دھنتے ہیں جیسے ان کے اپنے زمانے میں دھنتے تھے۔ بظاہر یہ بات تعجب خیز ضرور ہے لیکن اگر ہم ذرا غور سے کام لیں تو آسانی سے یہ معما سمجھ میں آسکتا ہے۔

غزل کیا ہے؟ اس کی قدیم تعریف ''عورتوں سے (یا عورتوں کے متعلق) باتیں کرنا''، جتنی فرسودہ ہے اتنی ہی ناکافی بھی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ غزل کی جان وہی حسن و عشق کی قدیم داستان ہے۔ لیکن فارسی یا اردو شاعری میں غزل کا میدان محض اظہارِ عشق یا عاشق کے وارداتِ قلبی کے بیان تک محدود نہیں ہے بلکہ ان تمام تاثرات کو شاعرانہ اور فلسفیانہ طریقے سے بیان کرنے کا ذریعہ ہے جو مختلف نوعیت کے محرکات سے انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، اور واقعہ تو یہ ہے کہ شاعری کی کوئی صنف مضامین کے اعتبار سے اتنی جامع نہیں ہے جتنی غزل، بلکہ اس میں سب اصنافِ شاعری کی جھلک موجود ہے۔ چنانچہ مدح، ہجو، مرثیہ، فخر، معاملہ بندی یا واقعہ نگاری غرض یہ کہ کوئی مضمون ایسا نہیں ہے کہ جس کے لیے پانچ سات شعروں کی غزل کا ظرف تنگ سمجھا گیا ہو۔ سطحی اور عامیانہ خیالات سے لے کر بہت ہی گہرے اور فلسفیانہ حقائق، اساتذہ نے اس غزل

میں باندھے ہیں کہ اگر غزل کو شاعری کا خلاصہ اور شعریت کا نچوڑ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ غزل کا اختصار بجائے خود اس کی دلفریبی اور مقبولیت کا ضامن ہے اور پھر اس کے مضامین اور موضوعات کا یہ تنوع اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیتا ہے۔

اگر ہم اس حقیقت کو مدنظر رکھیں تو یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ تمام اصناف شاعری میں غزل کو ایک خصوصیت حاصل ہے، اور اسی لیے یہی وہ صنف ہے جس کی جاذبیت عام ہے۔ قصائد، ممکن ہے کہ علم و ہنر کے نقادوں کی توجہ کو جذب کریں۔ مثنوی افسانے یا تاریخ کے شوقینوں کے لیے باعث دلچسپی ہو سکتی ہے، لیکن شاید ہی کوئی ایسا بدذوق اور بے بہرہ متنفس ہوگا جسے اپنے مزاج کے مناسب کوئی نہ کوئی چیز غزل میں نہ مل سکے، بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوئی انسانی جذبہ کوئی فطرتی احساس اور کوئی وجدانی کیفیت ایسی نہیں ہے کہ جس کی صدائے بازگشت باکمال غزل گو شعرا کے کلام میں نہ سنائی دیتی ہو اور چونکہ یہ جذبات، یہ احساسات اور یہ کیفیات مکان اور زمانے کی قید سے آزاد ہیں اس لیے غزل کی کوشش بھی عام اور دوائی ہے۔ غزل، مذہب ملک اور قوم کی حدود کی پابند نہیں۔ یہ عام انسانیت کی آواز ہے۔ یہ انسان کے ان غموں اور ان خوشیوں کا نوحہ اور نغمہ ہے جو ابتدائے آفرینش سے انسان کے دل پر اثر انداز ہوتے رہے ہیں اور ہمیشہ ہوتے رہیں گے اور شاعر کا کمال یہی ہے کہ وہ ان تاثرات کو جو ہمارے دلوں میں موجود ہیں، لیکن جن کے اظہار سے ہم قاصر ہیں، موزوں و مناسب الفاظ میں ظاہر کر سکتا ہے۔

خسرو سے پہلے سعدی، فارسی غزل گوئی میں بہت کچھ شہرت حاصل کر چکے تھے اور ان کی استادی اس صنف شاعری میں عام طور پر تسلیم کی جاتی تھی۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ جو سلاست اور روانی، رنگینی اور شیرینی سعدی کی غزلوں میں پائی جاتی ہے وہ نہ صرف ان سے پہلے کے شاعروں کے کلام میں مفقود ہے، بلکہ ان کے بعد کے شعرا کی غزلوں میں بھی کم پائی جاتی ہے۔ لیکن سعدی کی غزل میں ایک بات کی کمی ضرور تھی۔ اس میں وہ سوز و گداز اور وہ جوش و خروش نہ تھا جو انسان کے خوابیدہ جذبات کو بیدار کر سکے، جو اس کے مُردہ احساسات میں جان ڈال دے اور جو اسے بیخود اور وارفتہ بنا سکے۔ سعدی کی اس کمزوری سے ان کے جانشین ہم وطن شاعر حافظ نے فائدہ اٹھایا اور غزل گوئی میں وہ نام پیدا کیا کہ سعدی کی شہرت اس کے آگے ماند ہوگئی۔ لیکن حافظ سے پہلے ہندوستان میں خسرو کو بھی غزل کی اس کمی کا پورا احساس تھا اور اگرچہ ان کے ہم عصر

خواجہ حسن نے سعدی کے اسلوب کو اس قدر اپنایا کہ سعدیٔ ہند کا لقب پایا، لیکن خسرو کی جدت پسند طبیعت نے سعدی کی استادی سے تو انکار نہیں کیا، مگر ان کی شاگردی پر بھی اکتفا نہیں کیا، بلکہ غزل میں اپنے لیے ایک نیا مسلک، ایک انوکھی روش اور ایک جدید اسلوب اختیار کیا۔ جس کی کچھ جھلک حافظ میں بھی موجود ہے، لیکن جس کا پَرتَو زیادہ تر اور بعد کے شاعر مثلاً جامی، نظیری اور غالب میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ سعدی کی غزل میں ایک سادگیٔ خیالات ہے، جو بعض لحاظ سے یقیناً قابل ستائش ہے۔ لیکن جس کی وجہ سے ان کے اشعار میں کوئی گہرائی، کوئی باریکی اور کوئی نزاکت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ صفات خسرو کی غزلوں میں بہت نمایاں ہیں، اور انہیں صفات کو بعد کے شعرائے نے، جن کا میں نے ذکر کیا ہے، خاص طور پر اپنے غزلیہ کلام میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ سادگی خوش آئند ضرور ہے لیکن دقت پسند طبیعتوں کے لیے اس میں کوئی لطف نہیں۔ اس لیے اگرچہ سعدی کی غزل مزاجِ عام کے لیے باعث دلچسپی ہو سکتی ہے مگر وہ زیادہ شائستہ اور زیادہ مہذب دماغوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی۔

خسرو کی غزلوں میں جو سوز و گداز ہے اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ ان کے زمانہ سے لے کر آج چھ سو سال سے زائد گزر چکے ہیں، لیکن سماع اور قوالی کی محفلوں میں غالباً اب بھی سب سے زیادہ انہی کی غزلیں مقبول اور رائج ہیں، اور اس قسم کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ ان کا کوئی بہت ہی پُر درد شعر سن کر بعض لوگوں پر ایسی وجدانی کیفیت طاری ہوگئی کہ وہ جان سے گزر گئے۔ چنانچہ جہانگیر نے اپنی تزک میں لکھا ہے کہ اس کے عہد کے مشہور مہر کن ملا علی احمد نے ایک دفعہ قوالوں کو خسرو کا یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا:

ہر قوم راست راہی دینی و قبلہ گاہی
ماقبلہ راست کردیم برطرف کج کلاہی

اور ان پر ایسا اثر ہوا کہ وہ فوراً گر کر مر گئے۔[1]

ایک اور خوبی جو خسرو کی غزلوں میں پائی جاتی ہے، تسلسلِ مضامین ہے۔ ان کی متعدد غزلیں ایسی ہیں کہ جن میں بہت خوبی سے ایک ہی مضمون کو شروع سے آخر تک باندھا گیا ہے، لیکن غزل کے کسی شعر میں تکلف یا آورد کا شائبہ نہیں ہے۔ علاوہ ازیں خسرو چونکہ خود موسیقی دان تھے اس لیے

انہوں نے غزلوں کی بحریں اور الفاظ ایسے تلاش کیے کہ جن سے موسیقیت پیدا ہوئی ہو اور یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلوں میں ایک خاص روانی اور ترنم پایا جاتا ہے۔ ترنم پیدا کرنے کے لیے خسرو نے نہ صرف الفاظ اور بحریں موزوں اختیار کیں بلکہ اکثر جگہ قافیے بھی ایسے باندھے کہ جن کی طرف عام غزل گو شاعروں کا ذہن منتقل نہ ہوا تھا۔ مثلاً اپنی ایک غزل میں انہوں نے منۃ، البتہ، القد مقصد وغیرہ کا قافیہ باندھا ہے غزل کا مطلع ہے:

سروی چو تو در اوچہ و در نقہ نباشد
گل مثل رخ خوب تو البتہ نباشد

اور ایک غزل کا ایک اور شعر یوں ہے:

دوزند قبا بہر قدت از گل سوری
تا حسن دلآویز ترا لقد نباشد

اس قافیے کی قدرت اور لطافت اہل ذوق سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

خسرو کی غزل کی اور خوبیاں گنوانے کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے اور نہ میرے خیال میں ان کی غزلوں میں صنائع اور بدائع کو ڈھونڈ نکالنا کسی نقاد کے لیے ضروری ہے، اس لیے کہ کسی اچھے شاعر کے کلام میں صنائع اور بدائع موجود تو ضرور ہوتے ہیں لیکن نمایاں نہیں ہوتے اور جہاں کہیں وہ اس قدر نمایاں ہو جائیں کہ پہلے ان پر ہی نظر پڑے اور شعر کی خوبی کا انحصار انہی پر موقوف سمجھا جائے وہاں غزل کی اصل لطافت اور خوبی کالعدم ہو جاتی ہے۔ شاعر صنعتوں کے استعمال سے بے نیاز تو نہیں ہو سکتا لیکن جس طرح عروض، شعر کے لیے ضروری ہے مگر اس کا جاننا شاعر کے لیے ضروری نہیں ہے، اسی طرح صنائع ایک باکمال شاعر کے کلام میں پائے تو جاتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اس نے قصداً ان کو استعمال کیا ہو، بلکہ جس طرح طبیعت کی موزونی سے شعر خود بخود موزوں ہو جاتے ہیں اسی طرح طبیعت کی ''شعریت'' اور صنعت گری سے صنائع بھی خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو خسرو کے کلام کی یہ لفظی خوبیاں سمجھنے کا شوق ہو تو مولانا شبلی نے شعر العجم میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت کافی ہے، اور اس کے اعادے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ بہر حال انہیں

معنوی اور لفظی خوبیوں کی بنا پر خسرو کی غزلوں نے بہت جلد عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ سعدی شیرازی نے ان کی تعریف شہزادہ محمد شہید کو لکھ کر بھیجی اور حافظ نے جب لکھنوتی کے حاکم غیاث الدین کو ایک غزل لکھ کر بھیجی تو اس میں یہ شعر بھی تھا:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

''طوطیانِ ہند'' کا فقرہ لکھتے وقت یقیناً ان کے ذہن میں طوطی ہند امیر خسرو تھے۔ اسی طرح جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ:

''خسرو کی غزلیں ان خیالات اور تصورات کی وجہ سے جو مشہور و معروف ہیں اور جن کی عاشقان صادق اور ہوا پرست اپنے اپنے مذاق کے مطابق تاویل کرتے ہیں، عام طور پر مقبول ہیں۔''[2]

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ خسرو نے کبھی اپنی غزلوں کو جمع کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی، لیکن باوجود اس کے انہوں نے کم از کم اپنے دو دیوانوں یعنی غرۃ الکمال اور بقیہ نقیہ میں کچھ غزلیں ضرور شامل کی تھیں جو ان دیوانوں کے قلمی نسخوں میں موجود ہیں۔ ان غزلوں کے ساتھ چونکہ بیت سلسلہ موجود ہے اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ خسرو نے خود ان دیوانوں کے ساتھ چیدہ چیدہ غزلوں کا مجموعہ شامل کیا تھا۔ لیکن آیا اب جو غزلیں مختلف نسخوں میں یکساں نہیں ہیں اور بعض نسخوں میں جو غزلیں بقیہ نقیہ کے ساتھ مندرج ہیں وہ اور نسخوں میں غرۃ الکمال میں شامل ہیں۔ علاوہ ان دو مجموعوں کے بظاہر خسرو نے ایک انتخاب غزلوں کا اپنے چار دیوانوں سے تیار کیا تھا اور بہت ممکن ہے کہ ''کلیات اربعہ عناصر دواوین خسرو'' کے نام سے جو مجموعہ لکھنو سے شائع ہوا تھا، وہ یہی انتخاب ہو۔ اس مجموعہ کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے اس میں اور مطبوعہ نسخہ میں جو دیباچہ ہے اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انتخاب خسرو نے خود کیا تھا۔ چنانچہ دیباچے کا ایک حصہ جو اس لحاظ سے دلچسپ ہے کہ اس میں خسرو نے اپنی غزلوں پر رائے زنی کی ہے، حسب ذیل ہے:

''زیرا کہ دریں وقت اکثر طبائع بغزل میل دارد و از ان روز بازار فارسی گرم است درراویان سخن می خواہند تا از شعلہ غزل محرق مجلس را گرم گردانند اکنوں مصلحت آں دیدم کہ بہ ہوائی دل خویش

که کثافت طبیعی او آب گشته است از تارهٔ قلم روان گردانم و در اوصاف هر غزل چهار تشبیه به چهار عنصر برائے نمونہ شعر بر آئینہ تخیل حکماء از چهار خویش پیدا سازم، نظم:

تا بدانند که یک طبع رہی ہست چہار
کہ ہمی زائد از معدن و حیوان و نبات

معلوم خاطر اصحاب طبع باد کہ بمرتبہ اول غزلیاں بمشابہ خاک سرد و خشک و کثیف و تاریک است ایں غزلہا بہ نسبت صنائع و بدائع خشک و تکلف سرد و کثیف و بکثافت میل کند، چوں ہنگام پرداخت ایں دیوان اول تحفۃ الصغر، ایں طفل خاک را کہ ایام خاک بازیست با طفلان در ہر صنعتی، رغبتی تمام، غزلہائی ایں دیوان بریں تمثال او فتادہ است۔ شعر:

سہل باشد نباشد آں بسیار
کانچناں اندکست نے بسیار

مرتبہٴ اول آں بود۔ در مرتبہ دوم غزلہا مانند آب و چون آب بر خیال لطیف از خاک برتر است و از کدورات الفاظ کثیف مصفا وسط الحیات است گرم و تر افتادہ است گوئی کہ آبسیت کہ از آتش طبع خویش جوش بسیار یافتہ است و از محل مائیت بمرتبہ ہوائیت ترسیدہ و در مائیت خویش ماندہ۔ و بمرتبہ سوم غزلہائیست بر شبہ باد کہ بخاصیت چوں آب گرم و تر افتادہ است و ایں غزلہا لطیف تر است و رواں تر و برتر و از بس لطافت خلل پذیر نبود، و ایں غزلہا نیز مانند باد گرم و تر او فتادہ است و از غزلہائی کہ مانند آب است۔ لطیف تر است و روان تر و عالی تر از آتش طبع خویش قوت بسیار یافتہ است و از مقام ہوائیت بمرتبہ مائیت رسیدہ، و ایں دیوان غرۃ الکمال است، غزلہائی او نیز بریں نوع افتادہ است، باید کہ خوانندہ بطبع وقاد تامل فرماید، و مرتبہ چہارم غزلہا مثال آتش است چنانچہ آتش میل بالا دارد یعنی بہ علو و ہیچ سر بہ پستی فرود نیارد و تنزل را دردی راہ نبود و ہیچ طبعی از و بلند تر نبود و با او نرسد، چنانچہ حرارت خاصہ آتش است و دو ر دلہائی نرم چوں آتش در پنبہ گیرد و دل آہنین را قدری نرم سازد، و اگر دیست کہ دروی عشق جائی دارد انیک بسوز اندو خاکستر گرداند، غزلہائی بقیہ نقیہ (بریں نمط است) و بعد ازیں اگر شعلہ حیات روشن ماند و آتش طبع و

قادرو مشعل بود امید است کہ ایں غزلہائی سوزان بلند کرہ ایزراسراسر آتش پا می گرداند بمثابہ کہ شعلۂ سوزاں آں از حرمن ماہ بگذرد و در خوشہ عطارد گیرد و چنانکہ اشراق آں در چرخ او فتد و مشعلہ آفتاب را آب گرداند......"

لیکن چونکہ اس دیباچے کی عبارت بعض جگہ بالکل وہی ہے جو دیوان بقیہ نقیہ کے دیباچے کی ہے، اس لیے اس شبے کی گنجائش ضرور رہتی ہے کہ یہ انتخاب یا تو کسی اور نے کیا ہو اور اس کے شروع میں دیباچہ بقیہ نقیہ کے بعض حصے لے کر بطور دیباچہ شامل کر دیئے ہوں، اور یا یہ وہ مجموعہ ہو جسے خسرو نے دیوان بقیہ نقیہ کے ساتھ شامل کیا تھا۔ بہر حال انتخاب بہت اچھا ہے اور اگر خسرو کا خود کردہ نہیں ہے تو کسی ذوقِ سلیم رکھنے والے نے کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس کا اعادہ بے جا نہ ہوگا کہ مرزا ابابستغر کے زمانے میں بھی خسرو کے کلام کو جمع اور ترتیب دینے کا کام ایک شاعر سیفی کے سپرد کیا گیا تھا۔ کیا عجب کہ یہ انتخاب اس زمانے میں ہوا ہو۔

اب میں خسرو کی غزل کے چند نمونے پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ ان سے خسرو کے غزلیہ کلام کی وہ خوبیاں جن کا میں نے اشارتاً اوپر ذکر کیا ہے کسی حد تک واضح ہو جائیں گی۔

(1)

ابر می بارد و من می شوم از یار جدا۔
چون کنم دل بچنین روز ز دادار جدا

ابر باران و من و یار ستادہ بوداع
من جدا گریہ کنان ابر جدا یار جدا

سبزہ نو خیز و ہوا خرم و بستان سرسبز
بلبل روی سیہ ماندہ ز گلزار جدا

ای مرا در تہ ہر بند ز زلفت بندی
چہ کنی بند ز بندم ہمہ یکبار جدا

دیدہ ام بہر تو خونبار شد ای مردم چشم
مردمی کن مشواز دیدہ خونبار جدا

نعمت دیدہ نخوا ہم کہ بماند پس ازیں
مانده چون دیده ازان نعمت دیدار جدا
حسن تو دیر نماند چوز خسرو رفتی
گل بسی دیر نماند چو شداز خار جدا

(2)

بشگافت غم ایں جان جگر خوارہ مارا
یا رب چہ وبال آمده سیاره مارا
رفتند رفیقان دل صد پاره بیردند
کردند رہا دامن صد پارہ مارا
گر ہمره ایشان شوی ای باددریں راه
زنہار بجوئی دل آوارہ مارا
شبہا بدل از سوز خبر می کنده آه
آه از خبر دل بت عیاره مارا
روزی نکند باد کہ شبہائی جدائی
چون می گزرد عاشق بیچاره مارا
بوئی جگر سوختہ بگرفت ہمہ کوی
آتش بزن ایں کلبہ خونخوارہ مارا
جز خستۂ انکار نخواہد دل خسرو
خویست بدیں بخت ستمگارہ مارا

(3)

جانان بہ پرسش باد کن جان من گم بوده را
و آخر برحمت باد کن آن چشم خوده آلوده را!
ناخوانده سویت آمدم ناگفتہ رفتی از برم
یعنی سیاست ایں بود فرمان نافرموده را !
رفتی تو و دانم کہ من زنده نمانم از غمت

یا رب کجا یا بم کنون آن صبر و وقتی بوده را
باز آئی و بنیشن ساعتی آخر چہ کم خواہد شدن
گرشاد گردانی دمی یاران غم فرسودہ را
کشتی مرا وینست غم الا غم نادید نت!
گرمیتوانی باز بخش ایں جان نابخشودہ را
سودائی خسرو ہر شبی پایاں ندارد تا سحر
آخر گرہ برزن یکی آں جعد نا پیمودہ را

(4)

دلم در عاشقی آوارہ شد آوارہ تر بادا
تنم از بیدلی بے چارہ شد بیچارہ تر بادا
بتاراج اسیران زلف تو عیاری دارد!
بخون ریز غریبان چشم تو عیارہ تر بادا
رخت تازہ است بہرمردن خود تازہ تر خواہم
دلت خارہ است بہر کشتن من خارہ تر بادا
گوائی زاہد دعائے خیر می گوئی مرا ایں گو
کہ آن آوارہ کوئی بتان آوارہ تر بادا
دل من پارہ گشت از غم زانگونہ کہ بگردد
اگر جاناں بدیں شاد است یا رب پارہ تر بادا
چو با تر دامنی خو کرد خسرو بادو چشم تر
بآب چشم مژگان دامنش ہموارہ تر بادا

(5)

وقتی اندر سو کوئی تو گزر بود مرا
و اندران روی نہانی نظری بود مرا
جان بجایست ولی زندہ نیم من زیرا کہ
مایہ عمر بجز جان دگری بود مرا !

همه کس را خوروخواب ومن بیچاره خواب
ان خوش آن وقت که خوابی و خوری بود مرا
به ازیں بودم ازیں پیش اگر هیچ نبود!
بازی از جنس صبوری قدری بود مرا
هیچ یاد آیدت ای فتنه که وقتی زین پیش
عاشق سوختۂ در به دری بود مرا
خواستم دی که نمازی بکنم پیش خیال
لیک آلوده بدامن جگری بود مرا
نروم بیش که باد آئی و دیوانه شوم
آنکه گه گه بگلستان گزری بود مرا
پاسبان روز هم از قصۂ خسرو بشنود!
که شب از ہجر تو ناخوش سحری بود مرا

(6)

آب حیات من که نم از من دریغ داست
خاک رہش شدم قدم از من دریغ داشت
من ہرشی نشستہ ز ہجرش بروز غم
او پرسشی بروز غم از من دریغ داشت
گرچہ بہ بوئی او شدمی زندہ پیش ازیں
آن نیز باد صبح دم از من دریغ داشت
گشتم ز فرق تا بقدم حلقہ چوں رکاب!
و آں شہسوار من قدم از من دریغ داشت
بر دیگراں نوشت بسی نامۂ وفا!
برحاشیہ سلام ہم از من دریغ داشت
کاغذ مگر نماند کہ آں ناخدائی ترس
از نوک خامہ یک رقم از من دریغ داشت

(7)

اے ترک کمان ابرو من کشتۂ ابرویت
ملکی ہمہ ہند و چین بدہم بیکی مویت!
گفتی کہ بدین سوہا غمناک چہ می گردی
آوارہ دلی دارم در حلقۂ گیسویت
مسجد چہ روم چندیں، آخر چہ نماز است ایں
رویم بسوی قبلہ دل جانب ابرویت
شبہا ہمہ کس خفتہ جز من کہ ز بے خوابی
افسانۂ دل گویم درپیش سگ کویت
بوی گل ازیں پیشم درباغ نمودی رہ!
بادی بوزید از تو گمرہ شدم از بویت
گہ نام گلی گیرم گہ یاد گلستانی
زین گونہ در اندازم ہرجا سخن از رویت
سر در خم چو گانت راضیت بدیں خسرو
آن بخت کرا کارو سر در خم بازویت

(8)

بازآں حریف بر سر سردائی دیگر است
ہر ساعتی بخون منش رائی دیگر است
دل برد و رخ بہ پردہ نہان میکند زمن
ایں وجہ خود بہ پردہ تقاضائی دیگر است
راضی نمی شود بدل و دیدہ ہجر او!
ایں دزد در قفس کالائی دیگر است
پندم مدہ کہ نشنوم ای نیک خواہ از آنکہ
من باتوام ولی دل من جائی دیگر است
دیوانہ گشت خلق کہ از سحر چشم او!

ہردم بشہر فتنہ و غوغائی دیگر است

خسرو بیک نظارۂ رویش ز دست رفت

دیں دیدہ را ہنوز تمنائی دیگر است

(9)

خبری دہ بمن ای باد کہ جاناں چونست

آں گل تازہ و آں غنچۂ خنداں چونست

باک می میخورد آں ظالم و درخوردن می

آن رخ پر خوی و آں زلف پریشاں چونست

روز ہاشد کہ دلم رفت و برآن زلف بماند

یارب آن یوسف گم گشتہ بزنداں چونست

ہم بجان و سرجانان کہ کم و بیش مگوی

گو ہمیں یک سخن راست کہ جانان چونست

خشک سالیست دریں عہد وفا را ای اشک

زان حوالی کہ تو می آئی باران چونست

پست شد خسرو مسکین زکمد کوب فراق

مور در خاک فرورنت سلیمان چونست

(10)

یاراں کہ بودہ اند ندانم کجا شدند!

یا رب چہ روز بود کہ از ماجدا شدند

گر نو بہار آید و پرسد ز دوستان

گرامے صبا کہ آن ہمہ گلہا گیا شدند

اے گل چو آمدی ز زمین گو چگو نہ اند

آن رویہا کہ در تہ گرد فنا شدند

آن سروران کہ تاج سرخلق مودہ اند

اکنوں نظارہ کن کہ ہمہ خاک پا شدند

خورشید بوده اند که رفتند زیر خاک
آن ذرہا کہ ہر ہمہ اندر ہوا شدند
بازیچہ ایست طفل فریب ایں متاع دہر
بے عقل مرداں کہ بدیں مبتلا شدند
خسرو گریز کن کہ وفا رفت ایں زماں!
ز اہل جہاں کہ ہم چو جہاں بیوفا شدند

(11)

دو چشمت کہ تیز بلا میزند
چنیں تیر بر ما چرا میزند!
کمان جانب دیگری میکشد
ولی تیر بر جان ما میزند!
زہی غمزہ کز شوخی و چابکی
کجا می نماید کجا میزند
دو زلف تو از پشتی روی تو
شب تیرہ را در قفا میزند
بہنگام رفتار بالائی تو
تگ کبک را زاغ پا میزند
چو بوی ترا در چمن می بود
نسیم بہار از صبا میزند
مریز آب خسرو ہمیں غم بس است
کہ آتش دریں مبتلا میزند

(12)

سروی چو تو در اوچہ و در ستہ نباشد
گل شکل رخ خوب تو البتہ نباشد
در زند قبا بہر قدت از گل سوری

تاخلعت زیبائی تو از لته نباشد
درجنت فردوس کسی را نگذارند
تا داغ غلامی تو اش پته نباشد
لقمانی مسکین نکند میل بجنت
درصحن بہشت او طبق بته نباشد
ایں حسن و لطافت کہ کافر بچہ داری
درچین و خطا و ختن و خته نباشد
از پشت رقیب تو کشم تسمۂ چندیں
تاقچغۂ اسپ تو از متہ نباشد
موی شده از فکر میانت تن خسرو
تاہم چو رقیبت خنک و کته نباشد

(13)

مشقت خبر ز عالم بے ہوشی اورد
اہل صلاح را بقدح نوشی آورد
رخسار تو کہ توبۂ صدپارسا شکست
نزدیک شد کہ روسیہ پوشی آورد
شوق تو شحنہ ایست کہ سلطان عشق را
موی جبیں گرفتہ بجا دوشی آورد
گفتم ازاں لب از پی دیوانہ شربتی
گفت ایں مفرحیت کہ بیہوشی آورد
می ناتواں زیادہ کسی گشتم ای طبیب!
آں داروم بده کہ فراموشی آورد
خسرو اگر فسوں پری نیست درسرت
چشم از پری بدوز کہ مدہوشی آورد

(14)

که می آید چنیں جانا مگر مہ بر زمین آمد
چہ گرداست این کہ می خیزد کہ باجان ہم نشین آمد
کہ میراند جہیت را میدان عنبر آگیں شد
کدامی باد می جنبد کہ بوی یاسمین آمد
صبوری رادلم در خاک می جوید نمی یابد
غبارکیست می نازم کہ درجان حزین آمد
بیامد پیش ازیں یکبار دل تسلیم او کردم
کنوں تسلیم شوای جان کہ باز آں نازنین آمد
بتی و آفت تقوی و دین آخر نمیدانی
کہ در شہر مسلمانان نیا ید ایں چنیں آمد
زچندیں آب چشم آخر برآن آئینہ زنگاری
برائی سبزہ رنگیں کہ باران بر زمین آمد
زبہر چاک دامانی چہ جائی طعنہ برخسرو!
کہ او را تیغ بردست و کفن درآستین آمد

(15)

تن پیرگشت و آرزوی دل جوان ہنوز
دل خون شد حدیث و بتان برزبان ہنوز
عمرم باخر آمد و روزم بہ شب رسید
مستی و بت پرستی من ہم چناں ہنوز
آہنگ کرد سوی بردن جاگرہم
کافر دلان حسن درآن سوی جان ہنوز
مدغم رسید و مرگ ہنوزم نمی رسد
صد داد رفت و مہرۂ ما رایگاں ہنوز
بیدار اند شب ہمہ خلق از نفیر من!

و آن چشم نیم مست بخواب گراں ہنوز
ہر دم کرشمہائی وی افزوں ورانگہی
خسرو ز بند او بامید امان ہنوز

(16)

جان زتن بردی و درجانی ہنوز
در دہا دادی و درمانی ہنوز
آشکارا سینہ ام بشگافتی
ہم چناں در سینہ پنہائی ہنوز
ملک دل کردی خراب از تیغ ناز
واندریں ویرانہ سلطانی ہنوز
ہر دو عالم قیمت خود گفتہ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز
خون کس یا رب نگیرد دامنت
گرچہ در خون ناپشیمانی ہنوز
باز گریہ چوں نمک بگداختم
تو زخندہ شکرستانی ہنوز
جان زبند کالبد ازاد گشت
دل بگیسوئی سوئی تو زندانی ہنوز
پیری و شاہد پرستی ناخوش است
خسرو اتاکے پریشانی ہنوز

(17)

او می رود و عاشق مسکین نگرانش
چون مردہ کہ درسینہ بود حسرت جانش
بے مہر سواری کہ عنان باز نہ پیچد
آویختہ چندیں دل خلقی بہ عنانش

باد است کہ در خواب شبش دیدہ ام اما
از بیخبری پاد ندارم کہ چسانش
یادش وہی ای باد گہی نام گدائی
تا دولت دشنام برآید ز زبانش
بسیار بکوشم کہ بپوشم غم خود لیک
آتش چو بگیرد نتواں داشت نہانش

(18)

دی می گذشت دسوی اوردلہا کشان از ہر طرف
صد عاشق گم کردہ دل سویش رواں از ہر طرف
گلگوں تازش زیر زین غمزہ بلائی درکمین
می مردازاں پیکان کیں پیرو جوان از ہر طرف
ژولیدہ زلف فتنہ خُو مخمور چشم کینہ جو!
موہا پریشان کردۂ خونہا چکان از ہر طرف
دلہا و جانہا چون خسی در راہش آب ہرکسی
میرفت و جان و دل بسی گیسو کشان از ہر طرف
دلہائی پرخوں جگر گرد کمر کہ سربسر
چون لعل و یاقوت و گہر گردمیاں از ہر طرف
زنجیر دلہا سوی او دلال سرہا خوی او
درچار سوی روی او بازار جان از ہر طرف
کعبہ کہ یادش میرود لبیک حاجی نشود
گرچہ بہ پابوسش رود صد کارواں از ہر طرف
یک روز میرد چاکرت پیش درت دوراز برت
فریاد خیزد بردرت مسکین فلاں از ہر طرف
زیں پس کہ ازخوی بدت آہنگ بیرون باشدت
ترسم کہ چوں خسرو صدت گیرد عناں از ہر طرف

(19)

دی مست میرفتی بتا روکرده از ما یکطرف
شبدیز رامطلق عنان پیچیده صد یکطرف!
تا پر رخ زیبائی تو افتاده زاہد را نظر
تسبیح زہدش یکطرف مانده مصلا یکطرف
درچار حد کوی خود افتاده بینی بنده را
تن یکطرف، جان یکطرف سریکطرف پا یکطرف
سلطان خوبان میر سد ہر سُو گروه عاشقان
چادوش شه کوتا کند مشت گدارا یکطرف
نوشین شراب لعل اوشد مجلس ما بے خبر
ساقی صراحی یکطرف مستان رسوا یکطرف
جان خسرو دلخستہ راخون ریختن فرموده است
خلقی بمنت یکطرف آن شرح تنہا یکطرف

(20)

دل رفت زتن بیرون دلدار ہمان در دل
افتاد سخن درجان گفتار ہمان در دل
گفتم نکنم یادش ماتا کہ بماند جان
شدکیسہ ہمہ خالی طرار ہمان در دل
یک شہر پر از خوبان ده باغ پراز گلہا
صد جائی بہم دیده دیدار ہمان در دل
قربان شوی بہرش کافزوں شودی عمرش
باجان خود ایں خواہم با بار ہماں در دل
نی بکسلم از مویش کز شرم مسلمانان
تن را بہ نماز آرم زنار ہمان در دل
درکعبہ و بت خانہ ہرجاکہ رود خسرو!
دل بادر تو بدخو دیوار ہمان در دل

(21)

زین پس سرآن نیست کہ من زہد فروشم
ساقی قدحی دہ کہ بروی تو بنوشم
جائی کہ نیر زد بہ جوی درستم
این توبہ صد جائی شکستہ چہ فروشم
بس پیر خرابات کہ بردم بشفاعت !
تاباز کشادند دری کدہ دوشم
اکنوں کہ سرم شد بہ در می کدہ پامال
چوں ہم دہد محتسب از مالش گوشم
بودہ است ز ہوش و دلم اندیشہ
المنتہ اللہ کہ نہ دل ماند نہ ہوشم
شد آن کہ مصلا بکف داشتم اکنوں
بازیچہ کہ مغبچگاں شد سر و دوشم
پوشیدہ بسی خدمت بت کردم و زین پس
زنار ہوس می کندم از تو چہ پوشم
چوں باز نیامد زبت و بت کدہ خسرو
اصلاح مزاج سگ دیوانہ چہ کوشم

(22)

شب من سیہ شد از غم مہ من کجات جویم
بشب دراز ہجراں مگر از خدات جویم
تو نہ آن گلی کہ آرد سوی مات ہیچ بادی
زپی دل خود است ایں کہ من از صبات جویم
سخت بسرد گویم خبرت زباد پرسم
تو درون دیدۂ و دل زکسان چرات جویم
تو اگر کشی دل من دل خود فدات سازم

طلب او کنی سرمن سر تو رضات جویم
چوز آه درد مندان سوی تو رود بلائی
بمیان سپرشوم من رد آن بلات جویم
بدل و دبدیدۂ و جان ہمہ جانہفتہ ہستی
چو نہ بینم آشکارا بہ کدام جات جویم
تو کہ بردرت شدہ گم سروتاج بادشاہان
چہ خیال فاسد است ایں کہ من گدات جویم
سرگرم شدہ تجوید مگر از درتوخسرو!
زکجاست بخت آنم کہ بزیر پات جویم

(23)

ابر می بارد و من بار سفر می بندم
چشم می گوید و من از تو نظر می بندم
چشم گریان بلبش دا شتہ یعنی در راہ
برسرآب رواں پل زشکر می بندم
بہربستن بدگر چیز ہمی ارم دست!
وزتحیر بغلط چیز دگر می بندم
جان گسستہ گرہ میزنمش از گریہ!
گرہش سلسۂ تو است ارچہ کہ تری بندم
در تو میدیدم و خون آمد و چشم بربست
بنگر از چشم خود ای دیدہ چہ بری بندم
نمکی بخش بخسرو کہ برای توشہ
خون برون میکشم از دیدہ جگری بندم

(24)

خولی ز چشم میرود از انتظار کیست ایں
تیری بجا نم می خلد از خار خارکیست ایں

دل کز بتان بوالہوس آوردہ بودم باز پس
بار دگر و زدید کس بنگر کہ کارکیست این
ہردم نجا کی میزنم ہردم غباری حاصلم
اے خاک برفرق دلم آخر غبارکیست این
گویند اگر آن خوش پسر آید چہ آری درنذر
درچشم من چندیں گہر بہر نثارکیست این
گلگوں ناز انگیختہ گیسو کمند آویختہ
دل بردہٗ وخون ریختہ چابک سوارکیست این
بستہ میانی در کمر چوں ریسمانی و گہر
باری مرا نابد بہ برتادر کنارکیست این
برخسرو بیدل زکین اسپ جفارا کرد زین
گوریزیش خون بر زمین درانتظار کیست این

(25)

آن کیست کہ می آید صد لشکر دل با او
درویش جمالش ما سلطان دل ما او!
لی صبح شی خواہم کو راغم دل گویم
من گویم و اوخندد تنہا من و تنہا او
مہتاب چہ خوش بودی کو بودی و من تنہا
لب بر لب و روبررو اوبامن و من او
ہستم بخیال خود من با او و او بامن!
یارب چہ خیالست این اینجامن و آنجا او
گویندچرا آخر دیو انگیت جوشد
دیوانہ چرا بنوم ماہ من شہدا او
من خسرو و او زیبا یارب کہ چہ شکلست این
دیباچہٗ دلہا من آئینہ جانہا او

امیر خسرو

(26)

سر پر خمار شب بکنار کہ بودہ
لبہا نگار ہمدم و یار کہ بودہ
سنبل زتاب رفتہ و نرگس بخواب ناز
شب تا بروز بادہ گسار کہ بودہ
سروت ہنوز ہست در آغاز خاستن
زان سرونیم رستہ بہار کہ بودہ
کارت چنیں کہ پردہ دلہا بریدنست
امشب بہ پردہ محرم کار کہ بودہ
برریش خسروت نمکی ہم دریغ بود
مرہم رسان جانہ نگار کہ بودہ

(27)

مسلمانان گرفتار بہ دست نامسلمانی
ازیں دیوانہ بدمستی و بدخوی و نادانی
بطرہ آشنا بندی بخندہ پارسا بنی!
بغمزہ نا خدا ترسی بکشتن نامسلمانی!
بابرو فتنہ انگیزی بنرگس عالم آشوبی
بالاآفت آبادی بکاکل کافرستانی
دعائے بدنخواہم کرد لیکن ایں قدر گویم
کہ یا رب مبتلا گردی چومن روزی بھجرانی
طبیبا بہرجان تا تو انم غم خوری چندی
رہا کن جان ہم زیرا نمی ارزم بدرمانی
کنوں باد شراب و شاہد و مستی و قلاشی!
گذشت است آنچہ خسرو راسری بودہ است وسامانی

(28)

کنج کلہا ستمگرا تنگ قبائی کیستی
لابہ گرا و دلبرا عشوہ نمائی کیستی
زیر کلاہ جعد تر تا کمرت کشیدہ سر
بستہ بجا یکی کمر چست قبائی کیستی
مرکب ناز کردہ زین دادہ بغمزہ تیغ کیں
ساختہ آمدہ چنیں ناز برائے کیستی
تارخ خود نمودہ جان و قلم ربودہ
آتش من فزودہ مہر فزائی کیستی
خسرو ختہ راسخن بستہ شداز تو در دہن
طوطی شکریں من نغمہ سرائی کیستی

(29)

ای باد حدیثی زلب ماش بگوی
در گوشہ و در گوش بہ تنہاش بگوی
از ہر نمطی افگنی آنجا سخن خوش
ز انگونہ کہ دانی سخن ماش بگوی
از غمزۂ او ہست ہمہ شہر بقرباد
آہستہ بدان نرگس رعناش بگوی
با دامن پر خون چو بیازار فتادم
حال من تر دامن شیداش بگوی
گستاخی بوسہ نکنی لیک پیامی
از ہر لب من باکف ہرپاش بگوی
ہر چند دل خسرو ازو سوخت نخواہم
کش ہیچ ملامت کنی اماش بگوی

امیر خسرو

(30)

ای چہرهٔ زیبائی تو رشک بتان آذری
ہر چند وصفت میکنم درحسن ازان بالاتری
ہرگز نیا بد در نظر نقشی ز رویت خوبتر
شمسی ندانم باقمر حوری ندانم باپری
آفاق را گردیده ام مہر بتان ورزیده ام
بسیار خوبان دیده ام لیکن تو چیز دیگری
عالم ہمہ یغمائی تو خلقی ہمہ شیدائی تو
آں نرگس شہلائی تو آورده رسم کافری
ای راحت وآرام جان باقد چوں سروی روان
زینسان مرودامن کشان کا رام جانم می بری
عزم تماشا کردهٔ آہنگ صحرا کرده
جان و دل ما برده اینست رسم داوری
خسرو غریب است و گدا افتاده در شہر شما!
باشد کہ از بہر خدا سوی غریباں بنگری

(31)

نمناک فی فوادی الم بلا دوام
ارنی الجمال یو ما "کرما" الا شفائی
منم و در تو ہر شب خبرت نہ تا کجایم
تو درون سینہ خرم خبرم نہ کجائی
ایسوغ یا بخیائی نہب الثمار غیراً
و ذورالمعی دواماً حرموا عن اجتنا
ہمہ بہره مند رویت من حیرت و خموشی
کہ گدائی بے زبان راند ہد کسی گدائی
انام مستقراً بغافل و عینی!

بہواک کل لیل رطت علی السماء
ز حیات من ز ہجرت دو می بحیلہ ماندہ
ز تو ایں قدر نیا ید کہ دمی بسویہ آئی
وا وا مضیت شوقا بفنا تک المعلی
رات العیون حالی و بکت علی فنائی
ز سنان و تیرا اگرچہ دل و سینہ زخمی گردد!
نبود بنزد خسرو جو جراحت جدائی

(32)

مرا دوش گوئی بخواب آمدی
بکف کردہ جام شراب آمدی
کجا بودی اے اختر نیک فال
کہ مہ رفتی و آفتاب آمدی
بدل بردنم آمدی عیب نیست
کہ مستی بوی کباب آمدی
چو جستمد در گریہ من سبب!
تو بودی کہ برروی آب آمدی
ز حیرت بخواب اجل می روم!
کہ پندارم ایں تا بخواب آمدی
شبے داشتم تیرہ از روز بد
شم خوش کہ چون ماہتاب آمدی

(33)

می گذشتی و بسویت نگراں میدیدم
زار می مردم و در رفتن جان میدیدم
ہم چو وزدی کہ بہ کالائی گراں در نگرد!
جان بکف کردہ بد زدی و نہاں میدیدم

از دل گمشده سررشته همی جستم باز
گه بغزاک و گهی سوی عنان میدیدم
او ز محرومی بخت بدمن میخندید!
من طمع بسته در آن شکل ودهان میدیدم
اوشد از دیده من غائب و من هم زا سو
جان کنان می شدم و موی کنان میدیدم
ای خوش آن شب که بیاد رخ تو می خفتم
دردام بودی و درخواب همان میدیدم

(34)

ای سرو بلندت راصد فتنه به هر گامی!
هست از رخ گل رنگت اندر رخ گل دامی
یک مرده اگر عیسی کردی بدعا زنده!
صد مرده کنی زنده ای شوخ به دشنامی
خورشید رخا از تو یک ذره چه کم گردد
در کلبهٔ تاریکم گر چاشت کنی شامی
ای مرغ که می نالی از بهر گلی چندین
مانا که ندیدستی رخسار گل اندامی
در امید بمرد آهو خسرو به خم گیسو
هر صید بود لابد درکشکش دامی

تیرھواں باب

خسرو کی منثور تصانیف

اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز:

خسرو کی ضخیم تصنیف 719ھ میں مکمل ہوئی۔ اس وقت حسرو کی عمر تقریباً ستر سال کی تھی۔ دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کے چار حصے جنھیں "رسالے" کہا گیا ہے 682ھ تک لکھے جا چکے تھے، لیکن کچھ عرصے بعد خسرو نے ایک رسالہ اور مرتب کر کے کتاب میں بڑھا دیا[1] اس پانچویں رسالے میں زیادہ تر وہ خط ہیں جو انہوں نے ابتدائی عمر میں تحریر کیے تھے۔

اس کتاب کی تالیف کا بڑا مقصد یہ تھا کہ مرصع اور مزین نثر کے نمونے پیش کیے جائیں، اور مختلف قسم کے صنائع اور بدائع کے استعمال کو واضح کیا جائے۔ اس طرح اگر ایک طرف یہ کتاب خسرو کا سکہ، اقلیم نثر میں بھی اسی طرح رواں ہونا ثابت کرتی ہے جس طرح مملکت نظم میں تو دوسری طرف اس زمانے کے شوقین طبع شاعروں اور نثر نویسوں کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ اور معیار بھی مہیا کرتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج چھ سو سال کے بعد شاید بہت کم لوگوں میں اتنی ہمت اور اس قدر استقلال ہوگا کہ وہ اس کتاب کی بغور ورق گردانی بھی کر سکیں، اس کے نکات اور مطالب کو سمجھنا یا ان سے مستفید ہونا تو بڑی بات ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے مزاج تبدیل ہو گئے، جو چیز اس وقت مقبول تھی وہ اب مردود ہے، اور جو بات اس زمانے میں رائج تھی اب اس کی کساد بازاری ہے۔ اس زمانے کا کوئی تنقید نویس اگر خسرو کی اس تصنیف کو پڑھے گا تو پہلا خیال اس کے دل میں یہی آئے گا کہ خسرو نے ناحق اس قدر کاوش کی اور بیکار ایک طومار لکھ مارا، لیکن اگر وہ صبر اور ہمدردی سے کام لے کر اعجاز خسروی کی خوبیوں اور اس کی قدر و قیمت کو سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش کرے گا تو یقین ہے کہ اس کو خسرو کی یہ تصنیف فضول اور ان کی یہ مشقت لا دبی بیگار نہ معلوم ہوگی۔ اس لیے کہ

قطع نظر اس سے کہ اس کتاب میں اس زمانے کے بہترین اسالیب نثر کے نمونے مل سکتے ہیں جو خصوصاً ہندوستان میں فارسی نثر کے ارتقا کے مطالعے میں بہت مفید ہو سکتے ہیں۔ اعجاز خسروی میں لغوی، نحوی، ادبی، تاریخی، اور معاشرتی نقطہ نظر سے بے شمار معلومات مل سکتی ہیں، جو کتاب کے صفحات میں جگہ جگہ پراگندہ ہیں اور اس زمانے کے کوائف اور حالات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

خسرو کا دعویٰ ہے کہ نثر کا جو اسلوب اعجاز خسروی میں پیش کیا گیا ہے وہ ان کی اپنی ایجاد ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی پہلے رسالے کے شروع میں وہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں فارسی نثر کی ایک نئی طرز تکمیل کو پہنچ رہی تھی، جس میں صنائع اور بدائع اس طرح شامل تھے جیسے پانی میں گلاب، اور جس کے ذوق سے ماوراء النہر اور خراسان کے ''بیخ شکن'' بالکل بے بہرہ تھے اور اسی طرز کے بہترین نمونے وہ اس تصنیف میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خسرو، اپنے زمانے کے مزاج سے بالکل بے نیاز نہ ہو سکتے تھے اور ان کی نثر میں وہ رنگ ضرور جھلکتا ہوگا جو ان کے ہم عصر ادیبوں اور کاتبوں کی تحریر میں موجود تھا۔ لیکن خسرو کی جدت یہ ہے کہ انہوں نے لفظی صنائع کو حتی المقدور ترک کر کے زیادہ تر معنوی صنعتوں خصوصاً خیال اور ایہام سے کام لیا ہے اور یہ التزام رکھا ہے کہ عبارت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ہر ایک ٹکڑے میں ایک خاص ''نسبت'' یعنی مناسبت سے الفاظ استعمال کیے جائیں۔ مثلاً اگر آگ کا لفظ ہے تو باقی عبارت میں آگ کے متعلقات اور مناسبات ہی مذکور ہوں۔ اگر پانی کا استعارہ ہے تو پانی کے لوازمات ہی اس ٹکڑے میں آئیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کی تحریر میں تکلف پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس التزام کو نبھانا آسان نہیں اور خسرو کا سا قادر الکلام ادیب ہی اس کو کامیابی سے کام میں لا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ خسرو نے نئی تشبیہیں، نئے استعارے اور کئی طرح کی نئی صنعتیں بھی اس کتاب میں استعمال کی ہیں جو بقول ان کے سب ان کی ایجاد ہیں۔ ایک اور خاص بات یہ ہے کہ کتاب میں عربی اور فارسی کے جتنے بھی اشعار استعمال ہوئے ہیں وہ سب خسرو کی اپنی تصنیف ہیں۔

اس مختصر سی کتاب میں اتنی گنجائش نہیں کہ اعجاز خسروی کے مطالب کو پورے طور پر واضح کیا جا سکے۔ اس لیے میں حسب ذیل مختصر سے تجزیے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ امید ہے کہ اس سے کچھ اندازہ کتاب کی نوعیت اور موضوع کا ہو سکے گا

دیباچے میں حمد، نعت، منقبت حضرت نظام الدین اولیاءؒ، مدح سلطان علاؤ الدین وغیرہ

کے بعد خسرو نے فارسی نثر کے ان نو اسلوبوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے زمانے میں رائج تھے یعنی:

1- صوفیاء اور اولیاء کا اسلوب، جو دو قسم کا ہے۔ ایک تو اہلِ تمکین و مقامات کا، جس کا نمونہ کشف المحجوب، سلوک المسافرین وغیرہ میں مل سکتا ہے اور دوسرے اہلِ حال کا، جس کی مثال الغزالی اور عین القضاۃ الہمدانی کی تصانیف میں موجود ہے۔

2- علمائے محقق کا، مثلاً الغزالی کی فارسی تصانیف اور احیا العلوم کا فارسی ترجمہ۔

3- کاتبوں اور انشانویسوں کا، جس میں عربی اور فارسی الفاظ اور فقروں کو خوبی سے ترکیب دی جاتی ہے اور جس کی بہترین مثال کلیلہ و منہ کا فارسی ترجمہ ہے جو بہائی بغدادی نے کیا ہے۔

4- علماء اور فضلاء کا جس میں ہر فن اور علم کی مناسبت سے اصلاحی الفاظ اور عبارتیں استعمال کی جاتی ہیں۔

5- خطیبوں اور واعظوں کا، جو سیدھا سادھا بھی ہو سکتا ہے اور رنگین بھی۔

6- مشائخ یا مدرسین کا، جو ایک ایسے چکنے پتھر کی طرح ہے جسے کسی بدسلیقہ مزدور نے راستے کے عین بیچ میں رکھ دیا اور جس سے عقلمند تو بچ کر نکل جائیں لیکن بہت سے بیوقوف پھسل جائیں۔ اس اسلوب کے دلدادہ اکثر اپنی ہٹ کے پکے اور عقلمندوں کی تنقید پر کان نہ دھرنے والے ہوتے ہیں۔

7- عام آدمیوں کا اسلوب، جو سادہ سلیس اور مفید مطلب ہوتا ہے

8- مزدوروں اور کاریگروں کا، جو ان کے پیشوں سے مناسبت رکھتا ہے اس میں کسی قسم کی بناوٹ یا رنگینی نہیں ہوتی اور۔

9- ظریفوں، مسخروں اور بھانڈوں وغیرہ کا، جو خاص طور پر خوش کرنے اور ہنسانے کے لیے موزوں ہوتا ہے۔

اس کے بعد خسرو خود اپنے اسلوب کا ذکر کرتے ہیں جو بقول ان کے سب کاتبوں کی قدرت سے باہر ہے، اور جو تحریریں اس اسلوب میں لکھی گئی ہیں وہ وحی خفی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پھر کتاب کی ترکیب یوں بیان کرتے ہیں۔ اس میں کل پانچ رسالے، یعنی بڑے حصے ہیں۔ ہر ایک رسالے میں کئی ''خط'' یا باب ہیں اور ہر ایک خط میں متعدد ''حروف'' یا مضامین ہیں۔

پہلے رسالے میں وہ غرضِ تصنیف یہ بتاتے ہیں کہ پرانی وضع کی انشاء میں کوئی خاص لطف

اور چاشنی نہ تھی بلکہ خانہ بدوش ترکوں یا ماہی گیروں کے کھانے کی طرح بدمزہ تھی۔ اس لیے انہیں ایک نئی طرز کی ایجاد کا خیال پیدا ہوا، جس میں زیادہ تر معنوی صنعتوں خصوصاً ایہام اور خیال سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے بعد خسرو مناسبت الفاظ اور جملوں اور فقروں کی موزوں ترتیب وترکیب کی اہمیت بیان کرتے ہیں اور ہدایتیں لکھتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان کے خیال میں عربی الفاظ کا استعمال جس قدر بھی کم ہو، اچھا ہے۔

دوسرے رسالے میں متفرق قسم کے خط ہیں اور بعض شاہی فرمان بھی ہیں۔ ایک پورا خط عربی میں مولانا شہاب الدین کے نام ہے اور ایک خالص فارسی میں ہے۔ کچھ نئی عربی اور فارسی امثال ہیں۔ یہ خسرو کی تصنیف ہیں اور ان میں سے بعض واقعی دلچسپ ہیں۔ ایک ''خط'' میں ہندوستانی موسیقی اور موسیقی دانوں کا ذکر ہے۔ آلات موسیقی کے نام بھی دیئے ہیں جن میں پیکان، عجب رود، چہرہ، دہل، چنگ، رباب، دف نائی، طنبور، وستک، وستان، شہنائی، بابک، دم سونی اور تبیرہ شامل ہیں۔ ارباب موسیقی میں تومرتی خاتون۔ محمد شاہ، کنجشک، خلیفہ حسینی اور اخلاق وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ بعض خطوں میں مختلف علوم مثلاً نجوم، طبیعات طب، فقہ اور بعض کھیلوں مثلاً شطرنج وغیرہ پر بحث کی گئی ہے۔

تیسرے رسالے میں لفظی صنائع کی مثالیں دی گئی ہیں۔ جن میں سے بعض خسرو کی ایجاد ہیں۔

چوتھے رسالے میں پانچ ''خط'' ہیں۔ تمہید کے طور پر خسرو نے اس رسالے میں بھی انشاء کے مختلف اسلوبوں پر بحث کی ہے اور ایہام اور خیال سے جو خوبی پیدا ہوتی ہے، اسے واضح کیا ہے۔ اس کے بعد صنائع معنوی کا ذکر ہے اور متفرق خطوط ہیں جن میں مختلف علوم اور فنون پر بحث کی گئی ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر ایک تو علاؤالدین کا وہ فرمان ہے جو اس نے تخت نشینی کے بعد لکھوایا تھا اور ایک خط بدر حاجب کا خضر خاں کے نام ہے۔ جس کے اسلوب کی خسرو نے بے انتہا تعریف کی ہے۔ ان میں سے بعض خط یقیناً فرضی اور موسوم اشخاص کے نام ہیں، لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو خسرو نے اپنے دوستوں اور ہم عصروں کو لکھے تھے۔ یہ رسالہ بہت دلچسپ ہے اور کارآمد بھی۔ کیونکہ اس سے خسرو کے زمانے کے ذہنی ارتقا اور علمی مشاغل کے متعلق مفید باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ ضمناً بعض ان درسی کتابوں کے نام بھی معلوم ہوجاتے ہیں جو اس عہد میں مقبول

اور رائج ہیں۔ مثلاً پنج گنج، کنز فقہ، اخبار نا جین، اخبار نیر بن (؟) وغیرہ۔

پانچویں رسالے میں وہ خط وغیرہ ہیں جو خسرو نے اوائل عمر میں لکھے تھے۔ اس لیے یہ اس اسلوب کا نمونہ نہیں کہے جا سکتے جو انہوں نے بعد میں مکمل کیا، لیکن پھر بھی ان میں سے بعض دلچسپ ہیں اور بہت اچھے پیرایہ میں لکھے گئے ہیں۔ خصوصاً وہ خط جو انہوں نے اپنے دوستوں نجم الدین حسن، تاج الدین زاہد وغیرہ کو لکھے ہیں اور جن میں سے بعض کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ چار خطوں میں ایک کنجوس خواجہ کی ہنسی اڑائی ہے۔ یہ خط خسرو کی ظرافتِ طبع کا اچھا نمونہ ہے۔ اگر چہ یہ ظرافت ایک قسم کی عریانی سے خالی نہیں ہے، جو قدما کی اس قسم کی تحریروں میں عام طور پر پائی جاتی ہے۔

پانچویں رسالے کے بعد ایک خاصا طولانی نکتہ یا خاتمہ کتاب ہے۔ جس میں حسبِ معمول خسرو اپنی محنت و مشقت کا، جو انہیں کتاب کی تالیف میں اٹھا پڑی، ذکر کرتے ہوئے سہو آخطا سے چشم پوشی کی درخواست کرتے ہیں اور اپنے بعض دوستوں خصوصاً شہاب الدین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے انہیں اس کی ترتیب میں مدد دی۔

خسرو کی خوش طبعی اور ظرافت کے چند نمونے اس کتاب سے پیش کرتا ہوں۔

دعاؤں اور بددعاؤں کی مثالیں:

اس کا طائر روح خدا کے ہاتھ پر بیٹھے: خدا اسے دوزخ کے کتوں سے بچائے: کوّے اس کی چربی میں انڈے دیں: وہ بھیڑیوں کے ناخنوں سے باندھا جائے: وہ قبر میں سور بنے: (گوز الدین نامی کسی شخص کے لیے) دخل الخشب فی استہ (معشوق کی طرف سے عاشق کے لیے): اس کی روح ہمارے گھوڑے کے پسینے سے مدہوش رہے جب تک ہمارا گھوڑا اس کے قبر پر خرامِ ناز کرتا رہے: (ایک شطرنج باز کے لیے) وہ فیل کے نیچے مرے۔

ایک نیک سیرت شیخ کی تعریف میں یوں بیان کرتے ہیں: وہ ایک ایسا پرند ہے کہ اگر ان کے نیچے شیطان کا انڈا سینے کو رکھا جائے تو اس میں سے جبرئیل نکل آئیں۔

بعض طنزیہ فقرے:

کفن دزد سے زیادہ نرم دل، گورکن سے زیادہ مبارک قدم، نادداشت سے زیادہ باحیا، لوہار سے زیادہ پروردۂ حلال، چغلخور سے زیادہ بھروسے کے قبل، چکی کے بیل سے زیادہ دور بین،

سوتے ہوئے خرگوش سے زیادہ بیدار۔

رسائل الاعجاز نول کشور پریس میں دومرتبہ چھپ چکے ہیں قلمی نسخے بکثرت موجود ہیں۔

خزائن الفتوح یا تاریخ علائی:

علاؤالدین خلجی کے دور کی یہ مختصر سی تاریخ خسرو نے 711ھ میں پوری کی اور اس میں بادشاہ سے متعلق وہ واقعات درج ہیں جو سنہ 695ھ سے لے کر 711ھ تک ظہور میں آئے۔ کتاب کی وجہ تصنیف خسرو دیباچے میں یوں بیان کرتے ہیں:

''اس بندۂ مسکین خسرو کی قسمت میں، اگرچہ اس کی قلم اپنی قدرت اور ہمہ گیری کے باوجود اس عظیم الشان بادشاہ کے اوصاف کا ایک شمہ بھی پوری طرح بیان کرنے سے عاجز ہے، یہ لکھا تھا کہ وہ اس کے عہد کی عظمت وشوکت کی ثنا خوانی کرے اور اس لیے خدائے تعالیٰ نے اپنے جودوکرم سے آسمان اور زمین کے سب خزانوں کے منہ کھول دیئے اور اسے ایسے جواہر بے بہا عطا کیے جو بحتری اور ابوتمام جیسے شاعروں کو بھی نصیب نہ ہوئے تھے۔ پھر بھی یہ گراں بہا موتی اس لائق نہ تھے کہ اس کے آستان فلک پر نچھاور کیے جاسکیں۔ لیکن چونکہ بازار فطرت میں ان سے بہتر متاع دستیاب نہیں ہوسکتا تھا اس لیے مجبوراً مجھے ان موتیوں ہی کو پروکر بادشاہ کے لیے تحفہ تیار کرنا پڑا، اور اس امید میں اس کے آگے پیش کرتا رہا کہ وہ چونکہ لطف وکرم کا دریا ہے، ان کو قبول کرلے گا۔ جب میں نے دیکھا کہ اس بندے کے کج مج الفاظ کو بادشاہ کی درگاہ میں قبول حاصل ہوا تو مجھے نظم کی طرح نثر میں بھی طبع آزمائی کا خیال آیا کہ شاید بادشاہ میرے کلام پر ایک نظر ڈالے، جس طرح سورج، سنگِ قابل پر نظر ڈالتا ہے۔ اگرچہ میری قلم ہمیشہ نظم کے لیے وقف رہی ہے اور کبھی محاسن نثر کی طرف متوجہ نہیں ہوئی، میں اس عروس کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بڑے آدمیوں کی آنکھ برائیوں کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ اگر مجھے عمرِ جاوداں مل سکتی تو اس کا بہترین مصرف یہی ہوتا کہ اسے بادشاہ کی مدح وثنا میں گزاردوں، لیکن میں جانتا ہوں کہ زندگی مختصر ہے اور اس لیے اس کے اوصاف کے بے پایاں سمندر سے میں ایک چلو بھر پانی لینے ہی پر اکتفا کرتا ہوں۔''

خسرو کے اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نثر کے میدان میں یہ ان کا پہلا اقدام تھا[2]

اور اگرچہ وہ اپنے دیوانوں کے دیباچوں میں کچھ نہ کچھ نثر نگاری اس سے پہلے ضرور کر چکے تھے اب تک انہیں کسی مستقل منثور تصنیف کرنے کا خیال پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن تاریخ علائی کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کتاب کو لکھنے سے پہلے خسرو نثر میں ایک نیا اسلوب قائم کر چکے تھے اور یہ اسلوب وہی تھا جس کا ذکر انہوں نے اعجاز خسروی میں کیا ہے۔ یعنی ایہام اور خیال کا استعمال، اور عبارت کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ہر ایک ٹکڑے میں ایک علیحدہ ''نسبت'' کو کام میں لانا، یعنی ایک خاص چیز کی مناسبت سے الفاظ اور جملے استعمال کرنا۔ طرز تحریر میں تکلف اور پیچیدگی کا پیدا ہو جانا ناگزیر ہے اور اسی لیے خزائن الفتوح کو ٹھیک سے سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ تو پھر خسرو کی قابلیت اور شگفتگی طبیعت کی داد دینا پڑتی ہے کہ انہوں نے اس مشکل اور نئے اسلوب کو نہ صرف کامیابی کے ساتھ اول سے آخر تک نبھایا ہے بلکہ اس میں ایک خاص لطافت اور ایک عجیب طرح کی ظرافت بھی پیدا کر دی ہے۔ کسی تاریخی کتاب کے لیے یہ طرز تحریر موزوں تھا یا نہیں؟ یہ دوسرا سوال ہے۔ خسرو نے باوجود اس کے کہ بادشاہ کی مدح اور ثناء میں بہت مبالغہ ہوتا ہے، اس کا التزام رکھا ہے کہ تاریخی واقعات کی صحت اور ترتیب میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ انہی واقعات کو سیدھے سادھے الفاظ میں بیان کر دیتے تو پڑھنے والوں کو زیادہ آسانی رہتی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ خسرو مورخ نہ تھے بلکہ ادیب تھے، اور ادیب بھی ایسے کہ جن کی طبیعت کی جولانگاہ زیادہ تر نظم کا میدان رہا تھا۔ اس لیے ان کے لیے سیدھی سادھی تحریر میں کیا دل کشی ہو سکتی تھی اور بغیر اس تکلف اور رنگینی کے خزائن الفتوح کی ادبی قدر و قیمت کیا رہ جاتی؟

خزائن الفتوح میں جو تاریخی واقعات مذکور ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

1- علاؤالدین کی مہم دیوگیر، جب وہ کڑہ مانک پور کا حاکم تھا (ربیع الثانی 695ھ)۔
2- اسی سال اس کی دہلی پر چڑھائی اور تخت نشینی۔
3- سلطنت میں امن و امان اور خوش حالی پیدا کرنے کے لیے ہر قسم کے الحاد اور بداخلاقی کی روک تھام کی تدابیر، جو اس بادشاہ نے اختیار کیں۔
4- علاؤالدین کی بنا کردہ عمارتیں یعنی جامع مسجد، علائی مینار، شہر دہلی کی فصیل اور حوض شمسی کی تعمیر اور مرمت یا اضافہ وغیرہ۔

5- مغلوں کے خلاف اس کی کامیاب جنگ اور ان کی گوشمالی۔

6- گجرات اور رنتھنبور کی فتح (698ھ اور 700ھ)۔

7- مالوے کی تسخیر (705ھ)۔

8- چتوڑ کی مہم (703ھ)۔

ملک کافور کی سرکردگی میں دیوگیر کی مہم، (706ھ) اور بادشاہ کے ہاتھوں سیوانہ کی تسخیر (708ھ)۔

9- ملک کافور کا تلنگ یا تلنگانہ کو فتح کرنا (709ھ)۔

10- ملک کافور کا معبر کو فتح کرنا (ھ) اور اس کی فتح مند فوجوں کی دہلی میں واپسی (711ھ)۔

ان تمام باتوں کو خسرو نے حسبِ معمول بہت صحت اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اور بعض ایسی تفصیلات دی ہیں جو اور تواریخ میں نہیں مل سکتیں۔ اس لیے جب اس امر کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ علاؤالدین کے عہد کی یہی ایک ایسی تاریخ ہے جو اسی زمانے میں لکھی گئی تو خزائن الفتوح کی اہمیت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے اور اس بات کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے کہ اس کتاب کا تحقیق اور غور کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس کتاب کے قلمی نسخے غالباً دو چار سے زیادہ نہیں ہیں جن میں سے ایک تو برٹش میوزیم لندن میں ہے اور دوسرا کنگز کالج کیمبرج کی لائبریری میں۔ علی گڑھ سے خزائن الفتوح کا متن شائع ہو چکا ہے، جو برٹش میوزیم کے نسخے پر مبنی ہے لیکن اس میں صحت کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ پروفیسر محمد حبیب نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کیا تھا، لیکن چونکہ اصل متن ہی صحیح نہ تھا اس لیے ظاہر ہے کہ ترجمے میں صحت پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کتاب کا متن تحقیق اور تدقیق کے بعد تیار کیا جائے اور اس کا قابلِ اعتماد انگریزی یا اردو ترجمہ بھی کیا جائے تاکہ اس بیش قیمت تصنیف سے ہمارے تاریخ بیں اور تاریخ نویس احباب مستفید ہو سکیں۔

کتاب کے اسلوب کے متعلق میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ ایک دو خصوصیتوں کا ذکر اور کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ خسرو نے کاتبوں کی نادانستہ ستم ظریفی سے بچنے کے لیے، جو تاریخوں کو اکثر مسخ کر دیتے ہیں، تاریخ بیان کرنے کا ایک بالکل نیا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یعنی ہر واقعے کی تاریخ کو ایک معمے کی شکل میں بیان کیا ہے مثلاً علی بیگ اور تورفاق مغل سرداروں کی

گرفتاری کی تاریخ یوں لکھی ہے:

''ودر تاریخ سال معلوم شد کہ پائی علی بیگ در سلسلہ افتد و سر و پائی تو رفاق نیز ہمانجا گرفتار آید۔'' تاریخ معلوم کرنے کے لیے ان حرفوں کے عدد جوڑنا چاہئیں: علی بیگ کا پاؤں، یعنی آخری حرف (کاف 20) ''سلسلہ'' کے حروف (س ل س ل ہ 185) تو رفاق کا سر یعنی پہلا حرف (ت 400) اور پاؤں یعنی آخری حرف (ق 100) مکمل مجموعہ 705 ہوتا ہے اور یہی ان سرداروں کی گرفتاری کا ہجری سن ہے۔

ایک اور خصوصیت جو رسائل الاعجاز میں بھی خاصی نمایاں ہے، یہ ہے کہ خسرو نے اس کتاب میں عربی کے مفرد بیت، جو ان کی اپنی تصنیف ہیں، بکثرت استعمال کیے ہیں۔ مثلاً ہاتھیوں کے متعلق کہتے ہیں:

وسار الفیل و النظار قالوا
اقیم الحشر سیرت الجبال

عبارت کے اسلوب کے نمونے کے طور پر دو ایک ٹکڑے یہاں پیش کیے جاتے ہیں

''باز نسبت ز آب و ماہی بین، چندانکہ در آں خراباد آباد کند ور نیز بزخم بیک ہائی کشتی شگاف طوفان خون راندند نشان آن ماہی یافتہ نشد زیرا کہ در آب ماہی رابی بیرون نتواں کشید مع ہذا جویندگان بیر رگھائی آب ورود ہائی زمین براندن تیزی می بریدند و گماں بودند کہ مگر سوی کونہ کہ شہر قدیم آبادی ببراست رفتہ باشد، با خود تصور نمودند کہ نباید کہ آن ماہی بزرگ ازاں جال کوتہ نیز بجہد، آنجا رویم و سست بکشائیم باشد بدست افتد، بدیں اتفاق پیش از آنکہ کہ آبی خورند و یا بآبداری مشغول شوند تند تر از آبی کہ از بالا خرود آید رواں شدند، از آئیند گان باخبر صحت اخبار کماہی معلوم گشت کہ پیر در آن بیرانہ گردنگشتہ است واز دریا تیز دست شستہ بداں سبب کہ دریا با چندان ایستادازیں دریائی رواں کرانہ خواہد کرد۔ مصرع: ''ونی تحت الثری خوفا بغور۔''

''اینک ایں نسبت زیں است و لگام۔ جماعت مسلمانان کہ بپاردم گستہ ہنود علاقہ داشتند از لگام **لاتتخذو الکافرین اولیا من دون المومنین** '' سر بردن پردہ چوں دیدند کہ رائی راد وال حزم گست وایشان را غاشیہ قیامت بر سر آمد جہاں برایشان ہم چو حلقہ زین تنگ شد و موج

خون از پشت زین بگذشت'' بیش جائی نمدذین خشک کردن نماند، عنان از موافقت گفتار برنا فتند وورز۔ نہار اہل اسلام پناہ جستند و بغتراک دولت ''**فان حزب اللّٰہ ھم الغالبون**'' از زینت وتشریف ملک شادشدندواز قودکش اسیری آزاد۔''

افضل الفوائد

امیر خسرو کو غالباً شیخ نظام الدین اولیاؒ سے آغاز جوانی ہی سے عقیدت رہی تھی، لیکن 713ھ سے پہلے وہ باقاعدہ طریقے پر آپ کے حلقہ ارادت میں داخل نہ ہوئے تھے۔ مرید ہونے کے بعد 719ھ میں خسرو نے افضل الفوائد کا ایک حصہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے اسے بہت پسند کیا اور خسرو کی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ خسرو نے اس کے بعد دوسرا حصہ بھی لکھنا شروع کیا مگر یہ نا تمام رہا۔ افضل الفوائد کو لکھنے کا خیال خسرو کو یقیناً خواجہ حسن کی تقلید میں پیدا ہوا۔ چونکہ دونوں دوست اپنے پیر طریقت کی تعظیم وتکریم میں مساعی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے، اس لیے خسرو نے یہ پسند نہ کیا کہ حضرت نظام الدینؒ کے حالات اور ملفوظات کو جمع اور مرتب کرنے میں وہ خواجہ حسن سے پیچھے رہ جائیں، مگر خواجہ اس معاملے میں خسرو سے بازی لے گئے۔ جس کی وجہ غالباً ایک تو یہ تھی کہ انہیں خسرو کی نسبت زیادہ فراغت اور فرصت کتاب کی تصنیف کے لیے میں اور دوسری یہ کہ اس قسم کی کتاب کے لیے جس طرز تحریر کی ضرورت تھی، اس سے خسرو مانوس نہ تھے۔ دونوں کتابوں کی زبان بہت ہی سادہ اور سلیس ہے، اور اس فارسی نثر کا نمونہ ہے جو اس زمانے میں عام طور پر بولی جاتی تھی۔ میرے خیال میں ادبی نقطہ نظر سے یہی ایک پہلو ہے جس کے لحاظ سے یہ دونوں کتابیں قابل قدر ہیں۔ خواجہ حسن کی تصنیف نہ صرف زیادہ ضخیم ہے بلکہ جو قبول عام اسے حاصل ہوا وہ خسرو کی کتاب کو نصیب نہیں ہوا۔

افضل الفوائد میں، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، زیادہ تر حضرت نظام الدینؒ کے اقوال ہیں، لیکن ضمناً ان کی خانقاہ کے کچھ حالات اور ان لوگوں کا بھی تذکرہ موجود ہے جو اکثر آپ کے گردوپیش رہتے تھے اور جن میں خواجہ حسن، مولانا وجیہہ الدین پائلی، مولانا شہاب الدین میرٹھی، مولانا برہان الدین غریب اور عثمان سیاح کا ذکر اکثر آتا ہے۔ کتاب کے بعض حصے دلچسپ ہیں، خصوصاً

وہ جن میں حضرت نظام الدینؒ کی رائے بعض متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق لکھی گئی ہے۔ مثلاً سماع میں ہُو ہا کرنے کے متعلق خسرو لکھتے ہیں:

''پھر اس کا ذکر ہوا کہ بعض درویش سماع کی محفل میں چیخنے لگتے ہیں اور نامناسب آوازیں نکالتے ہیں۔ اس پر خواجہ نظام الدینؒ فرمانے لگے کہ وہ بہت بُرا کرتے ہیں، اس لیے کہ اہلِ سماع نے کبھی ایسا نہیں کیا اور یہ کاملوں کا طریقہ نہیں ہے۔ اس قسم کے طرزِ عمل کی انہی لوگوں سے توقع ہوسکتی ہے جو گمراہ اور مذہب طریقت سے ناآشنا ہیں۔ اس لیے کہ حسن بصری کا قول ہے کہ اگر کوئی سماع کے وقت چیخنے لگے تو سمجھ لو کہ وہ شیطان ہے اور شیطان کا پیرو ہے۔ جس شخص کو کامل روحانیت حاصل ہے وہ (سماع کے وقت) عالم ملکوت میں پہنچ جاتا ہے۔ اُسے حرکت کرنے یا رقص کی ممانعت نہیں ہے کیونکہ اس وقت وہ بحرِ معرفت میں غوطہ زن ہوتا ہے اور اٹھارہ ہزار عالموں کے وجود سے بے خبر ہوتا ہے۔ جس طرح سونا کدالی میں پگھلتا ہے وہی حال اہل سماع کا عالم حیرانگی میں ہوتا ہے۔''

ایک اور مرتبہ سماع میں مزامیر کے استعمال کا ذکر ہوا۔ اسے خسرو نے یوں لکھا ہے:

''جمعرات ہفتم شوال کو مجھے شیخ کی پابوسی کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت جو لوگ جمع تھے وہ سماع کا ذکر کر رہے تھے اور ان لوگوں کا بھی جو اس کے دلدادہ ہیں۔ عین اسی وقت ایک شخص آیا اور اس نے بیان کیا کہ ایک مقام پر شیخ کے کچھ مرید جمع تھے اور ان کے پاس مزامیر (آلات موسیقی) بھی تھے۔ اس پر خواجہ فرمانے لگے کہ میں نے اکثر اس قسم کے آلات اور دیگر خلاف شرع باتوں کو منع کیا ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا اچھا نہیں کیا۔ آپ نے اس بات کی بہت تاکید فرمائی بلکہ یہاں تک کہ ایک ہاتھ کی ہتھیلی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر نہ مارنا چاہیے اور یہ کہ ایک ہاتھ کی پشت دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر، جس سے آپ کا یہ مطلب تھا کہ دستک (تالی) بالکل ممنوع ہے اور یہ بھی کہا کہ مزامیر کا استعمال نہ کرنا بہتر ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ سب بڑے بڑے مشائخ سماع سے لطف اندوز ہوتے رہے ہیں اور جو لوگ اس کی اصل قدر و قیمت جانتے ہیں اور ذوق اور جذبہ رکھتے ہیں وہ کسی قوال سے ایک بیت سن کر ہی متاثر ہو جاتے ہیں، خواہ کوئی ساز ہو یا نہ ہو۔ برخلاف اس کے اگر کسی میں ذوق سلیم کی کمی ہے تو اسے اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا کہ اس کے سامنے کئی قوال مختلف سازوں کے ساتھ گائیں۔''

ان دونوں عبارتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دستک اور مزامیر کے استعمال کو حضرت نظام الدینؒ معیوب اور ناشائستہ سمجھتے تھے اور اسی طرح وجد میں چیخنے چلانے کو، لیکن رقص یا ہاتھ پاؤں ہلانا ان کے نزدیک معیوب نہ تھا۔ غالباً ان کے زمانے میں مشائخ کا بھی یہی مسلک تھا، لیکن بعد میں مزامیر اور دستک قوالی کا ایک ایسا اہم جزو بن گئے کہ ان کے بغیر مجلس سماع میں کوئی لطف باقی نہ رہا۔

افضل الفوائد دہلی میں 1304ھ میں چھپ چکی ہے۔

چودھواں باب

خسرو کی ہندی شاعری، خالق باری وغیرہ کی تصنیف اور علم موسیقی میں ان کی مہارت

خسرو کی ہندی شاعری:

اب سے پچیس تیس سال پہلے کبھی کسی کو یہ خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ امیر خسرو ہندی شاعر نہ تھے، یا یہ کہ جو دو ہے، مکرنیاں، پہیلیاں وغیرہ ان سے منسوب کی جاتی ہیں وہ ان کی تصنیف نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ہندوستان میں خسرو کی شہرت ان کے فارسی کلام کی بدولت رہی تو ضرور ہے لیکن صرف ایک محدود طبقے میں، حالانکہ عوام کے حلقے میں جو شہرت اور مقبولیت انہیں حاصل ہے وہ یا تو اس حیثیت سے ہے کہ وہ حضرت نظام الدینؒ کے خاص الخاص اور محبوب شاگرد تھے، اور یا اسی ہندی کلام کی وجہ سے جس کی صحت اور اصلیت آج کل معرض بحث میں ہے، اور جو بعض موجودہ زمانے کے تنقید نگاروں کے خیال میں خسرو کا کلام نہیں ہو سکتا۔ لیکن جہاں تک خسرو کے ہندی شاعر ہونے کا تعلق ہے، ان کے اپنے فارسی کلام میں ایسی متعدد شہادتیں موجود ہیں جن کو دیکھنے کے بعد کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اور ان کی شہادتوں کو بہت اختصار کے ساتھ میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

1۔ خسرو ہندوستان میں پیدا ہوئے اس پر تقریباً سب تذکرہ نویس ہی متفق نہیں ہیں بلکہ مثنوی ''نہ سپہر'' میں خسرو صاف طور پر کہتے ہیں کہ:

ہست مرا مولد و ماوائی و وطن

اس کے علاوہ ان کی ماں بلاشبہ ہندی نژاد تھیں۔ اس لیے کہ اپنے نانا عماد الملک راوت عرض کا ذکر کرتے ہوئے وہ کئی جگہ ان کی سیہ رنگت اور ان کے پان کھانے کے شوق کا ذکر کرتے ہیں۔ گویا ہندی، خسرو کی مادری زبان تھی اور ظاہر ہے کہ انہیں اس پر پوری قدرت حاصل تھی۔

ہندی زبان کو ایسی اچھی طرح جانتے ہوئے خسرو جیسے شاعر کے لیے اس میں شعر نہ کہنا بعید از قیاس ہے۔ خصوصاً جب کہ ان سے پہلے کے بعض فارسی شاعر مثلاً مسعود بن سعد بن سلمان ہندی نظم میں طبع آزمائی کر چکے تھے۔

2- ان کے فارسی کلام میں بھی جگہ جگہ ہندی الفاظ اور جملے بہت سلیقے اور خوبی سے استعمال ہوئے ہیں۔ یہ مانا کہ خسرو نے زیادہ کثرت سے اس طرح ہندی اور فارسی کی آمیزش سے ایک گنگا جمنی زبان میں نظم کہنے کی کوشش نہیں کی، لیکن اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہو سکتی کہ وہ اس قسم کی شاعری پر قدرت نہ رکھتے تھے، یا ہندی شاعری کا انہیں شوق نہ تھا، بلکہ خود ان کے قول کے مطابق اس قسم کی دو رنگی زبان میں شعر کہنا اسلوب فصاحت اور بلاغت کے خلاف تھا، اور انہوں نے جو ایسے شعر کہے بھی تو ان کو اپنے فارسی دیوانوں میں جگہ دینا مناسب خیال نہ کیا۔ صرف نمونے کے طور پر چند اشعار کہیں کہیں، خصوصاً رباعی کی شکل میں، شامل کر دیئے۔ مثلاً اگر دیباچہ غرۃ الکمال میں ایک شعر لکھا ہے جو فارسی اور ہندی دونوں زبانوں کا ہو سکتا ہے اور جو حسب ذیل ہے:

اری اری ہمہ بیاری اری
ماری ماری برہ کہ ماری اری

ایک رباعی یوں ہے:

رفتم بہ تماشائے کنار جوئے
دیدم بلب آب زن ہندوئے
گفتم صنما بہائی زلفت چہ بود
فریاد بر آورد کہ در در موئے

ایک اور رباعی اسی طرح ہے، لیکن اس میں تیسرے مصرعے میں بجائے زلف کے خط کا ذکر ہے اور آخری الفاظ ''در در موئے'' کی جگہ ''موری بابا'' ہیں۔

3- غرۃ الکمال کے دیباچے میں خسرو نے صاف طور پر یہ لکھا ہے کہ انہوں نے ہندی نظم کہی تھی، لیکن چونکہ ان کی نظر میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی اس لیے انہوں نے اپنے ہندی کلام کو

کبھی جمع نہیں کیا، بلکہ دوستوں میں تقسیم کردیا۔ خسرو کا یہ بیان بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس کے بعد کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔

لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس خسرو نے اپنے ہندی کلام سے بے رخی برتی اور اسے مرتب نہیں کیا، تو پھر کسی اور نے بھی یہ زحمت گوارا کی ہوگی یا نہیں کہ اسے جمع کیا جائے؟ بظاہر اس قسم کی کوشش خسرو کے زمانے یا اس کے کچھ عرصے بعد عمل میں نہیں آئی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ جو رویہ خسرو کا ہندی کلام کی طرف تھا وہی ان کے ہم عصروں کا بھی ہوگا۔ اس دور میں بلکہ اس کے بہت بعد کے زمانے تک نہ صرف ہندی شاعری نے کوئی خاص ادبی حیثیت اور اہمیت حاصل نہ کی تھی بلکہ فارسی داں طبقے میں، جس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے، فارسی نظم کے آگے ہندی شاعری کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ فارسی اول تو حاکموں کی زبان تھی اور دوسرے ادبی نقطہ نظر سے معراج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ آفتاب کے آگے ستارے ماند ہو ہی جاتے ہیں اور شمع کافوری کے مقابلہ میں تیل کا ٹمٹماتا ہوا دیا فروغ نہیں پا سکتا۔ ہندی شاعری ابھی اپنے ابتدائی دور سے گزر رہی تھی۔ اس میں دلکشی ضرور تھی فارسی کا سا شکوہ نہ تھا، نمک تھا لیکن وہ شیرینی نہ تھی جس کی چاشنی سے اس زمانے کے ادیبوں کے کام ودہن آشنا تھے۔ یہ ایک ایسی باندی تھی جس کے نوخیز حسن اور تازگی کی طرف کبھی کبھی اس کے آقا کی نظر تحسین ضرور مائل ہو جاتی ہے، لیکن جو اس کے دل میں کبھی وہ جگہ حاصل نہیں کرسکتی جو اس کی حسین اور شریف بیوی کو حاصل ہے۔ یا یہ ایک ایسا پھول تھی جو دیہات کے کسی کھیت میں اِدھر اُدھر کی کھلی ہوئی ہریالی میں دلفریب معلوم ہوتا ہے لیکن جس پر کسی گلچیں کی نظر اس ارادے سے نہیں پڑے گی کہ اسے ایک گلدستہ میں باندھ کر آرائشِ محفل بنائے۔ اسی لیے میرے خیال میں جہاں اس میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا کہ خسرو ہندی میں شعر کہتے تھے، وہاں یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان کا ہندی کلام کبھی باقاعدہ طور پر جمع نہیں کیا گیا، اور اگر اس میں سے کچھ ہم تک پہنچا ہے تو وہ یا تو بعض شوقینوں کی بیاضوں کی بدولت اور یا زبانی روایت کے ذریعے۔

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندی کا وہ کلام، جو خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ واقعی ان کا ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں اس کلام کی نوعیت پر نظر ڈالنی چاہیے۔ پرانے تذکروں مثلاً آبِ حیات وغیرہ میں خسرو کے مفروضہ کلام کے متفرق نمونے ملتے ہیں، لیکن 1918ء میں کلیات خسرو کے سلسلے میں علی گڑھ سے خسرو کے چند رسائل کا ایک مجموعہ

شائع ہوا، جس میں وہ تمام چیزیں، جو خسرو کے ہندی کلام کا جزو سمجھی جاتی ہیں، شامل کر دی گئیں اور غالباً اسی زمانے میں بنارس سے ایک ہندی کتاب بھی ''خسرو کی ہندی کویتا'' کے نام سے شائع ہوئی[1]۔ علی گڑھ کا مجموعہ جو ''جواہر خسروی'' کے نام سے موسوم ہے، دو تین بہت قابل عالموں مثلاً مولانا رشید احمد صاحب سالم اور مولانا محمد امین صاحب چریا کوٹی کی زیر ادارت تیار کیا گیا تھا اور ان بزرگوں نے اس پر بہت عالمانہ تنقید اور تبصرہ بھی کیا ہے۔ ان مجموعوں میں ہندی (یا مخلوط ہندی اور فارسی) کی یہ چیزیں شامل ہیں۔ 1۔ خالق باری، 2۔ چیستان جس میں بُوجھ اور بن بُوجھ پہیلیاں کہہ مکریاں، دو سخنے، انمیلیاں یا ڈھکوسلا وغیرہ ہیں 3۔ ایک غزل جس میں ایک مصرع فارسی اور ایک ہندی کا ہے، 4۔ چند ہندی کے دوہے، 5۔ کچھ گیت بطور نسبت، قلبانہ وغیرہ۔

خالق باری کے کل 215 شعر ہیں اور بھی وہ تصنیف ہے جس پر حال کے زمانے میں بہت کچھ بحث ہوتی رہی ہے۔ مولانا محمد امین چریا کوٹی نے تمہید کے طور پر جو فاضلانہ مقالہ لکھا ہے، اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خالق باری امیر خسرو کی تصنیف ہے، اور اس کے متعلق کسی شبہ کا امکان نہیں۔ انہوں نے جو دلائل پیش کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

1- یہ تصنیف ہمیشہ سے امیر خسرو کی طرف منسوب چلی آئی ہے اور اس قسم کی متصل روایت میں شک وشبہ کرنے سے تمام تاریخی واقعات معرضِ شک میں آ جاتے ہیں۔

2- خالق باری کی بحریں ایسی شگفتہ اور اصول موسیقی کے مطابق ہیں کہ یہ کتاب خسرو ہی کے سے موسیقی دان شاعر کے ذہن اور قلم کی رہینِ منت ہو سکتی ہے۔

3- اس میں بعض ایسے لفظ مثلاً جیتل وغیرہ کا نام ملتا ہے جو خسرو کے زمانے سے متعلق تھے۔ (جیتل ایک سکہ تھا جو خسرو کے زمانے میں رائج تھا اور بعد میں متروک ہو گیا)۔

4- مثنوی کے آخر تک خسرو کا نام اس خوبی، شوخی اور بے ساختگی کے ساتھ آیا ہے کہ خالق باری کی تصنیف کا سوال بالکل حل ہو جاتا ہے۔

تقریباً اسی قسم کے خیالات کا اظہار بعض اور ادیبوں نے بھی کیا ہے، اور سید مسعود حسن صاحب رضوی نے اپنے ایک مقالے میں ایک ایسے ہی مخلوط نصاب ''اللہ خدائی'' کا ذکر کیا ہے جس کے مصنف نے خسرو کی روح سے مدد مانگی ہے۔ گویا اس کے خیال میں یہی خالق باری جس کی وہ نقل کرنا چاہتا تھا، خسرو ہی کی تصنیف ہے۔ برخلاف اس کے لاہور کے فاضل استاد حافظ محمود

شیرانی کی رائے میں یہ مثنوی خسرو کی تصنیف نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اول تو اس میں عروض کی غلطیاں اور خامیاں موجود ہیں، اور دوسرے ہندی الفاظ کی شکل کئی جگہ ایسی ہے جو خسرو کے زمانے میں نہیں تھی۔ ان متضاد رایوں میں سے کون قابلِ ترجیح ہے؟ یہ ذرا ٹیڑھا سوال ہے۔ لیکن موافق اور مخالف دلیلوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خالق باری یا اس کا زیادہ تر حصہ امیر خسرو کی تصنیف ضرور ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ امتدادِ زمانہ سے اس میں تصرف اور تحریف ہوتا رہا ہو اور بعض ہندی الفاظ کی شکل بدل دی گئی ہو۔ اس کی سب سے زیادہ معقول وجہ ایک تو یہ ہے کہ یہ تصنیف ہمیشہ امیر خسرو کی طرف منسوب رہی ہے اور خود مثنوی میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو اس عام روایت کو غلط سمجھنے کے لیے کافی ہو، اور دوسرے یہ کہ امیر خسرو کے زمانے میں اس قسم کے نصاب کی واقعی ضرورت تھی اور یہی ضرورت اس کی تصنیف کی محرک ہوئی۔

اسی طرح وہ غزل اور دوہے بھی، جو خسرو کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، بظاہر انھی کی تصانیف ہیں، اور چوں کہ ان کی تعداد بہت کم ہے، اس لیے اور بھی یہ گمان غالب ہو جاتا ہے۔ جواہرِ خسروی میں صرف دو دوہے امیر خسرو کی تصنیف سے درج ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

1- خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرو من پیو کو دودھیئے اک رنگ

2- گوری سوے سیج پر اور مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے رین بھئی چھوندیس

اور ان دونوں میں کوئی شہادت ایسی نہیں نظر آتی جو روایت عام کی تکذیب کرتی ہو۔

لیکن جہاں تک پہیلیوں وغیرہ کا تعلق ہے، یہ بات یقینی ہے کہ ان میں سے بعض تو واقعی امیر خسرو کی تصنیف ہوں گی اور بعض جعلی اور مصنوعی۔ اس لیے کہ پہیلی ایسی چیز ہے کہ جو عام مذاق سے تعلق رکھتی ہے اور یہ بالکل ممکن ہے کہ بہت سی پہیلیاں خسرو کے بعد بنتی رہی، جنھیں خسرو کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ لیکن اس قسم کی نسبت بجائے خود اس کا ثبوت ہے کہ امیر خسرو نے کچھ پہیلیاں ضرور لکھی ہوں گی۔ اس کا مزید ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ چیستان اور معمے کا خسرو کو خاص طور پر شوق تھا۔ چناں چہ ان کے مرثیہ فارسی دیوانوں میں بعض رباعیاں پہیلیوں کی قسم سے

ہیں اور اکثر ناموں اور تاریخوں کو بھی انہوں نے معمے کی شکل میں لکھا ہے۔ جواہر خسروی میں جو ہندی پہیلیاں درج ہیں، اگر انہیں غور سے دیکھا جائے تو میرے اس خیال کی تائید ہوتی ہے مثلاً ہم یہ آسانی سے باور کر سکتے ہیں کہ یہ پہیلی خسرو نے کہی ہوگی:

فارسی بولی آئی نہ
ترکی ڈھونڈی پائی نہ
ہندی لو لوں آرسی آئے
خسرو کہے نہ کوئی بتائے

یا یہ کہ

ایک نار ترور سے اتری ماں سوں جنم نہ پایا
باپ کا نام جو اس سے پوچھو آدھو نام بتایا
آدھو نام باپ کا خسرو کون دیس کی بولی!
وا کا نام جو پوچھا میں نے اپنے نام بولی

لیکن یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ پہیلی بھی خسرو کی تصنیف ہوگی:
ہاتھ میں لیجیے دیکھا کیجیے۔ (آئینہ)

یا یہ:

ایک نار وہ اوکھ کھائے
جس پر تھوکے وہ مر جائے
اس کا پیا اسے چھاتی لائے
اندھا نہیں تو کانا ہوجائے
(بندوق)

بھلا بندوق خسرو کے زمانے میں کہاں! یا وہ پہیلی جو یوں شروع ہوتی ہے:

چٹاخ پٹاخ کب سے
ہاتھ پکڑا جب سے
(چوڑیاں)

یا چلم کی یہ پہیلی:

نئی کی ڈھیلی پرانی کی تنگ
بوجھو تو بوجھو نہیں تو چلو میرے سنگ

حقہ چلم خسرو کے زمانے میں کون جانتا تھا!

اسی طرح ڈھکوسلے دو سخنوں اور گیتوں کی تصنیف بہت مشتبہ ہے۔ اس لیے کہ ان میں بھی بعض جگہ ہندی عبارت ایسی ہے کہ جو یقیناً خسرو کے دور کی ہندی سے بہت مختلف ہے، اور آج کل کی اردو زبان سے بہت مشابہ، بلکہ حرف بہ حرف وہی ہے۔ غرض یہ کہ ان تمام باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے جو اوپر بیان ہوئیں ہر معقول آدمی اس نتیجے پر پہنچے گا کہ:

1- خسرو نے ہندی شاعری میں طبع آزمائی ضرور کی، اور اس لحاظ سے کہ انہوں نے عام زبان یا کھڑی بولی کو اپنے خیالات کا اظہار کا ذریعہ بنایا ان کا شمار ہندی اور ایک حد تک اردو شاعروں کے سب سے پہلے دور میں کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ ماننا ذرا مشکل ہے کہ ان کے "ہندی کلام کا حصہ فارسی کلام سے بہت زیادہ تھا۔"[2] اس لیے کہ خسرو ہندی شاعری کو محض تفریح اور تفنن طبع کی ایک شکل سمجھتے تھے اور انہیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ ہندی میں کوئی بڑی تصنیف اپنی یادگار چھوڑی جائے۔ یہ بات ان کے اس بیان سے بھی ظاہر ہے جو دیباچہ غرۃ الکمال میں موجود ہے اور جس کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ ان چند جزو کے علاوہ، جن کا انہوں نے ذکر کیا ہے، انہوں نے غرۃ الکمال کی تکمیل کے بعد غالباً ہندی میں اور بہت کچھ لکھا ہوگا لیکن پھر بھی ان کا ہندی کلام حجم میں فارسی سے ہرگز زیادہ نہیں ہو سکتا۔

2- بدقسمتی سے خسرو کا زیادہ تر ہندی کلام دستبرد زمانہ سے غارت ہو گیا۔ اس لیے کہ خود انہوں نے یا ان کے کسی ہم عصر نے اسے محفوظ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ یہ بات قابلِ افسوس ہے

کیونکہ اگر امیر خسرو کے کلام کا کوئی مستند مجموعہ اس وقت ہمارے پاس ہوتا تو اس سے ہندی اور اردو زبانوں کے ارتقا کی تاریخ کے مطالعے میں بیش بہا مدد مل سکتی تھی۔

3- جو ہندی کلام اس وقت خسرو کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اس کا کچھ حصہ ضرور مستند اور قابل اعتماد ہے۔ لیکن کچھ حصہ ایسا بھی ہے کہ جو یقیناً فرضی اور مصنوعی ہے، اس لیے نہ تو آنکھیں بند کر کے یہ مان سکتے ہیں کہ وہ تمام پہیلیاں، مکریاں، ڈھکوسلے وغیرہ جو جواہر خسروی میں درج ہیں، خسرو کی تصنیف ہیں اور نہ ایک سرے سے ان سب کو جعلی فرض کر لینے کی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے۔ کسی مسلسل روایت کو جو صدیوں سے چلی آتی ہو اور جس کی صحت کے متعلق پرانے لوگوں کو یقین رہا ہو بغیر کسی خاص مخالف شہادت کے غیر معتبر نہیں سمجھنا چاہیے۔ خسرو تمام عمر دہلی میں رہے اور دہلی میں ان کا جو کلام زبان زد عام رہا ہے اس میں تصرف اور تحریف کا ہونا ممکن ہے، لیکن اس کا یکسر باطل اور بے بنیاد ہونا ممکن نہیں ہے۔

خسرو بہ حیثیت استاد موسیقی:

خسرو کی علم موسیقی میں مہارت کے متعلق کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے خود اس کا دعویٰ بہت صاف الفاظ میں کیا ہے، اور ان کی یہ بات نہ تھی کہ اپنے متعلق باطل دعوے کیا کرتے ہیں۔ چناں چہ اس سلسلے میں ان کا یہ قطعہ جو" اربعہ عناصر دواوین خسرو" مطبوعہ نولکشور پریس میں موجود ہے، دلچسپی سے خالی نہیں:

حسن اخلاق از خردمندان تو ان کردن طلب
خربود آن کو ادب جستن بسوی خربرد
بے خود راعیب نتواں کرد در ترک ادب
عیب نبود مور برتخت سلیمان گر برد
مطربے می گفت خسرو راکہ اے گنج سخن
علم موسیقی ز گنج نظم تیکو تو بود
زانکہ این علمیست کروقت نیا بد برقلم

وان نہ دشوار است کاندو کاغذ و دفتر بود
پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم
ہر دو را سنجیدہ بر وزنی کہ آن بہتر بود
فرق می گویم میان ہر دو معقول و درست
یا دہد انصاف ان کز ہر دو دانشور بود
نظم را علمی تصور کن بنفس خود تمام
کونہ محتاج سماع و صوت خنیا گر بود
گر کسی بے زیر و بم نظم فروخواندرواست
نی بمعنی ہیچ نقصان، نی بلفظ اندر بود
در کند مطرب بسی ہاں ہان و ہوں ہون در سرود
چوں سخن بود ہمہ معنی او ابتر بود
تامی زن رابین کی صورت دارد و گفتارنی
لاجرم در قول محتاج کسی دیگر بود
پس درین صورت ضرورت صاحب صوت وسماع
از برای شعر محتاج سخن پرور بود
نظم را حاصل عروسی دان و نغمہ زیورش
نیست عیبی گر عروس خوب بے زیور بود
من کسی را آدمی دانم کہ داند این قدر
ور ند اند برسد از من ورنہ خر سد خر بود[3]

اس قطعے میں ایک شعر موجود نہیں ہے جو بعض قلمی نسخوں میں ہے اور جو بجائے خود کافی اہمیت رکھتا ہے، یعنی (پاسخش گفتم الخ کے بعد):

نظم را کر دم سہ دفتر وربد تحریر آمدی
علم موسیقی سہ دیگر بود ار باور بود

اس قطعے سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو جاتا ہے کہ اگرچہ خسرو نے موسیقی میں کوئی مستقل تصنیف نہیں کی، تاہم انہیں اس علم میں بہت دسترس حاصل تھی۔ خسرو کے اس بیان کی تصدیق اور روایتوں سے بھی ہوتی ہے اور جہاں ان کے متعلق بعض اور باتیں نسلاً بعد نسل مشہور چلی آتی ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ انہوں نے موسیقی میں ایسا کمال حاصل کیا تھا کہ انہیں نایک کا لقب ملا تھا۔ پرانے لوگوں نے موسیقی دانوں کو ان کے کمال اور دسترس کے مطابق مختلف ناموں سے تعبیر کیا ہے۔ سب سے چھوٹا درجہ ''گائن'' کا ہے، اس کے بعد کندوب، گنی اور پنڈت کا رتبہ ہے، اور سب سے بڑا درجہ نایک کا ہے۔ شبلی نعمانی نے اس سلسلے میں ایک مرتبہ قدیم سنسکرت کتاب مانک سوہل کے فارسی ترجمے کا حوالہ دیتے ہوئے ایک روایت لکھی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ خسرو نے اپنے زمانے کے ایک جگت استاد نایک گوپال کو نیچا دکھا کر نایک کا لقب حاصل کیا تھا۔ یہ فارسی ترجمہ عالمگیر کے عہد میں ایک امیر فقیر اللہ نامی نے کیا تھا اور اس کا نام راگ درپن رکھا تھا۔ راگ درپن کی روایت جو شبلی نے ''بیان خسرو'' میں دی ہے، یوں ہے:

''ان کے زمانے کا جگت استاد، جو تمام ہندوستان کا استاد تھا، نایک گوپال تھا۔ اس کے بارہ سو شاگرد تھے جو اس کے ساتھ سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح کاندھے پر لیے چلتے تھے۔ سلطان علاؤالدین خلجی نے اس کے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلالیا۔ امیر صاحب نے عرض کیا کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں۔ نایک گوپال سے گانے کی فرمائش کی جائے۔ نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا۔ ساتویں دفعہ امیر صاحب بھی اپنے شاگردوں کو لے کر دربار میں آئے۔ گوپال بھی ان کا شہرہ سن چکا تھا۔ ان سے گانے کی فرمائش کی۔ امیر صاحب نے کہا، میں مغل (کذا) ہوں ہندوستانی گانا کچھ یونہی سا جانتا ہوں۔ آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا۔ گوپال نے گانا شروع کیا۔ امیر صاحب نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں۔ پھر خود اس کو ادا کیا۔ گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا۔ امیر صاحب نے اس کو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اس کو ادا کر چکا ہوں۔ غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا تھا امیر صاحب اس کو اپنا ایجاد ثابت کرتے جاتے تھے۔ بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے۔ اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں۔ اس پر جو گانا شروع کیا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا۔''[4]

راگ درپن کی یہ روایت ظاہر ہے کہ زیادہ قابل اعتماد نہیں ہو سکتی، بلکہ کسی کی من گھڑت معلوم ہوتی ہے۔ روایت کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ امیر خسرو کسی راگ یا راگنی کو محض ایک دفعہ سن کر یاد کر لیتے تھے اور پھر اسے دوہرا سکتے تھے۔ لیکن اس سے سوائے اس کے کہ ان کی قوت حافظہ غیر معمولی طور پر تیز تھی اور کوئی خاص بات قابل تعریف نہیں نکلتی۔ بادشاہ کے تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھنا اور وہ بھی تنہا نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ، ایک عجیب مضحکہ خیز چیز معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں خسرو کے زمانے کے کسی مورخ نے یا خود انہوں نے اس واقعے کا کہیں ذکر نہیں کیا اور نہ ان کے زمانے کے کسی بڑے موسیقی دان کا نام نایک گوپال کہیں مذکورہ ہے۔ برخلاف اس کے کہ اکبر کے عہد میں اس نام کے ایک استاد کا پتہ چلتا ہے۔[5] اور کچھ عجب نہیں کہ مانک سومل بار اگ درپن میں غلطی سے اسی نایک گوپال کو خسرو کا ہم عصر فرض کر لیا گیا ہو۔ اگر چہ خسرو کی اپنی تصانیف سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے مقابلے ان کے زمانے میں عام طور پر ہوا کرتے تھے، اور اکثر یہ ہوتا تھا کہ ایران یا خراسان وغیرہ سے جو بڑے بڑے موسیقی دان آتے تھے ان کا ہندوستان کے استادوں سے سامنا ہونے پر دونوں طرف سے اپنے اپنے ہنر کے جوہر دکھائے جاتے تھے، اور بظاہر میدان ہندوستانی استادوں ہی کے ہاتھ رہتا۔ مثلاً اعجاز خسروی میں ایک جگہ خسرو نے خراسان سے کچھ موسیقی دانوں کے ہندوستان وارد ہونے کا ذکر کیا ہے اور ہندوستانی ماہرینِ فن کو دعوت دی کہ وہ ان کے مقابلے میں آئیں، تا کہ قمریان بالا کو یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ بہار ہندوستان میں پرند کیسے ہیں:

کہ تا دوست شود قمریان بالا را
کہ مرغ چون بود اندر بہار ہندوستان[6]

اس دعوت نامے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خسرو خود بھی اس قسم کے مقابلوں میں دلچسپی لیتے تھے اور شریک ہوتے تھے۔ بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ خسرو کو ایرانی اور ہندوستانی دونوں اصولوں میں مہارت حاصل تھی۔ فارسی راگ راگنوں کے نام بکثرت ان کی تصانیف میں موجود ہیں اور متعدد جگہ ہندی راگوں مثلاً الاون، دہر پد وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ بات بھی غیر اغلب نہیں کہ اس فن میں انہوں نے اس قدر کمال حاصل کر لیا ہو کہ انہیں نایک کا قابل فخر لقب ملا ہو، کیونکہ

یہ روایت ایرانی چلی آتی ہے اور بعض ایسے قابل اعتماد ناقدان فن مثلاً بادشاہ اودھ واجد علی شاہ نے بھی اس روایت کو معتبر تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تصنیف ''صورت المبارک'' میں خسرو کا ذکر کرتے ہوئے ان کا نایک ہونا تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ ان کے مطابق صرف اور صرف نایک خیال تھے نایک دھرپد نہ تھے۔[7] اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں کس حد تک تصرف کیا اور کیا نئی چیزیں ایجاد کیں۔ بدقسمتی سے اس کے متعلق زیادہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ان کی ایجاد پسند طبیعت کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ جدھر بھی اپنی عنان توجہ کو موڑتے کوئی نہ کوئی نئی بات، کوئی انوکھی طرز ضرور پیدا کرتے۔ عام روایت اُس لحاظ سے قرین قیاس بھی معلوم ہوتی ہے کہ خسرو کا زمانہ ہندوستانی اور ایرانی تہذیب کے باہمی اختلاط اور آمیزش کا دور تھا۔ تعجب نہیں کہ ستار کی ایجاد، جو دینا یا بین اور عود یا طنبور کے اصول اور ساخت کی ترکیب سے بنا ہے، اسی زمانے میں ہوئی ہو، اور اس کی ایجاد کا سہرا امیر خسرو کے سر ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ روایت باوجود اپنی قدامت کے اس بنا پر کمزور بھی جاسکتی ہے کہ امیر خسرو نے کہیں اس نام کے ساز کا تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ اپنی مثنویوں مثلاً قرآن السعدین اور نہ سپہر وغیرہ میں انہوں نے بہت سے آلات موسیقی کے، جو ان کے زمانے میں رائج تھے، نام دیئے ہیں، اور ان کی ساخت اور وضع قطع کو بھی بیان کیا ہے۔ بہر حال ستار کی ایجاد بھی خالق باری کی تصنیف کی طرح مشتبہ ہے اور رہے گی۔ اس لیے کہ ہمارے پاس قدیم روایت کی تصدیق یا تردید کے لیے کوئی صریح اور قطعی دلیل موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتی کہ امیر خسرو کسی نئے ساز کے موجد تھے تو یہ چیز تقریباً یقینی ہے کہ انہوں نے ہندوستانی راگ میں بہت کچھ تصرفات کیے تھے، اور اس میں ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا تھا کہ وہ ایک نئے مسلک اور طریقے کے بانی سمجھے جاتے تھے اور ہندوستان میں ان کے اس طریقے کے پیرو نہ صرف ان کے اپنے زمانے میں تھے بلکہ اب تک بھی موجود ہیں۔ چنانچہ صوت المبارک میں جس کا ابھی حوالہ دیا جاچکا ہے، واجد علی شاہ لکھتے ہیں کہ خسرو نے اپنی جدتوں سے ان قاعدوں اور ان سازوں کو جو ہزاروں برس سے رائج چلے آتے تھے تباہ و برباد کر دیا اور ان کے چیلے بہت بیبا کی اور دیدہ دلیری سے کلاونتوں کے منہ آنے لگے جو مہادیو کے زمانے سے پرانے اصول موسیقی کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ گویا واجد علی شاہ کے خیال میں خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں بڑا تغیر پیدا کر کے ایک نئے ''اسکول'' کی بنا قائم کی۔ اگرچہ

ان کے خیال میں یہ انقلاب کچھ مفید یا قابلِ استحسان نہ تھا۔ اصول اور قوانین موسیقی کے متعلق کسی ایسے شخص کو رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے کہ جو اس فن کی باریکیوں سے پوری واقفیت نہ رکھتا ہو۔ اسی لیے واجد علی شاہ کے اس بیان پر رائے زنی کا میں اپنے آپ کو ہرگز اہل نہیں سمجھتا۔ لیکن ایک بات ہر اس شخص سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی جس نے ہندوستانی علوم اور فنون کی ابتداا ور ارتقا کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا ہو، اور وہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر ایک علم اور ہنر ایک خاص حد کو پہنچ کر آئندہ ترقی سے محروم رہ گیا۔ اس کا سبب ہندوستان کی سیاسی حالت ہو یا یہاں کی کوتاہ نظر قدامت پسندی، مادۂ ایجاد کی کمی یا مذہب سے غیر معمولی لگاؤ، جو یہاں کے باشندوں کو ہر ایک علم اور ہنر کو مذہبی رنگ دے دینے پر مجبور کرتا ہے اور اس میں کسی قسم کے تصرف یا جدت کو مذہب میں مداخلت کا مترادف قرار دیتا ہے۔ کچھ بھی ہو واقعہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے اور علم موسیقی کو بھی اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ علم موسیقی کے متعلق یہ فرض کر لینا کہ ہزاروں برس پہلے وہ نشو و نما پا کر کمال کو پہنچ گیا تھا اور اس میں کسی اصلاح یا ردو بدل کی گنجائش نہیں رہی، یقیناً تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اس لیے بادی النظر میں اگر خسرو نے موسیقی کے پرانے اور فرسودہ اصول میں ترمیم اور اصلاح کی کوشش کی تو وہ اس کے لیے تحسین و آفرین کے مستحسن ہیں۔ انہیں کم از کم یہ خیال تو آیا کہ لکیر کے فقیر ان کو انہی مردہ قانون اور انہی زنگ آلودہ تاروں کے لیے اپنی آواز اور اپنی انگلیوں کو وقف نہ کر دیں جو مہادیو کے زمانے سے جوں کے توں چلے آتے ہیں، بلکہ نئے نغموں اور صیقل شدہ تاروں سے فضائے ہندوستان میں ایک نیا زیر و بم، ایک نیا ترنم پیدا کر دیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی اور کہاں تک ناکام، اس کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں کہ جو نہ صرف علوم موسیقی سے اچھی طرح آشنا ہوں بلکہ اس تنگ نظری اور ہٹ دھرمی سے بھی بالاتر ہوں جو اکثر ہمارے ہم وطنوں میں پائی جاتی ہے۔

راگ درپن میں کچھ تفصیل خسرو کی ایجادوں کی دی گئی ہے جسے شبلی نے بیان خسرو میں نقل کر دیا ہے۔ اسی تفصیل کو میں بھی یہاں درج کرتا ہوں۔ اگرچہ راگ درپن کے بیان کی صحت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہے، لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض چیزیں مثلاً قول، ترانہ وغیرہ غالباً خسرو کی طرف سے صحیح طور پر منسوب کی جاتی ہیں۔ جس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اب تک بھی قوال عام طور پر خسرو کو اپنا استاد مانتے ہیں اور ان کی خاص طور پر عزت و تکریم کرتے ہیں:

1- مجیر: یہ راگ غاراا اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

2- ساز گوی: پوربی، گورا، کنگلی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے۔

3- ایمن: ہنڈول اور بنغریز سے مل کر بنتا ہے۔

4- عشاق: سارنگ اور بسنت اور نوا۔

5- موافق: توڑی، مالوی، (کذا)، دودگاہ و حسینی۔

6- غنم: پوربی میں کچھ تغیر سے بنا ہے۔

7- زیلف: کھٹ راگ میں شہناز کو ملایا ہے۔

8- فرغنہ: کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے۔

9- سرپردہ: سارنگ، بلاول اور راست سے مرکب ہے۔

10- باخرز: دیسکار میں ایک فارسی راگ ملایا ہے۔

11- فرودست: کانہڑا، گوری، پوربی اور ایک فارسی راگ۔

12- منم (منعم) کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے۔

ان کے علاوہ قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ، سوہلہ بھی، بقول مصنف راگ درپن امیر خسرو کی ایجاد ہیں۔ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرز، عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے۔ باقی راگوں میں کچھ یونہی ادل بدل کر کے دوسرا نام رکھ دیا ہے۔[8]

♫

کتابیات

(یعنی ان کتابوں کے نام اور سن طباعت وغیرہ جن سے اس کتاب کی تالیف میں مدد لی گئی ہے یا جن کا اس میں حوالہ دیا گیا ہے)

-1 آب حیات: محمد حسین آزاد۔ دہلی 1896ء۔
-2 افضل الفوائد: خسرو۔ دہلی 1887ء۔
-3 آئینہ اسکندری: خسرو انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1186۔
-4 آئین اکبری: متن۔ بلوخمان (BLOCHMANN)۔
-5 اخبار الاخیار: عبدالحق۔ دہلی 1309ھ۔
-6 الاصطخری: مرتبہ De Geoje۔
-7 آتش کدہ: لطف علی آذر۔ بمبئی 1175ھ۔
-8 ابن بطوطہ: مرتبہ Defremery جلد سویم۔
-9 اعجاز خسروی۔ نول کشور 1876ء۔
-10 انشائے امیر خسرو۔ انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1221۔
-11 بابر نامہ: انگریزی ترجمہ اے ایس بیورتج 1921ء۔
-12 باغ و بہار: میر امن، ترجمہ Forbes۔
-13 بقیہ نقیہ: خسرو: انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187۔
-14 بہارستان: جامی مرتبہ Henri Masse 1925ء۔
-15 تاریخ علائی یا خزائن الفتوح: برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر 16838 و لکھنو یونیورسٹی مخطوطہ۔
-16 تاریخ فیروز شاہی: ضیاء الدین برنی: (Bib Indica text)۔
-17 تذکرۃ الشعرا: دولت شاہ (مرتبہ پروفیسر براؤن)۔

18- تحفۃ الصغر: خسرو، انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187۔
19- تاریخ رشیدی: مرزا حیدر دوغلات، مرتبہ Ross & Elias۔
20- جواہر خسروی: علی گڑھ۔
21- حاجی خلیفہ (کشف الظنون) Flugel۔
22- حیات خسرو: احمد سعید مارہروی۔
23- خسرو کی ہندی کویتا: بنارس 1921ء۔
24- دیوان حسن: برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر 24952 و انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1223 و مطبوعہ نسخہ حیدر آباد۔
25- راگ درپن: فقیر اللہ۔ انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 17-2 و مخطوطہ لائبریری ندوۃ العلما بحوالہ شبلی۔
26- سفینۃ الاولیاء: دارا شکوہ، آگرہ 1853ء۔
27- سیر الاولیاء: میر خورد۔ دہلی 1302ھ۔
28- شعر العجم: خسرو۔ ج 2، 1339ھ و بیان خسرو مطبوعہ دہلی سنہ؟ (افضل المطابع)۔
29- شیریں و خسرو: انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187 و علی گڑھ ایڈیشن۔
30- صوت المبارک: واجد علی شاہ۔ لکھنو 1853ء۔
31- طبقات ناصری: مرتب میجر ریورٹی (متن)۔
32- ظفر نامہ: یزدی۔
33- عشقیہ یا خضر خاں و دول رانی: خسرو، انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1215 و 1186 و علی گڑھ ایڈیشن۔
34- غرۃ الکمال: خسرو۔ متعدد مخطوطات۔
35- فوائد الفواد: امیر حسن۔ برٹش میوزیم مخطوطہ وغیرہ۔
36- قصائد امیر خسرو۔ انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1195۔
37- قرآن السعدین: خسرو۔ نول کشور 1885ء علی گڑھ۔
38- قصہ چہار درویش (فارسی)۔ برٹش میوزیم مخطوطہ 8917۔
39- کلیات خسرو: نول کشور 1288ھ و متعدد مخطوطات۔
40- کلیات خاقانی: لکھنو 1898ء۔
41- لب الالباب: محمد عوفی، مرتبہ پروفیسر براؤن۔
42- مجالس النفائس: نوائی، ترجمہ (M. Belin in Jurnal Asiatique)۔

43- مجالس العشاق: سلطان حسین مرزا۔ لکھنو 1314ھ۔
44- مجنوں ولیلیٰ: خسرو۔ لکھنو 1880ء وعلی گڑھ ایڈیشن۔
45- مطلع الانوار: خسرو۔ لکھنو 1884ء وعلی گڑھ ایڈیشن۔
46- منتخب التواریخ: بدایوانی، متن (Bid Indica)۔
47- نفحات الانس: جامی۔ کلکتہ 1859ء۔
48- نہایۃ الکمال: خسرو۔ برٹش میوزیم مخطوطہ نمبر 7-258۔
49- نہ سپہر: خسرو۔ انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187 و 1218 نیز پنجاب یونیورسٹی لائبریری مخطوطہ۔
50- وسط الحیات: خسرو، انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187 وغیرہ۔
51- ہفت آسمان: (Bib Indica)۔
52- ہفت اقلیم: محمد امین رازی۔ انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 724۔
53- ہشت بہشت: خسرو۔ نول کشور 1873ء وعلی گڑھ ایڈیشن۔
54- تغلق نامہ: خسرو۔ حیدر آباد 1933۔
55- خزانہ عامرہ: غلام علی آزاد۔ کانپور 1900ء۔
56- خمسہ نظامی: بمبئی 1265ھ۔
57- چہار مقالہ: مع حواشی مرزا محمد۔
58- (A Guide to Nizamuddin Eafar Hasan)
59- تاریخ فرشتہ: لکھنو 1864ء۔
60- اعجاز خسروی یا رسائل الاعجاز: نول کشور 1876ء۔
61- Memoirs of Jahangir (or TV Fund تزک)۔
62- Noticeson persian poets Sir fore Ousley 1846
63- The chronicles of the pathan kings of Dehli:Thomas 1871
64- Olegomena to the collected work of Khusrau: Nawab Ishaq Khan
65- Perssian literature under the Tartars: براؤن
66- Life and work of Amir Khusrau Calcutta, 1935

حوالہ جات

مقدمہ

-1 براؤنPersian Literature under Tartars،ص107۔
-2 دیکھئے بدایونی ج10،ص731لب الالباب ج2،ص241،اور چہار مقالہ،ص142۔
-3 دیکھئے چہار مقالہ،ص140-145۔

پہلا باب

-1 الاصطخری:ص286-287۔
-2 مثلاً دیکھئے دولت شاہ،ص 238،نفحات الانس،ص 210۔خزائن عامرہ،ص 209۔سفینۃ الاولیا،ص168وغیرہ۔
-3 خواشی مقالہ مرزا محمد،ص142۔
-4 برنی:ص197۔
-5 تذکرہ۔
-6 خسرو کا پورا نام بعض تذکرہ نویسوں نے یوں لکھا ہے۔ابوالحسن یمین الدین خسرو۔
-7 فرشتہ وغیرہ۔
-8 دیباچہ تحفۃ الصغر۔

دوسرا باب

1- دیباچہ غرۃ الکمال۔
2- شبلی۔ بیان خسرو۔
3- دیوان بقیہ نقیہ۔
4- برنی: ص119-120۔

تیسرا باب

1- دیوان تحفۃ الصغر ۔
2- خواجہ حسن دہلوی کے لیے دیکھیے دیباچہ دیوان حسن مطبوعہ حیدرآباد دکن۔
3- فرشتہ: حصہ دوم ص402۔
4- اس واقعے کے حالات کے لیے دیکھئے: فرشتہ ج1، ص782 برنی، ص109-110۔ بدایونی ج1، ص130 و مابعد وغیرہ، بدایونی نے وہ منثور مرثیہ بھی نقل کیا ہے جو خواجہ حسن نے اس موقعے پر لکھا تھا۔
5- دیوان وسط الحیات و بدایونی ج1، ص128۔
6- دیوان وسط الحیات۔
7- دیوان وسط الحیات۔
8- فرشتہ: ج2، ص410-411۔
9- برنی: ص38۔
10- برنی: ص 129۔

چوتھا باب

1- قرآن السعدین۔
2- اعجاز خسروی: رسالہ 5، ص49 و مابعد۔

پانچواں باب

1- برنی: ص200۔

2- برنی: ص183۔ برنی نے یہ واقعہ خسرو سے روایت کیا جو اس موقع پر بادشاہ کے پاس موجود تھے۔

3- دیوان بقیہ نقیہ (انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187)۔

4- دیوان بقیہ نقیہ (انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187)۔

5- دیوان غرۃ الکمال، قصیدے کا مطلع ہے:

عید است و خوباں نیمشب درکوی خمار آمدہ
سرمست گشتہ صبحدم غلطاں بازار آمدہ

چھٹا باب

1- بقیہ نقیہ (انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187)۔

2- عشقیہ۔

3- اعجاز خسروی: ج 1 ص 15 و مابعد دیکھئے ایضاً، برنی: ص 221۔

4- فرشتہ: ج 1، ص 109۔

5- خزائن الفتوح۔

6- ان دہلی کے قدیم شہروں کے لیے دیکھئے اثر الامرا، ج 3، ص 474۔

7- خزائن الفتوح۔

8- اچھو: اس زمانے کا سکہ تھا۔

9- منتخب التواریخ۔

10- اعجاز خسروی، دیباچہ۔

11- برنی: ص 339۔

12- برنی: ص 382-383۔

13- اعجاز خسروی، دیباچہ۔
14- برٹش میوزیم کے نسخے میں یہ مصرع اسی طرح درج ہے لیکن ظاہر ہے کہ عبارت صحیح نہیں۔
15- انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1177 (بقیہ نقیہ)۔
16- انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187 مثنوی کو خسرو اپنا شاہنامہ بتاتے ہیں اس لیے کہ شروع میں علاؤالدین کی فتوحات کا ذکر ہے:

ایں نظم غیر نیست کہ شہنامہ من است

ساتواں باب

1- فرشتہ کے بیان کے مطابق آپ کے والد کا نام احمد بن دانیال تھا جو غزنین سے ہندوستان آئے تھے۔
2- افضل الفواید: ص1000، مابعد۔
3- عشقیہ۔
4- ایضاً۔
5- عشقیہ۔

آٹھواں باب

1- دیکھیے:.Thamas Chronicles of Pathan Kings۔
ص:179-180 مصنف، قطب آباد کو دہلی کے مضافات میں کسی مقام کا نام سمجھا ہے۔ لیکن اس کا خیال یقیناً صحیح نہیں ہے۔
2- نہ سپہر:

دریں صندوق خسرو کا ستخوانیست
فراواں تحفہ ہائے آسمانیست

3- برنی: ص296 مقابلہ کیجیے فرشتہ۔
4- حامی اسلام تغلق شاہ کہ انجم سالہا

چرخ می زد تا فلک زین گونہ دین پرور کشید

5- دیکھیے فرشتہ: ج1، ص131، برنی: ص441، بدایونی ج1، ص222 مابعد تاریخ مبارک شاہی۔

6- اس واقعے کے لیے دیکھیے: بدایونی ج 1، ص 225 ابن بطوطہ، ج 3، ص 211 و مابعد، فرشتہ: ج2، ص398 وغیرہ۔

7- ان کے نام حاجی اور محمد تھے۔

8- دیکھیے بیان خسرو: ص16-17 (بحوالہ بدایونی) ان کا نام ملک احمد تھا۔

نواں باب

1- تاریخ فیروز شاہی۔

2- سیر الاولیا: ص1-3-5-3۔

3- مثلاً دیکھیے نفحات الانس ص710 گلزار ابراہیم آتش کدہ اسپرنگر وغیرہ192۔

4- Prolegomena از نواب اسحٰق خاں۔

5- دولت شاہ: ص240 نیز دیکھیے مجالس العشاق، ص130-132۔

6- دیکھیے دولت شاہ، ص240۔

7- دیباچہ وسط الحیات۔

8- یعنی دیباچہ اعجاز خسروی لکھنے کے بعد۔

9- Prolegomena نواب اسحٰق خاں، ص20۔

10- قطعہ دیوان غرۃ الکمال دیکھیے آخری باب۔

دسواں باب

1- دیباچہ تحفۃ الصغر۔

2- مجالس النفائس: ص329۔

3- اس مثنوی کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

4- کذا۔ یہ مصرع مشکوک ہے۔

گیارہواں باب

1- بلا در داروے از سمیات است کہ آزابہ نبدی
بھلا وہ گویندو نام زیوریست کہ زنان برسرہند ند
قرآن السعدین مطبوعہ علی گڑھ۔

2- میری انگریزی تصنیف میں (ص 181) یہ تعداد مصرعوں کی بتائی گئی ہے جو غلط فہمی پر مبنی ہے۔

3- ہفت اقلیم (دہلی کے تخت میں) ایضاً دیکھئے فرشتہ، ج 1، ص 132، حاجی خلیفہ، بدایونی، ج 1 ، ص 225۔

4- انڈیا آفس مخطوطہ نمبر 1187 بقیہ نقیہ کے ایک قطعے میں یہ شعر ہے:
پیش کش کردم بخدمت خمسہ راوشد قبول
نیک نی یاد آمدم در بذل و فی کس یاد داد
جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خمسے کا صلہ دینے میں بھی علاؤالدین نے بخل سے کام لیا۔

5- بدایونی: ج 1، ص 223۔

بارہواں باب

1- تزک: ج 1، ص 169۔

2- بہارستان: ص 190۔

تیرہواں باب

1- اعجاز خسروی، رسالہ 4، ص 342 و رسالہ 5، ص 167۔

2- اعجاز خسروی کے پہلے چار رسالے اس سے پہلے مرتب ہو چکے تھے لیکن 719ھ سے پہلے کتاب کی شکل میں شائع نہ ہوئے تھے۔

چودھواں باب

1- دیکھئے آب حیات ص 65-71، خسرو کی ہندوی کویتا، مسرا بندھو وینود، ج 1، ص 280-233 وغیرہ۔

2- جواہر خسروی بحوالہ اوحدی۔

3- اربعہ عناصر دواوین خسرو، ص 457-456۔

4- بیان خسرو، ص 27۔

5- دیکھئے (xxii) Notices on persian poets۔

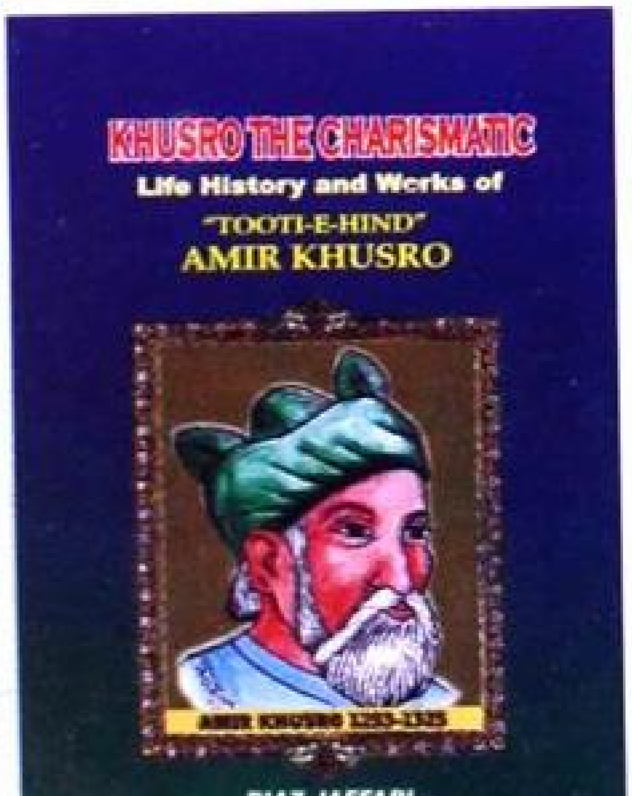
6- اعجاز خسروی رسالہ دوم، ص 180۔

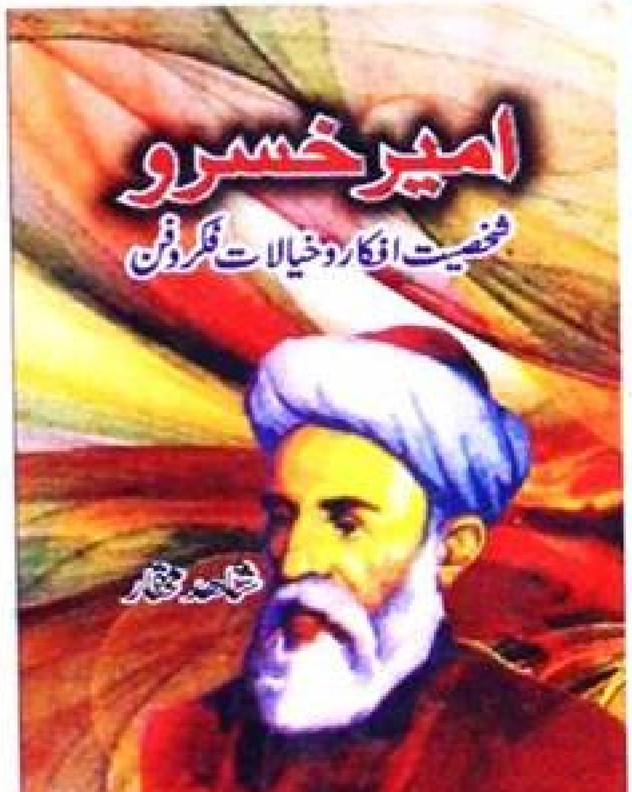
7- صوت المبارک، ص 42 مابعد، نیز دیکھئے آئین اکبری، ج 2، ص 138-129۔

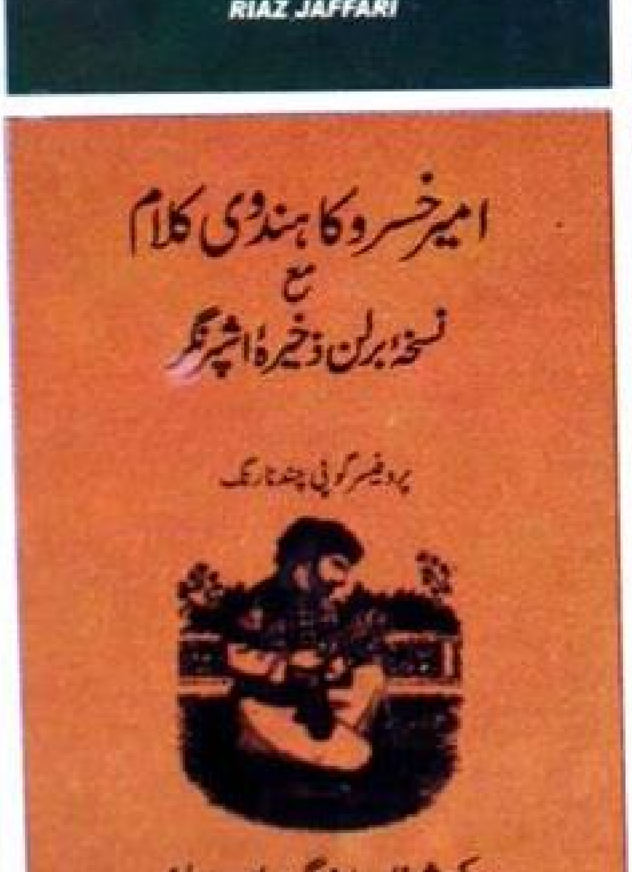
8- صوت المبارک کی رو سے خسرو کے ایجاد کردہ راگ یہ تھے:
ترانہ، چھند، پربند، گیت، قول، قلبانہ، نقش اور گل۔ اس سلسلے میں ملاحظہ کیجئے آئین اکبری ج 2، ص 139-138۔

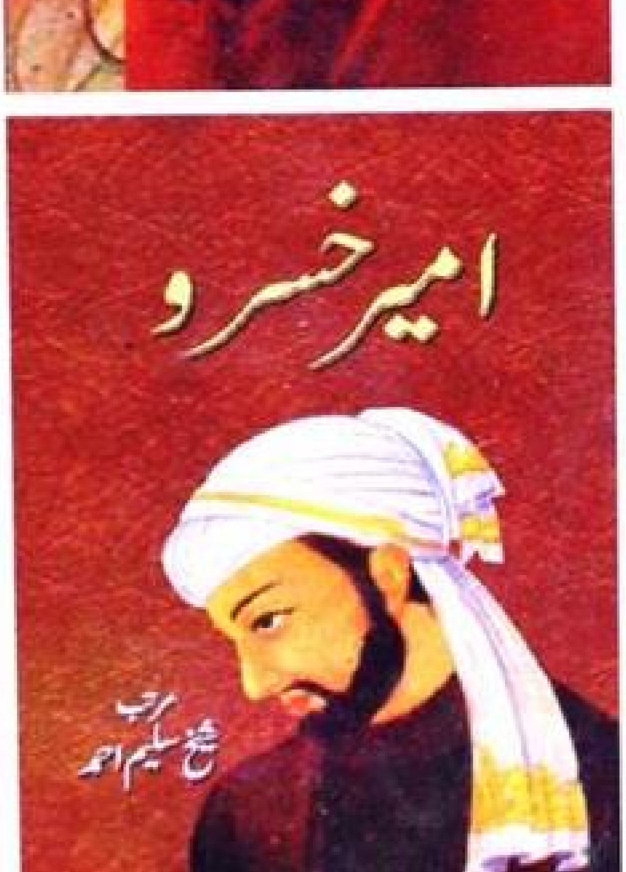
AMEER KHUSRO
(Biography)

by : Dr. Wahid Mirza









EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108, VAKIL STREET, KUCHA PANDIT, LAL KUAN, DELHI-6 (INDIA)
PH: 23216162, 23214465 FAX: 011-23211540
E-MAIL: ephdelhi@yahoo.com

81-8223-191-4